بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رہنمائے تزکیۂ نفس (تلخیص)

﴿ قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ ﴾

[الأعلى: 14]

سیداعجازاحمد(کویت)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مقدمہ

رہنمائے تزکیۂ نفس (تلخیص)

تمام تعریفیں اللہ ربّ العزت کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے،

اور بے شمار درود و سلام ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر جن کی بعثت انسانیت کے لیے رحمتِ کاملہ بن کر ہوئی۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ شمس میں گیارہ مرتبہ قسم کھا کر ارشاد فرمایا:

"قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا"

یعنی: بیشک وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کو پاکیزہ کیا۔

یہ وہ واحد مقام ہے جہاں ربّ العالمین نے گیارہ مرتبہ قسم کھا کر انسانی کامیابی کو انتہائی تاکید کے ساتھ **تزکیۂ نفس** سے وابستہ فرمایا۔

یہی تزکیہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کی بعثت کا بنیادی مقصد بھی رہا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

"لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ..."

(آلِ عمران:164)

ترجمہ: بیشک اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ اُن ہی میں سے ایک رسول بھیجا... جو اُنہیں پاک کرتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

تُو رازِ کن فکاں ہے، اپنی انکھوں پر عیاں ہو جا

خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو

اُخُوّت کا بیاں ہو جا، محبّت کی زباں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرِّ زندگانی ہے

نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

اور ایک اور مقام پر فرمایا:

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی

جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

یہ اشعار ہمیں متنبہ کرتے ہیں کہ تزکیۂ نفس صرف خانقاہوں یا گوشہ نشینی کا نام نہیں،
بلکہ یہ ایک ہمہ گیر اور عملی عمل ہے جو **فرد، معاشرہ، اور امت** — تینوں سطحوں پر اصلاح و بیداری کا سرچشمہ ہے۔

میں دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں **جناب عمر فلاحی قاسمی** (ناظمِ اعلیٰ، IMA کویت) کے،
جنہوں نے اس موضوع پر قیمتی رہنمائی فراہم کی اور مسلسل اصلاحی رہنمائی کا سلسلہ جاری رکھا۔

اسی طرح اپنے نہایت عزیز بھائی **داوود فلاحی** (مرکزی شوریٰ و HRD کے ذمہ دار، IMA) کا بھی تہِ دل سے ممنون ہوں
جن کے تعاون سے یہ علمی و روحانی جدوجہد ممکن ہوئی۔

یہ کتاب تزکیۂ نفس کے ان بنیادی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے

جو انسان کی باطنی اصلاح، روحانی طہارت، اور قلبی اصلح کے لیے ناگزیر ہیں۔

اس مجموعے کا مواد مختلف مستند کتب سے منتخب کیا گیا ہے، بالخصوص:

- مولانا **امین احسن اصلاحیؒ** کی *تزکیۂ نفس*
- امام **ابو حامد الغزالیؒ** کی *احیاء علوم الدین*
- **سید احمد عروج قادریؒ** کی *اسلامی تصوف*
- اور مولانا **سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ** کی *اسلامی تزکیہ* سے منتخب مباحث شامل کیے گئے ہیں۔

مولانا مودودیؒ نے تزکیہ کو صرف فرد کی باطنی طہارت تک محدود نہیں رکھا،

بلکہ **اجتماعی تزکیہ** کو بھی اسلامی زندگی کا لازمی جزو قرار دیا۔

ان کے نزدیک:

''اسلام کا مقصد صرف چند افراد کے دلوں کو پاک کرنا نہیں

بلکہ ایک ایسی اجتماعی زندگی قائم کرنا ہے جس میں خیر، عدل، تقویٰ اور ایمان کی روح غالب ہو۔''

اسی تصور کی بنیاد پر انہوں نے تزکیہ کو دو پہلوؤں میں تقسیم کیا:

1. **انفرادیؔ تزکیہ** — جس میں انسان اپنے نفس، نیت اور عمل کو اللہ کی رضا کے تابع کرتا ہے۔
2. **اجتماعی تزکیہ** — جس کے ذریعے ایک صالح معاشرہ اور عادل نظام قائم کیا جاتا ہے تاکہ اجتماعی زندگی بھی پاکیزگی و خیر کی مظہر بن جائے۔

یہی وہ جامع تصورِ تزکیہ ہے جو امتِ مسلمہ کو اپنے رب سے تعلق اور دنیا میں اپنی ذمہ داری — دونوں کو سمجھنے کا موقع دیتا ہے۔

خلاصہ و ترتیبِ کتاب

اس کتاب کا مطالعہ قاری کو بتدریج تزکیۂ نفس کی فکری، عملی، اور روحانی منازل سے روشناس کراتا ہے۔

ترتیب کچھ اس طرح رکھی گئی ہے:

1. **تزکیۂ نفس کی بنیادیں** —— اصطلاحات، مفاہیم، اور عام مغالطوں کی وضاحت
2. **تزکیہ کے اہم پہلو** —— قلب کی حقیقت، منجیات، اور شیطان کے لشکر کے تذکرے کے ساتھ قلبی امراض کا بیان
3. **اسلامی تزکیہ کی افادیت** —— اس کی انفرادی و اجتماعی اہمیت
4. **محاسبۂ نفس اور تعلق باللہ** —— دعا، خلوص، اور بندگی کے پہلو

Phase 1 کے موضوعات

- تعارفی کلام: دین میں تزکیۂ نفس کی اہمیت اور اس کی ضرورت
- انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد
- تزکیہ کی بنیادیں اور اصول
- تزکیۂ نفس کے عملی پہلو
- علمی تزکیہ اور اس سے متعلق مغالطے
- تزکیہ کی صحیح تعبیر
- فردی و اجتماعی تزکیہ (اسلامی تزکیہ کے تناظر میں)

بعد ازاں *احیاء العلوم* اور *اسلامی تصوف* کے منتخب ابواب سے درج ذیل مضامین شامل کیے گئے ہیں:

- عجائباتِ نفس و روح
- قلب و اخلاق کی منازل
- شیطانی وساوس سے حفاظت کے طریقے
- ریاضتِ نفس اور قلبی امراض کا علاج
- منجیات (نجات دینے والی صفات)

کتاب کے آخری حصے میں حضرت **اوروج احمدؒ** کی تصنیف *اسلامی تصوف* سے چند نہایت اہم مباحث شامل کیے گئے ہیں، جیسے:

- محاسبۂ نفس
- مجاہدۂ نفس
- حبِّ الٰہی و حبِّ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
- تعلق باللہ
- دعا و خلوصِ الٰہی

یہ مجموعہ نہ صرف اصلاحِ نفس کے طالبِ علم کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے
بلکہ ایک **متوازن روحانی نظامِ زندگی** کے خدوخال بھی واضح کرتا ہے—
ایسا نظام جو ایمان، علم، عمل، اور اخلاص کے حسین امتزاج پر قائم ہو۔

رہنمائی برائے HRD ممبران

آخر میں ہماری یہ درخواست اور گزارش ہے کہ HRD کے تمام mentors، رہنما، اور ٹیم ممبران اس تحریر کا بغور مطالعہ کریں

اور اس کی روشنی میں ایک جامع عملی منصوبہ (Activity Plan) ترتیب دیں،

جس میں سب حضرات دلجمعی، اخلاص، اور بھرپور کوشش کے ساتھ حصہ لیں۔

یہ مطالعہ محض فکری یا علمی نہ رہے

بلکہ عملی تبدیلی، خود احتسابی، اور اجتماعی تزکیہ کا ذریعہ بنے۔

ہر فرد اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کی روحانی و اخلاقی ترقی میں بھی حصہ لے —

تاکہ یہ HRD کا سفر صرف مطالعے تک محدود نہ رہے،

بلکہ کردار، خدمت، اور قیادت کی شکل میں ظاہر ہو۔

اگر ہم سب اس پیغام کو اپنی زندگیوں میں جگہ دیں

اور شرکاء و ذمہ داران مل کر خلوصِ نیت سے اس مشن میں تعاون کریں،

تو ان شاءاللہ یہ کوشش نہ صرف فردی اصلاح بلکہ اجتماعی بیداری اور تزکیۂ امت کا بھی مؤثر ذریعہ بنے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس معمولی کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے،

اسے ہمارے لیے ذریعۂ اصلاح بنائے،

اور ہمیں نفس کی پاکیزگی کے راستے پر ثابت قدم رکھے۔

آمین یارب العالمین۔

— **سید اعجاز احمد**

کویت

باب اوّل

تزکیۂ نفس کی بنیادیں

دین میں تزکیہ کی اہمیت اور اس کی ہمہ گیر ضرورت

تزکیۂ نفس اسلام کی اُس اساس میں سے ہے جس کے بغیر ایمان کی روح نامکمل اور عبادت کی تاثیر ماند پڑ جاتی ہے۔

قرآن وسنت نے تزکیہ کو ایمان، عبادت اور اخلاق — تینوں کے ساتھ گہرے طور پر جوڑ کر پیش کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ"

(الاعلیٰ:14-15)

ترجمہ: کامیاب وہ ہوا جس نے اپنے آپ کو پاک کیا، اپنے رب کا نام یاد کیا، اور نماز ادا کی۔

یہ آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ **عبادت دراصل تزکیہ کا عملی مظہر ہے،**

اور تزکیہ کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے بندگی کے تعلق کو مضبوط کرے اور اپنے دل کو اس کی یاد سے زندہ رکھے۔

انبیا علیہم السلام کی بعثت کا حقیقی مقصد

تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا بنیادی مقصد ایک ہی رہا.

انسانیت کو شرک، جاہلیت، اور اخلاقی گراوٹ سے نکال کر ایمان، عدل، اور طہارت کی راہ پر گامزن کرنا۔

قرآن مجید نے بارہا ان کے مشن کو ان الفاظ میں سمیٹا ہے: **تلاوت، تعلیم، اور تزکیہ۔**

یوں تزکیہ نبوتی دعوت کا لبِّ لباب ہے.

ایک ایسا الٰہی عمل جو انسان کو اپنے خالق کے قریب اور مخلوق کے لیے خیر و رحمت کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔

تزکیہ کا لغوی، علمی اور عملی مفہوم

لغوی لحاظ سے ''تزکیہ'' کے معنی ہیں *صفائی، پاکیزگی اور نشوونما*۔

یعنی انسان برائیوں اور رذائل سے اپنے آپ کو پاک کرے تاکہ نیکی اور خیر میں ترقی کر سکے۔

علمی مفہوم کے اعتبار سے تزکیہ ایمان، اخلاق، اور روحانی شعور کی ایسی تربیت کا نام ہے

جو انسان کو اس کے مقصدِ تخلیق —یعنی بندگیِ الٰہی— سے جوڑ دیتی ہے۔

عملی لحاظ سے تزکیہ وہ مسلسل جدوجہد ہے

جس میں عبادات، مجاہدۂ نفس، ذکر و دعا، خدمتِ خلق اور تعلق باللہ کے ذریعے دل کی اصلاح اور کردار کی تعمیر کی جاتی ہے۔

خدا کی معرفت کا صحیح مفہوم

معرفتِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کو اس کی صفات، افعال اور کمالات کے ذریعے پہچانے،

اور یہ پہچان محض ذہنی ادراک تک محدود نہ رہے بلکہ دل کی گہرائیوں تک اُتر جائے،

جہاں سے عاجزی، یقین، اور اطاعت کے جذبات جنم لیتے ہیں۔

محض زبانی علم یا فلسفیانہ بحث معرفت نہیں—

اصل معرفت وہ ہے جو انسان کے باطن کو بدل دے،

اس کی نگاہ کو روشنی، دل کو نرمی، اور عمل کو اخلاص عطا کرے۔

معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کے درست ذرائع

سچی معرفتِ الٰہی کے حصول کا راستہ نہ تو محض فلسفے سے طے ہوتا ہے اور نہ رسمی مذہبیت سے؛

بلکہ یہ دل و عقل، علم و عمل، اور فکر و ذکر کے حسین امتزاج سے حاصل ہوتا ہے۔

اس کے بنیادی ذرائع یہ ہیں:

1. **قرآن وسنت کی تدبر کے ساتھ تلاوت** — تاکہ دل میں یقین اور بصیرت پیدا ہو۔
2. **ذکر، دعا اور تفکر** — تاکہ تعلق باللہ زندہ اور بامعنی رہے۔
3. **محاسبۂ نفس** — تاکہ انسان اپنی کمزوریوں اور خطاؤں کا ادراک کرے۔
4. **عملِ صالح** — جو بندے کو رب کے قریب اور مخلوق کے لیے نافع بناتا ہے۔

سچی معرفت تب کامل ہوتی ہے جب بندہ اپنی خواہشات کو رب کی رضا کے تابع کر دیتا ہے۔

فلسفیوں، متکلمین اور صوفیہ کا تصورِ معرفت

فلاسفہ نے خدا کی معرفت کو عقل و منطق کے پیمانوں میں پرکھنے کی کوشش کی۔

ان کے نزدیک عقلِ انسانی ہی حقیقت تک پہنچنے کا واحد ذریعہ تھی،

مگر ان کی یہ راہ اکثر **خشک استدلال** میں الجھ گئی اور روحانی حلاوت سے خالی رہی۔

متکلمین نے معرفتِ الٰہی کو عقائد و دلائل کے قالب میں بیان کیا۔

انہوں نے عقل و وحی کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش کی،

مگر ان کی توجہ زیادہ تر نظریاتی دفاع پر مرکوز رہی، باطنی تجربے پر کم۔

صوفیہ نے معرفت کو قلبی اور روحانی تجربہ قرار دیا۔

ان کے نزدیک حقیقی معرفت اُس وقت حاصل ہوتی ہے

جب دل گناہوں کی آلودگی سے پاک ہو کر نورِ ایمان سے منور ہو جائے،

اور بندہ ہر لحظہ اپنے رب کی حضوری میں جینے لگے۔

خدا کی معرفت کے بارے میں صحیح اور متوازن مسلک

اسلام کا موقف نہ محض فلسفیوں کی طرح عقلی ہے، نہ صرف صوفیہ کی طرح وجدانی؛

بلکہ ایک متوازن اور جامع راہ ہے جس میں **عقل، علم، اور قلب — تینوں کی شرکت** لازم ہے۔

قرآنِ کریم اسی توازن کو یوں بیان کرتا ہے:

يَرْفَعِ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مِنكُمْ وَٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْعِلْمَ دَرَجَـٰتٍ ۚ

(سورۃ المجادلہ 58: آیت 11)

"اللہ تم میں سے ایمان لانے والوں اور جنہیں علم دیا گیا ہے، ان کے درجات بلند کرتا ہے۔"

یوں معرفتِ الٰہی تزکیۂ نفس کی بلند ترین منزل ہے.

جہاں انسان اپنے رب کی پہچان کے ساتھ اپنی بندگی کو مکمل کر لیتا ہے۔

یہی معرفت اس کے ظاہر و باطن، فکر و کردار، اور عمل و نیت، سب کو ایک الٰہی مرکز پر مجتمع کر دیتی ہے۔

www.KitaboSunnat.com

دین میں تزکیۂ نفس کی اہمیّت

اور

اُس کی عمومی ضرورت

انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد؟

اگر یہ سوال کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے اللہ تعالیٰ کا حقیقی مقصود کیا ہے ؟ وہ کیا غرض ہے جس کے لیے اس نے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کیا اور شریعت اور کتابیں نازل فرمائیں ؟ تو اس کا صحیح جواب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ——— نفوسِ انسانی کا تزکیہ ——— حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے جو دُعا فرمائی، اس میں آپ کی بعثت کی اصل غایت یہی بیان فرمائی ہے کہ آپؐ لوگوں کا تزکیہ کریں۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔

اور اے ہمارے رب ! تو ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج، جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

(بقرہ ۱۲۹)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے مطابق جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالےٰ نے آپؐ کی بعثت اور اس کے مقاصد کا حوالہ ان الفاظ میں دیا :

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝ (بقرہ ۱۵۱)

چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول تمہی میں سے بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تم کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اسی طرح سورۂ جمعہ میں آپؐ کی بعثت اور اس کے اغراض ومقاصد کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل پر ان الفاظ میں احسان جتایا ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

وہی خدا ہے جس نے امیوں (بنی اسمٰعیل) میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک اس سے پہلے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مذکورہ بالا آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں جہاں تزکیہ کا ذکر آیا ہے وہیں تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب وحکمت کا بھی ذکر آیا ہے تو ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصلی مقصد صرف تزکیہ ہی کو کیسے قرار دے دیا؟ آخر دوسری چیزیں بھی تو اسی اہمیت کے ساتھ مذکور ہوئی ہیں وہ کیوں اصلی مقصد قرار پانے کی مستحق نہیں ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن مجید کے اسلوبِ بیان نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ مذکورہ آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی مقصد بعثت کی حیثیت سے جس چیز کا ذکر ہوا ہے وہ تزکیہ ہے۔ باقی اس کے ساتھ دوسری چیزیں ـــ تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب وحکمت ـــ جو مذکور ہوئی ہیں تو وہ اصلی مقصد کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اصلی مقصد کے وسائل وذرائع کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا دونوں

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آیتوں میں سے ایک آیت (آیت - ۱۲۹) میں تزکیہ کا لفظ سب سے آخر میں آیا ہے اور دوسری آیت (آیت - ۱۵۱) میں سب کے شروع میں آیا ہے - ایک غور کرنے والا شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہی بات کے بیان کرنے میں اسلوب کا یہ ردوبدل کم از کم قرآن مجید میں بلا وجہ نہیں ہو سکتا اب غور کیجیے کہ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے ؟ ہماری سمجھ میں اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ اس تقدیم و تاخیر سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نبیؐ کی تمام جد و جہد اور اس کی تمام سرگرمیوں کا محور و مقصود در اصل تزکیہ ہی ہے - کیوں کہ اصل مقصد ہی کی یہ اہمیت ہوتی ہے کہ وہ شروع میں بھی ایک کام کرنے والے کے پیش نظر ہوتا ہے اور آخر میں بھی — وہی اس کی تمام سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز بھی ہوتا ہے اور وہی نقطۂ اختتام بھی ____ وہیں سے وہ اپنا سفر شروع بھی کرتا ہے اور وہیں اس کو ختم بھی کرتا ہے -

کسی اسکیم کے اندر جو چیز مقصدی اہمیت کی حامل ہوتی ہے وہ عمل میں اگرچہ مؤخر ہوتی ہے لیکن ارادہ اور خیال میں مقدم ہوتی ہے - آپ ایک مکان کی تعمیر سے جو مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ سکونت کی راحت ہے اور یہ چیز عین اس وقت بھی آپ کے سامنے ہوتی ہے جب کہ آپ ایک مکان کا نقشہ ابھی کاغذ کے صفحہ پر بنا رہے ہوتے ہیں - حالاں کہ عملاً یہ چیز حاصل اس وقت ہوتی ہے جب مکان بن چکتا ہے اس پہلو سے دیکھیے تو مکان کی تعمیر سے جو اصل مقصد ہے (یعنی سکونت کی راحت) وہ شروع میں بھی آپ کے پیش نظر ہے اور آخر میں بھی پیش نظر ہے - فرق صرف یہ ہے کہ شروع میں آپ نے اس کو فکراً اور ارادتاً سامنے رکھا ہے اور آخر میں نتیجۃً اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ ایک مکان کی تعمیر کے لیے پہلی اینٹ زمین پر جماتے ہوئے بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اس سے سکونت کی لذت و راحت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس وقت بھی کہہ سکتے ہیں جب کہ تمام مراحل تعمیر سے گزر کر اس کے کوٹھے کی آخری اینٹ بھی رکھی جا چکی ہو کیوں کہ در حقیقت یہی چیز ہے جو آپ کی تمام تعمیری سرگرمیوں میں شروع سے آخر تک پیش نظر رہی ہے - ظاہر میں آپ نے پھاوڑے بھی چلائے ، اینٹیں بھی پکائیں آرے بھی چلائے ، چونا اور گارا بھی فراہم کیا ، دیواریں بھی چنیں اور چھتیں بھی پاٹیں لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی فی نفسہ آپ کا مقصود نہیں رہی ہے - اس تمام کھکیڑ سے اصل مقصد در حقیقت

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ کا یہ تھا کہ آپ کو سکونت کی آسائش حاصل ہو۔

اس مثال کو سامنے رکھ کر آپ اگر انبیاء کی بعثت کے مقصد کو سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا اصلی مقصد تو لوگوں کے نفوس کا تزکیہ ہی ہوتا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے وہ اپنی تمام دعوتی اور اصلاحی سرگرمیوں کا آغاز کرتے ہیں لیکن اس مقصد کی خاطر انہیں بہت سے ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں جو اس مقصد کے حصول کا وسیلہ و ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس کے لیے وہ اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہیں، اس کے لیے وہ حکمت کا درس دیتے ہیں۔ مگر مقصود ان سارے کاموں سے صرف تزکیہ ہوتا ہے جو شروع میں بھی ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے اور آخر میں بھی وہی ان کی تمام جدّوجہد کی غایت بنتا ہے چنانچہ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے مذکورہ بالا آیات میں سے ایک آیت میں اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام سرگرمیوں کے نقطۂ آغاز کی حیثیت سے نمایاں کیا ہے اور دوسری آیت میں اس کی غایت اور منتہا کی حیثیت سے۔

علاوہ ازیں قرآن مجید میں اس بات کی بھی صاف تصریح موجود ہے کہ تزکیہ ہی وہ اصل کام ہے جس کے لیے لوگوں کو نبی سے رجوع کرنا چاہیے اور نبیؐ کا فرض ہے کہ جو لوگ اس غرض کے لیے اس سے رجوع کریں، ان کو وہ ہرگز مایوس نہ کرے، چنانچہ ایک موقع پر بعض اسباب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طالبِ تزکیہ کے معاملے میں تھوڑی سی غفلت ہو گئی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مندرجہ ذیل الفاظ میں تنبیہ فرمائی گئی:۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۔ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى
وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى
(عبس)

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا کہ اس کے پاس نابینا آیا، اور تمہیں کیا خبر؟ شاید وہ تزکیہ حاصل کرنے آیا ہو۔

اس آیت سے بالکل صاف واضح ہو رہا ہے کہ نبی خلقِ خدا کی جس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے وہ ان کے نفوس کا تزکیہ ہے، اس وجہ سے لوگوں کو یہ حق ہے کہ اس غرض کے لیے اس سے رجوع کریں اور نبیؐ کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ وہ لوگوں کی یہ ضرورت پوری کرے۔

جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصلی مقصد لوگوں کا تزکیہ قرار دیا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتب

www.KitaboSunnat.com

گیا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا بھی اصلی مقصد اسی چیز کو قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا ہے:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُلْ	فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا
هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى۔	ہے، اور اس سے کہو کہ ہے تیرے
(۱۷-۱۸- نازعات)	اندر کچھ رغبت کہ تو تزکیہ حاصل کرے۔

پھر یہ حقیقت بھی قرآن مجید سے ثابت ہے کہ تزکیہ ہر شخص کی فلاح و نجاتِ آخرت کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ تزکیہ کی یہ اہمیت بھی تقاضا کرتی ہے کہ یہی چیز انبیاء کی بعثت کی غایت اور ان کی تمام سرگرمیوں کا محور و مقصد قرار پائے، چنانچہ قرآن مجید اس بات پر شاہد ہے کہ آخرت میں انسان کی نجات و فلاح منحصر ہے تمام تر اس بات پر کہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے۔ فرمایا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ	اس نے فلاح پائی جس نے اپنے نفس
مَنْ دَسّٰىهَا۔	کا تزکیہ کرے اور وہ نامراد ہوا جس نے
(شمس)	اس کی گندگیوں پر پردہ ڈالا۔

اسی طرح دوسری جگہ ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى۔	اس نے فلاح پائی جس نے تزکیہ حاصل
(الاعلیٰ)	کیا۔

ظاہر ہے کہ جب آخرت میں انسان کی نجات و فلاح تزکیہ حاصل کرنے پر منحصر ہوئی تو انبیاء علیہم السلام کا، جو انسانیت کے نجات دہندہ کی حیثیت سے دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اصلی کام یہی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کریں اور ان کو تزکیہ حاصل کرنے کے طریقے بتائیں۔

اوپر کے مباحث سے تین باتیں واضح ہوئیں:۔

ایک یہ کہ تزکیہ تمام دین و شریعت کی غایت اور تمام انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصود ہے، دین میں جو اہمیت اس کو حاصل ہے وہ اہمیت دوسری کسی چیز کو بھی حاصل نہیں ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسری ساری چیزیں وسائل و ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ چیز غایت و مقصد کی حیثیت رکھتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی سرگرمیاں، خواہ ظاہر میں کتنے ہی مختلف پہلو رکھتی ہوں لیکن باطن میں ان کا ہدف انسان اور انسانی معاشرہ کے تزکیہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

دُوسری بات یہ واضح ہوئی کہ تزکیہ کا سرچشمہ اور اس کا منبع و مصدر کتاب اللہ ہے، اسی کی تعلیم سے تزکیہ کا آغاز ہوتا ہے اور پھر اسی کے اسرار و حقائق ہیں جو نبی صلی اللہ کے ذریعہ سے واضح ہو کر اس تزکیہ کی تکمیل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی نکتہ ہے کہ سورہ بقرہ اور سورہ جمعہ کی جو آیتیں ہم نے اوپر نقل کی ہیں، ان میں تزکیہ کو تلاوتِ آیات کے ساتھ اس طرح وابستہ کیا ہے کہ یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ تزکیہ درحقیقت تلاوتِ آیات ہی کے ثمرات و نتائج میں سے ہے:

يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ — تم کو ہماری آیتیں سناتا اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ — ان کو ہماری آیتیں سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ تزکیہ کا عمل انسانی معاشرہ کے کسی خاص گروہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تمام افراد اور تمام گروہوں بلکہ پورے معاشرہ سے یکساں طور پر ہے، کوئی شخص بھی اس کے بغیر آخرت میں نجات اور فلاح حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کی حیثیت دین میں صرف ایک فضیلت کی نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے لیے ایک ناگزیر انفرادی ضرورت کی ہے۔ یہ نجات اور فلاحِ آخرت کے لیے ایک ضروری شرط ہے جس کو پورا کیے بغیر کوئی شخص جنّت میں نہیں داخل ہو سکتا۔

تزکیہ کا علم نہ راز ہو سکتا ہے نہ نامکمل:

اگر یہ تینوں باتیں اپنی جگہ پر ثابت ہیں (اور کوئی شخص بھی ان کے ثابت ہونے سے انکار نہیں کر سکتا) تو ان سے دو نتیجے لازمی طور پر نکلتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تزکیہ کے علم کو نامکمل چھوڑ کر دنیا سے تشریف نہیں لے جا سکتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ تزکیہ کو آپ کے مقاصدِ بعثت میں محض ایک ضمنی جگہ حاصل نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اوپر واضح ہوا، اصل مقصدِ بعثت یہی ہے۔ پھر جو چیز اصل مقصدِ بعثت ہو، اس کو پیغمبر ناتمام اور ناقص چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟ تزکیہ کی اس اہمیت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس طرح شریعت کے تمام اُصول کتاب و سنت کے اندر منضبط کر دیے گئے ہیں، اسی طرح تزکیہ کے تمام اصول بھی کتاب و سنت کے اندر منضبط ہوں، جس طرح شریعت کے اندر کسی بے راہ روی کے لیے گنجائش نہیں چھوڑی گئی ہے، اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی کسی بے راہ روی کی گنجائش باقی نہ رہے، جس طرح شریعت کے اندر ایک خاص دائرہ میں اجتہاد کی آزادی کے باوجود کسی شخص کو اس بات کا موقع حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے ذوق یا ذاتی رجحانات یا اپنے شخصی تجربات کو اس کے اندر گھسا دے، اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی ایک خاص دائرہ میں اجتہاد کی آزادی کے باوجود ایسی حد بندیاں ہونی چاہئیں کہ اشخاص و افراد کے اپنے میلانات و رجحانات کی دراندازیوں کے لیے کوئی منفذ باقی نہ رہے۔ جس طرح شریعت کے اندر ہر مجتہد اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنے اجتہاد کو کتاب و سنت ہی کے اشارات کی کسوٹی پر پرکھتا اور پرکھواتا ہے اور اس کے بغیر اس کا اجتہاد بھی لائقِ قبول نہیں ٹھہرتا، اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی اگر کوئی شخص کوئی بات اپنے اجتہاد سے کہے تو اس کے لیے ناگزیر ہو کہ وہ کتاب و سنت کے اشارات اور نبیﷺ اور صحابہؓ کے طرزِ عمل سے کوئی دلیل لائے۔ محض اپنے ذوق و وجدان کا حوالہ نہ دے ورنہ اس کے اجتہاد کا کوئی وزن نہیں۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تزکیہ کا علم کوئی راز نہیں ہو سکتا جو صرف خاص خاص اشخاص ہی کو معلوم ہو اور انہی سے سینہ بسینہ وہ دوسروں کو منتقل ہو۔ تزکیہ ایک عام ضرورت کی چیز ہے، ہر شخص آخرت کی نجات و فلاح کے لیے اس کا محتاج ہے۔ انبیاء آتے ہی اس لیے ہیں کہ وہ افراد کا بھی تزکیہ کریں اور معاشرہ کا بھی تزکیہ کریں۔ پھر جو چیز اس قدر عمومی ضرورت کی ہو اُس کو صرف چند خاص خاص افراد کے سینہ کا راز بنا کے کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص، ہر علم کا اہل نہیں ہوا کرتا، اس وجہ سے اگر ایک شخص اس علم کا

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذوق رکھنے والا نہ ہوگا تو وہ اس سے محروم رہے گا، علیٰ ہذا القیاس اہلِ علم میں فرق مراتب بھی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے سارے جاننے والے ایک درجہ کے نہیں ہوسکتے، لیکن یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ یہ کوئی "پراسرار" علم ہے جس کے جاننے والے صحابہؓ کے زمانہ میں بھی چند ہی افراد تھے اور بعد میں بھی خال خال افراد ہی ہوئے۔ جو چیز ہوا اور پانی کی طرح ہر شخص کے لیے ضروری ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بس ایک دو آدمیوں کے کانوں میں پھونک کر چلے جائیں، دوسروں کو اس کی خبر ہی نہ ہونے پائے اور یہ دو ایک آدمی بھی اس کو عام کرنے کی بجائے، اس کو راز بنا کر رکھ چھوڑیں اور صرف انہی اشخاص پر اس راز کو کھولیں جو ان کے محرم راز بن جائیں۔ علم کیمیا کی تعلیم میں تو یہ رازداری چل سکتی ہے لیکن تزکیہ اگر عام ضرورت کی چیز ہے (اور اس کی عام ضرورت کی چیز ہونے سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے) تو اس میں اس رازداری کا چلنا نہ ممکن ہے اور نہ قرینِ مصلحت۔

ہمارے حنفی علمائ عام ضرورت کی چیزوں میں عموماً خبر احاد کو کوئی اہمیت نہیں دیتے وہ کہتے ہیں کہ جس چیز کا تعلق عام ضرورت سے ہے اس کے بارہ میں ایک دو طریقوں سے روایت کے کیا معنی؟ لیکن یہی حضرات جب تصوّف کے کوچے میں آتے ہیں تو تزکیہ کے علم کو ایک راز ثابت کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ان باتوں کو اہلِ ظاہر کیا جانیں یہ "اسرار و مواجید" ہیں۔ وہ اس فخر کے نشہ میں اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ اگر تصوف کا منشا تزکیۂ نفس ہے تو تزکیۂ نفس تو ایک عام ضرورت کی چیز ہے، پھر ایک عام ضرورت کا تقاضا ایک ایسے علم سے کیسے پورا ہوسکتا ہے جو صرف چند سینوں کا ایک راز ہو۔

بعض احادیث سے غلط استدلال

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے اس سے وہ نتائج نہایت بدیہی طور پر نکلتے ہیں جو ہم نے نکالے ہیں اور عقل عام بھی انہی کی تائید کرتی ہے لیکن ہمارے اہل تصوف حضرات اس علم کو ایک پُراسرار علم ثابت کرنے پر نہایت مُصر ہیں، وہ اپنے اس دعوے پر

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتب

www.KitaboSunnat.com

جہاں بہت سے مشائخ تصوف کے اقوال سے دلیل لاتے ہیں وہاں بعض احادیث اور بعض آثار بھی پیش کرتے ہیں۔ مشائخ تصوف کے اقوال واشارات سے تو یہاں بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن جن احادیث وآثار سے انہوں نے استدلال کیا ہے، ان کی حقیقت واضح کرنا ہمارے لیے ضروری ہے ورنہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں کھٹک باقی رہ جائے گی۔

ان حضرات کا سب سے بڑا استدلال حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت سے ہے جو بخاری شریف میں مندرجہ ذیل الفاظ میں وارد ہے۔

عن ابی هریرۃ قال حفظت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعائین فاما احدھما فبثثتہ فیکم فاما الآخر فلو بثثتہ لقطع ھذا البلعوم (بخاری)	ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو ظرف اکٹھے کیے تھے، ایک ظرف کا علم تو میں نے تمہارے اندر پھیلا دیا رہا دوسرا ظرف تو اگر اس کے علم کو میں تمہارے اندر پھیلاؤں تو میری یہ گردن کاٹ دی جائے گی۔

اس حدیث سے یہ حضرات ثابت کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کردہ ایک ایسا ذخیرۂ علم بھی تھا جس کی حیثیت بالکل ایک سرِ مخفی کی تھی، جس کے حقائق اور باریکیوں کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہ تھا بلکہ صرف خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے تھے۔ یہ علم ان حضرات کے خیال کے مطابق جمہور کے فہم اور ان کے مذاق ورجحان سے اس قدر مختلف بلکہ اس کے مخالف تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ ڈرتے تھے کہ اگر اس علم سے وہ پردہ اٹھا دیں تو لوگ ان کو جیتا نہ چھوڑیں۔

یہ نتائج نکال کر ان سے جو اثر یہ حضرات پیدا کرتے ہیں وہ ان نتائج سے بھی زیادہ اہم اور دوررس ہے جن کی آڑ لے کر یہ حضرات تصوف اور آئمہ تصوف کی ان ساری باتوں کو عین دین ثابت کرنا چاہتے ہیں جن کا کتاب وسنت سے کوئی جوڑ نہیں لگتا اور

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جن پر اہل حق ہمیشہ نکیر کرتے رہے ہیں[1]۔ ظاہر ہے کہ اہل تصوف کے اسرار و کشوف کے لیے دین میں بڑی گنجائش نکل آتی ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ علم دین صرف اتنا ہی نہیں ہے جتنا قرآن و حدیث میں نظر آتا ہے بلکہ علم دین کا بہت بڑا حصہ عوام کے اندیشوں سے خواص کے سینوں ہی میں محفوظ رہا اور اگر ان سے منتقل ہوا بھی تو صرف خواص ہی تک محدود رہا۔ عام اہل علم کو ان کی ہوا تک نہیں لگنے پائی، عام اہل علم جنہوں نے قرآن و حدیث کے الفاظ و کلمات کے واسطہ سے دین کو سیکھا ہے وہ تو صرف علم بالاحکام کے وارث ہوئے ہیں۔ اصلی علم تو علم باللہ ہے اور اس کی وراثت صرف ان لوگوں کو منتقل ہوئی ہے۔ جنہوں نے اس علم سینہ میں سے کوئی حصہ پایا ہے۔

یہاں سے یہ حضرات ایک قدم اور آگے بڑھا دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "اہل حقیقت اور اہل ظاہر کے معیارات بالکل الگ الگ ہیں، اس وجہ سے ایک کی باتوں کو دوسرے کی کسوٹیوں پر جانچنا اصولی طور پر غلط ہے، اہل ظاہر جو کچھ کہتے ہیں وہ الفاظ کو دیکھ کر کہتے ہیں اور اہل حقیقت کی نگاہیں معانی کی راز داں ہوتی ہیں ؎

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے یہ اثرات جو پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ، ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خاصے سنگین ہیں اور ان کی زد ہماری پوری شریعت پر پڑتی ہے، اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ ہم اس کا صحیح مطلب واضح کرنے کی کوشش کریں۔

ہمارے نزدیک حضرت ابوہریرہؓ کے اس قول کے تین پہلو ہو سکتے ہیں:

ایک پہلو تو یہ ہو سکتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کو جب یہ باتیں بتائی ہوں تو ساتھ ہی ان کو یہ ہدایت فرمائی گئی ہو کہ یہ دوسروں کو بتانے کی نہیں ہیں بلکہ پوشیدہ رکھنے کی ہیں، اگر تم نے ان کو ظاہر کیا تو یہ اندیشہ ہے کہ تمہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں۔

---

[1] اس کی مثالیں مناسب مواقع پر ہماری اس کتاب میں آئیں گی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں بطور راز کے تو نہ بتائی ہوں بلکہ تعلیم و تبلیغ ہی کے لیے بتائی ہوں لیکن حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی ہی میں ماحول اس قدر بدل چکا ہو کہ وہ باتیں لوگوں کے لیے بالکل اوپری بن کے رہ گئی ہوں اور ان کو پیش کرنا پیش کرنے والے کے لیے خطرے سے خالی نہ رہ گیا ہو۔

تیسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ باتیں ایسی ہوں جن کے بیان و اظہار میں وقت کے اربابِ اقتدار اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوں۔ اس وجہ سے حضرت ابوہریرہؓ کو اندیشہ ہو کہ اگر وہ باتیں وہ بیان کرنی شروع کر دیں تو وقت کے اربابِ اقتدار کے ہاتھوں ان کی جان کی خیر نہ رہے۔

اب عقل و نقل اور روایت و درایت سے ان تینوں پہلوؤں کو جانچیے اور پرکھیے کہ ان میں سے کون سا پہلو واضح نظر آتا ہے۔

۱۔ ان میں سے پہلی صورت تو بداہۃً غلط معلوم ہوتی ہے، اس کی وجہ اوّل تو یہ ہے کہ اس طرح کی پُراسرار باتوں کا کوئی ذخیرہ اں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو محفوظ کرنا ہی ہوتا تو اس امانت کے لیے موزوں ترصینہ اُن فقہا صحابہؓ میں سے کسی کا ہو سکتا تھا جو فہم و فقاہت اور راز داری دین ہونے کے لحاظ سے تمام صحابہ میں ممتاز تھے۔ اس کے لیے موزوں شخص حضرت ابوبکرؓ ہو سکتے ہیں، حضرت عمرؓ ہو سکتے تھے، حضرت عثمانؓ ہو سکتے تھے، حضرت علیؓ ہو سکتے تھے، حضرت زید بن ثابتؓ ہو سکتے تھے، حضرت معاذ بن جبلؓ ہو سکتے تھے، حضرت ابوالدرداءؓ ہو سکتے تھے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ ہو سکتی تھیں یہ لوگ صحابہ میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے اور دین و شریعت کی باریکیوں کے سمجھنے اور مختلف چیزوں کے مدارج و مراتب کے امتیاز میں نمایاں درجہ رکھتے تھے اس وجہ سے بجا طور پر اس علم کے حامل اور امین ہونے کے زیادہ اہل تھے جس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ ع

بردار تواں گفت   بہ منبر نتواں گفت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت ابوہریرہؓ کا ایک محدث اور کثیر الروایۃ صحابی ہونے کے لحاظ سے جو درجہ ہے اس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ دین کی باریکیاں سمجھنے میں ان کا وہ مرتبہ نہیں ہے جو طبقہ اوّل کے صحابہؓ کا ہے اور اس حقیقت کو نبی صلعم سے زیادہ جاننے پہچاننے والا اور کون ہو سکتا ہے ؟

دوسری وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو جو تعلیم و تلقین بھی فرمائی وہ چھپانے اور راز رکھنے کے لیے نہیں بلکہ سیکھنے اور سکھانے کے لیے ہی فرمائی ہمیں قرآن یا حدیث میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے آنحضرت صلعم کی زندگی میں یا دوسرے انبیاء کی زندگی میں اس قسم کی صوفیانہ رازداری کا پتہ چلتا ہو خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بار بار صحابہؓ کو اس بات کی تاکید فرمائی کہ وہ جو کچھ آپ کی صحبت میں سنیں اور دیکھیں، اُس کو دُوسروں کو بتائیں، آپ نے فرمایا : " میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو" آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ " میرے منہ سے جو کچھ سنو اس کو محفوظ کر لو کیوں کہ میرے منہ سے کوئی بات غلط نہیں نکلا کرتی " آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سامعین کو یہ ہدایت فرمائی کہ جو لوگ موجود ہیں، وہ اُن لوگوں کو یہ ساری باتیں بتائیں جو موجود نہیں ہیں کیوں کہ بہت سے لوگ دوسروں سے سُن کر براہِ راست سننے والوں سے زیادہ محفوظ رکھتے ہیں، آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ حق بات جانتے ہوئے دوسروں کو اس کے بتانے سے گریز کریں گے قیامت کے دن اُن کے مُنہ میں آگ کی لگام لگائی جائے گی۔

اس طرح کی متعدد تاکیدات مختلف پہلوؤں سے ہمیں احادیث میں آپؐ کی طرف سے ملتی ہیں لیکن کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ آپؐ نے کسی ایک صحابیؓ سے بھی کوئی بات فرمائی ہو اور پھر یہ تاکید کی ہو کہ اس کو اپنے ہی تک راز رکھنا، دوسروں پہ اس کو نہ کھولنا، ورنہ لوگ تمہاری جان کے دشمن بن جائیں گے ۔ اس کے برخلاف بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ آپؐ نے کوئی بات بتائی ہے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرمائی ہے کہ اس کو بتانا اور کہنا اگرچہ اس کے سبب سے لوگ تمہارے دشمن ہی بن جائیں اور تمہیں نقصان ہی پہنچائیں ۔ صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی زندگیوں ہی میں نہیں بلکہ دوسرے انبیاءؑ اور اُن کے صحابہ کی زندگیوں میں بھی ہمیں اس طرح کی ہدایات و تاکیدات کم و بیش انہی الفاظ میں ملتی ہیں ۔ حضرت مسیحؑ نے ایک مرتبہ اپنے شاگردوں کو کچھ ہدایات دیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ "لوگ ان باتوں کے سبب سے تمہیں بازاروں میں کوڑے لگائیں گے اور عدالتوں میں مجرم ٹھیرائیں گے مگر تم ان باتوں کی پروا نہ کرنا، تمہارا آسمانی باپ تمہارے ساتھ ہے ۔"

۲۔ اب دوسری صورت کو لیجئے، یعنی اس بات کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں حضرت ابوہریرہؓ کو سکھائی اور بتائی تو ہوں تبلیغ و تعلیم کے عام مقصد ہی کے تحت لیکن حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی ہی میں لوگوں کے حالات اس قدر متغیر ہو چکے ہوں کہ ان باتوں کو بتانا اور سکھانا جان جوکھوں کا کام بن گیا ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی ہی میں زمانہ کے حالات بہت کچھ بدل چکے تھے، اُن کی وفات خلافتِ راشدہ کے خاتمہ کے بعد بنی اُمیّہ کی حکومت کے زمانہ میں ہوئی ہے جب کہ مسلمانوں کے اندر طلبِ دین کا جوش سرد پڑ رہا تھا اور طلبِ دنیا کی سرگرمیاں اس کی جگہ پر غالب آنی شروع ہو گئی تھیں لیکن اس انقلابِ حال کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنی امیہ کے دور میں (کم از کم شروع میں) عوام کا مزاج اس قدر نہیں بگڑا تھا کہ لوگ دین کی باتوں سے اس درجہ نامانوس اور اور بیگانہ ہو جائیں کہ ان کو پیغمبرؐ کی حدیثیں سنانا بھی ایک پرخطر کام بن جائے اس دور میں جلیل القدر صحابہؓ کا ایک گروہ موجود تھا، ان کے شاگرد لوگ ہر جگہ موجود تھے، ان کا اعزاز و احترام بھی اچھا خاصا لوگوں میں پایا جاتا تھا، احادیث کے نقل و روایت کی گرما گرمی بھی ہر جگہ موجود تھی، بہت سی خرابیوں کے پیدا ہونے کے باوجود، فضا ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی تھی کہ دین کی باتوں کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بتانا اور سیکھنا دشوار ہو جائے اس دور میں عجمی تمدن اور عجمی علوم کا گھن بھی طبائع کو نہیں لگا تھا کہ لوگ اس فطری سادگی اور دلکشی سے بالکل ہی نامانوس ہو جائیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اقوال میں پائی جاتی تھی، ذہنی اعتبار سے کچھ لوگ متغیر ضرور ہو گئے تھے لیکن اتنے پست نہیں ہو گئے تھے کہ ان میں اسلامی باتوں کے سمجھنے یا اسلامی اقدار کے احترام کی صلاحیت ہی سرے سے باقی نہ رہ گئی ہو۔ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں دین کی سادہ اور عام تعلیمات کے سننے والے موجود تھے اور دین کی گہری باتیں سمجھنے والے بھی ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ دین کی گہری باتوں کو سمجھنے کے اہل جس طرح ہر دور میں تھوڑے ہی پائے گئے ہیں، اسی طرح اس دور میں بھی ان کی تعداد تھوڑی تھی پس یہ بات کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ حضرت ابوہریرہؓ نے محض عوام کے فسادِ مذاق کے سبب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دبے ہوئے علم کو ظاہر کرنے سے اپنے آپ کو بے بس اور مجبور محسوس کیا ہو۔

۳۔ اب رہ گئی تیسری صورت، یعنی حضرت ابوہریرہؓ کا یہ ذخیرۂ علم ایسی حدیثوں پر مشتمل ہو جن کے نقل و روایت اور جن کے پھیلنے میں وقت کے اربابِ اقتدار اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوں۔

ہم کو یہی بات قرینِ قیاس اور عقل و نقل کے مطابق معلوم ہوتی ہے کیوں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے بنو امیہ کا دور اور مروان اور امرائے مروان کا جور دیکھا تھا اُن کی وفات ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں ہوئی ہے جب کہ مسلمان بنو امیہ کے جبر و استبداد کے شکنجے میں اچھی طرح کسے جا چکے تھے اور بنو امیہ تلوار کے زور سے ان تمام اہلِ حق کے دبا لینے کے درپے تھے جو ان کے استبداد اور ان کی سیاسی و اجتماعی بدعتوں کے خلاف آواز اُٹھا رہے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کے ذخیرۂ علم میں ایسی بہت سی حدیثیں تھیں جن میں اسلامی امراء و حکام کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں یا جن میں بنو امیہ کے دور کے فتنوں ان کے "ملک عضوض"

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(استبداد) اور ان کے "چھوکروں" کی ستم رانیوں اور ان کے ہاتھوں دین اور اہل دین کی بربادی کی بابت حضورؐ نے پیش گوئیاں فرمائی تھیں، حضرت ابوہریرہؓ نے اس قسم کی روایات کے ذخیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں روزہ ونماز اور حج وزکوٰۃ کی حدیثوں کی طرح اجتماعی وسیاسی معاملات سے متعلق حدیثیں بھی کھلم کھلا بیان کرنا شروع کردوں تو مستبدین وقت مجھے جیتا نہ چھوڑیں[1]۔

حضرت ابوہریرہؓ کے قول کا یہ مطلب عقل ونقل اور روایت ودرایت کے بالکل مطابق معلوم ہوتا ہے اور صرف میں نے ہی اس کا یہ مطلب نہیں سمجھا ہے بلکہ دوسرے شارحین حدیث بھی اس مطلب کی طرف گئے ہیں، چنانچہ لمعات میں اس کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے:

وقیل اراد به اخبار الفتن	اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے حضرت
وفساد الدین علی ید اغیلمة	ابوہریرہؓ کا اشارہ ان احادیث کی طرف
من قریش وکان ابوهریرة	ہے جو فتنوں سے متعلق ہیں اور جن میں
یکنی عن بعض ولا یصرح به	قریش (بنوامیہ) کے چھوکروں کے ہاتھوں

[1] حضرت ابوہریرہؓ کے اس قول کا مطلب تو بلاشبہ یہی ہے لیکن اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس طرح جان کے اندیشہ سے صحابہؓ نے رسولؐ کے دیے ہوئے علم کے ایک بڑے حصہ کو ضائع کردیا اور وہ امت کی طرف منتقل ہونے ہی سے رہ گیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ان روایات کو سرے سے بیان ہی نہیں کرتے بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ ان چیزوں کے بیان کرنے میں محتاط ہوگئے ہیں، ان کو آزادی کے ساتھ اپنے اہل اور لائق شاگردوں ہی سے بیان کرتے تھے، ان ہی کے ذریعہ سے ان کا علم بعد والوں کو منتقل ہوا، یہی وجہ ہے کہ بہت سی حدیثوں کی شہرت پہلے دور میں نہیں ہوئی بلکہ دوسرے یا تیسرے دور میں ہوئی لیکن بہرحال علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ضائع نہیں ہوا بلکہ اسلاف سے اخلاف تک منتقل ہوگیا اور یہی ہمارے سنت صالحین کی ذمہ داری تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خوفًا علی نفسہ کقولہ اعوذ باللہ من امارۃ الصبیان یشیر الی امارۃ یزید بن معاویۃ ۔	دین کی بربادی کی پیشین گوئیاں ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ ان میں سے بعض کی طرف اپنے اقوال اور دعاؤں میں اشارہ بھی کرتے تھے لیکن اندیشہ جان کے سبب سے نام لے کر ان کا ذکر نہیں کرتے تھے مثلاً وہ کہا کرتے تھے "میں چھوکروں کی امارت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں" اور اس سے ان کا اشارہ یزید بن معاویہ کی امارت کی طرف ہوتا تھا۔

دوسری حدیث جس سے یہ حضرات، اپنے باطنی علم کی تائید میں استدلال کرتے ہیں وہ عبداللہ بن مسعود سے ان الفاظ میں مروی ہے:

عن ابن مسعود قال قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انزل القرآن علی سبعۃ احرف لکل آیۃ منھا ظھر و بطن ۔ (الحدیث)	عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ قرآن سات قرأتوں پر نازل ہوا ہے اور ان میں سے ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔

اسی حدیث کے ہم معنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ایک قول بھی ہے جس میں انہوں نے قرآن کے ایک دریائے معانی ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن ایک دریائے معانی ہے، قرآن کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے، قرآن میں تمام علم اوّلین اور تمام علمِ آخرین ہے، قرآن کی تازگی پر کبھی باسی پن نہیں آئے گا، قرآن سے اہل علم کبھی آسودہ نہیں ہوں گے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ پر حقیقت ہیں اور ان لوگوں سے منقول ہیں جو قرآن کے رازداں رہے ہیں، لیکن اس مضمون کی احادیث و آثار اور اس کے ہم معنی اقوال و اشارات سے یہ استدلال

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنا کہ قرآن نے ایک ایسا علم باطن بھی دیا ہے جس کے حامل ہر دور میں صرف چند نفوسِ قدسیہ ہی رہے ہیں اور انہی کے ذریعہ سے یہ علم ہر دور کے مخصوص حاملین کو سینہ بہ سینہ منتقل ہوا ہے، ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے، اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطن بھی ہے لیکن اس کا کوئی باطن نہیں ہے جس کی راہنمائی خود اس کا ظاہر نہ کرتا ہو، قرآن کے اندر اسرارِ حکمت کا لاریب ایک خزانہ ہے لیکن اس خزانہ کی کلید خود قرآن کے ہی الفاظ و اشارات ہیں، قرآن سے باہر ان کی کلید نہیں ہے، قرآن کے علوم کا ایک حصّہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، ایک حصّہ اس کے اشارات سے کھلتا ہے، ایک بہت بڑا حصّہ اس کے سیاق و سباق سے بے نقاب ہوتا ہے اور پھر سب سے بڑا خزانہ اس کے نظام کی معرفت سے سامنے آتا ہے۔ جو لوگ قرآن پر تدبّر کرتے ہیں وہ بقدرِ استعداد اس سے فیض پاتے ہیں اور وہ اپنی ہر بات پر قرآن ہی کے الفاظ و اشارات اور سیاق و نظام سے دلیل لاتے ہیں، اس معاملہ میں مجرد ذوق یا کشف یا مشاہدہ کو دلیل راہ نہیں بناتے۔ ایک فقیہہ جس طرح قرآنِ حکیم سے ایک فقہی حکم مستنبط کرتا ہے، اور اس پر قرآن کے الفاظ یا اشارات سے کوئی دلیل پیش کرتا ہے اور اگر وہ اس طرح کی دلیل نہ پیش کرے تو اس کی بات بالکل بے وزن ہو کے رہ جاتی ہے، اسی طرح ایک "صاحبِ اسرار" کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہر سِرّ پر جس کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے قرآن سے سمجھا ہے، قرآن سے دلیل لائے اور اگر وہ قرآن سے دلیل نہ لا سکے تو اس کے اس نکتہ کی کوئی وقعت نہیں اگرچہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس نے یہ نکتہ خانہ کعبہ کے اندر قرآن کی روحانیت کی طرف توجہ کے ذریعے سے حاصل کیا ہے۔ [1]

پس جہاں تک قرآن کے اندر اسرار و حکم کے موجود ہونے کا تعلق ہے اس سے کسی کو انکار کی مجال نہیں ہے لیکن اسرار و حکم کے اس خزانہ پر کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے اس خزانہ میں سے بقدرِ صلاحیت و استعداد وہ لوگ حصّہ پاتے ہیں جو کتابِ الٰہی پر تدبر کرتے ہیں اور ان شرائط کے ماتحت تدبر کرتے ہیں جو قرآن پر تدبر کے لیے مقرر ہیں حضرات صوفیائے کرام نے جو اسرار و معارف دریافت کیے ہیں ان کا وہ حصّہ بے شک صحیح ہے جو

[1] اس قسم کے اسرار کی دلچسپ مثالیں ہم آگے مناسب مواقع سے پیش کریں گے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انھوں نے قرآن کے تدبر کے ذریعے سے حاصل کیا ہے اور جس پر وہ قرآن سے کوئی دلیل رکھتے ہیں مگر مجرّد اس بنا پر کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطن بھی ہے، علمِ باطن کا ایک پورا نظام کھڑا کر دینا اور اس کی حمایت میں مذکورہ بالا حدیثوں سے دلیل لانا صریح زیادتی ہے۔ باطن نماز کا بھی ہے، باطن روزہ کا بھی ہے، باطن حج کا بھی ہے، باطن زکوٰۃ کا بھی ہے اور قرآن نے صاف صاف اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان میں سے ہر چیز کا ایک باطن ہے اور وہی باطن مقصود حقیقی ہے لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ کوئی شخص اُٹھ کر ان عبادات کی ساری صورت و ہیئت بالکل بدل ڈالے اور جب کوئی شخص اس پر اعتراض کرے تو وہ جواب دے کہ "یہ باتیں باطن سے تعلق رکھنے والی ہیں، ان کو اہلِ ظاہر کیا جانیں"۔ قرآن نے جہاں یہ بتایا ہے کہ ان میں سے ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔ وہیں یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ فلاں ظاہر کا باطن یہ ہے تاکہ کسی بے راہ روی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تزکیہ کا لغوی مفہوم، اُس کا مقصد
اور
اُس کی وسعت

عربی زبان میں تزکیہ کا مفہوم کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا، اس کو نشو و نما دینا، اور اُس کو پروان چڑھانا ہے۔

تزکیہ کا عمل مختلف چیزوں پر ظاہر میں تو مختلف شکلوں میں نمایاں ہو گا، مادی چیزوں پر یہ عمل کسی اور شکل میں نمایاں ہو گا اور معنوی چیزوں پر کسی اور صورت میں۔ لیکن یہ فرق محض ایک ظاہری فرق ہو گا، حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی فرق نہیں ہو گا، لفظ کے اندر صاف ستھرا بنانے، نشو و نما دینے اور پروان چڑھانے کی جو رُوح ہے وہ اس کے عمل میں ہر جگہ نمایاں رہے گی۔

اس بات کو مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ تزکیہ کا عمل زمین کے ایک ٹکڑے پر بھی کیا جا سکتا ہے اور ایک انسان کے نفس پر بھی کیا جا سکتا ہے اگرچہ ان دونوں چیزوں پر اس عمل کی صورت ظاہر میں مختلف ہو گی اس لیے کہ میدانِ عمل الگ الگ ہیں، لیکن حقیقت اور مقصد کے لحاظ سے دونوں عملوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہو گا، زمین کا تزکیہ یہ ہو گا کہ اس کو پہلے جھاڑ جھنکار سے صاف کیا جائے، اس کی ناہمواریوں کو ہموار کیا جائے پھر اس پر ہل چلا کر اس کو نرم بنایا جائے۔ پھر کھاد اور پانی دے کر اس کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق کسی صالح بیج کو نشو و نما دے سکے اور اس سے پھل اور پھول حاصل ہو سکیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نفس کا تزکیہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر جو غلط افکار و نظریات جڑ پکڑ گئے ہیں، ان کی جڑیں اکھاڑی جائیں، جاہلی عادات و اخلاق نے اس کے اندر جو کجیاں اور ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں، ان کو درست اور ہموار کیا جائے، تقلیدوں اور رسموں کی پرستش نے اس کو بے حسی اور جمود کے جو روگ لگا رکھے ہیں ان کو دور کیا جائے۔ فانی اور نفسانی لذتوں کی چاٹ نے اس پر جو پست ہمتی اور بزدلی طاری کر رکھی ہے اس کا علاج کیا جائے تاکہ اس کی آنکھیں کھل سکیں، اس کا دماغ سوچ سکے، اس کی ہمت ابھر سکے، اس کی عادتیں سنور سکیں اور وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق اپنی ذہنی، اخلاقی اور روحانی ترقی کے اس بلند مرتبہ تک پہنچ سکے جس مرتبہ تک پہنچنے کی اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر قابلیت رکھی ہے۔

تزکیہ کا اصطلاحی مفہوم: اسی مفہوم سے ملتا جلتا تزکیہ کا اصطلاحی مفہوم بھی ہے۔ اس کا لغوی مفہوم جیسا کہ اوپر بیان ہوا کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا اور اس کو پروان چڑھانا ہے اور اس کا اصطلاحی مفہوم نفس کو غلط رجحانات و میلانات سے موڑ کر نیکی اور خدا ترسی کے راستہ پر ڈال دینا اور اس کو درجۂ کمال پر پہنچنے کے لائق بنانا ہے۔

تزکیہ کا یہ اصطلاحی مفہوم خود قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے واضح ہوتا ہے:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰهَا فَأَلْهَمَهَا	اور شاہد ہے نفس اور جیسا اس کو بنایا
فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا، قَدْ أَفْلَحَ	پس اس کو سجھادی نیکی اور بدی کی،
مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ	کامیاب ہوا جس نے اس کا تزکیہ کیا اور
مَنْ دَسّٰهَا	ناکام ہوا جس نے اسے آلودہ کیا۔

اس آیت سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کے رجحانات ودیعت کر دیے ہیں۔ اور اس کو یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان امتیاز کر سکے، پھر انسان کے لیے فلاح و کامرانی کا راستہ یہ ٹھہرایا ہے کہ وہ نیکی اور بدی کی اس کشمکش میں نیکی کا ساتھ دے

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس کو بدی پر غالب کرنے کی کوشش کرے۔

صحیح شعور کے ساتھ نیکی کو غالب کرنے اور بدی کو مغلوب کرنے کا یہ جہاد قرآن مجید کی اصطلاح میں تزکیہ ہے۔

علم تزکیہ کی وسعت

تزکیہ کے اس مقصد و مفہوم کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جو علوم ہمارے نفس سے براہِ راست بحث کرنے والے ہیں ان میں علم طب ہی ایک ایسا علم ہے جو تزکیہ کے علم سے کسی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ علمِ طب ہمارے جسم کی بیماریوں اور ان کے علاج سے بحث کرتا ہے اور علم تزکیہ ہماری روح کے امراض اور ان کے علاج سے بحث کرتا ہے لیکن اس مشابہت کے باوجود دونوں میں بہت بڑا فرق بھی ہے، علمِ طب کا دائرہ بحث نہایت محدود ہے وہ صرف ہمارے نفس کے ایک پہلو یعنی جسم اور اس کے امراض سے بحث کرتا ہے، اس کے برعکس علمِ تزکیہ ہمارے نفس کے تمام ظاہری و باطنی گوشوں سے بحث کرتا ہے ہمارا نفس جن جن قوتوں اور قابلیتوں سے بھی مرکب ہے، یہ ان سب پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے اور ان سب کی تربیت کرتا ہے۔ ہمارے اندر جتنے احساسات و جذبات پائے جاتے ہیں، یہ سب کو زیر بحث لاتا ہے اور ان سب کی اصلاح کرتا ہے۔ ہمارا نفس جن گوناگوں اور مختلف النوع روابط و تعلقات کے بندھنوں میں بندھا ہوا ہے، یہ ان سب کا جائزہ لیتا ہے اور سب کو ایک خاص اصول و ضابطہ کے تحت منظم کرتا ہے، ہمارے دل کے خیالات، ہمارے ذہن کے وسوسے، ہماری طبیعت کے میلانات اور ہمارا اٹھنا بیٹھنا ہمارا کھانا پینا، ہمارے مشاغل اور ہماری دلچسپیاں، ہمارے روز و شب کے معمولات غرض ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس سے یہ بحث نہ کرتا ہو۔

علم تزکیہ کا اصلی کام

پھر صرف یہی نہیں کہ یہ ہمارے نفس کے ہر پہلو سے بحث کرتا ہے، یا ان کی خرابیوں کو دور کر کے ان کی جگہ پر جو کچھ صحیح ہے اس کو پیش کرتا ہے، بلکہ اس کا اصلی کام اس بحث و تمحیص اور اس تعلیم و تلقین سے آگے ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے نفس کی ہر پہلو سے ایسی تربیت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی کرتا ہے جس سے ہمارا نفس "نفسِ مطمئنہ" بن جائے۔

نفسِ مطمئنہ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے علم کی بنیاد ایسے مضبوط یقین پر قائم ہو جائے کہ رنج وراحت اور دکھ اور سکھ کی کوئی حالت بھی خدا کے بارے میں ہمارے اعتماد اور ہمارے حسنِ ظن کو بدل نہ سکے بلکہ ہر حالت میں ہم خدا سے راضی اور مطمئن رہیں، اسی طرح ہمارے عمل کی بنیاد ایک ایسی مستحکم بصیرت پر قائم ہو جائے کہ تنگی و فراخی اور خوف و طمع کی کوئی آزمائش بھی ہم کو اس مقام سے نہ ہٹا سکے جہاں اللہ کی شریعت نے ہمیں کھڑا کیا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے جو کچھ چاہا ہے، ہم اس کو پورا کر کے اس کے پسندیدہ بندے بن سکیں، یہی نفسِ مطمئنہ تزکیہ کا اصل مقصود ہے، قرآن میں اس نفسِ مطمئنہ کا بیان ان الفاظ میں ہوا ہے:

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً	اے ٹھکانے کے نفس، تو لوٹ اپنے خداوند کی طرف، تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔

خوب سے خوب تر کی جستجو

اس تفصیل سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ تزکیہ میں ایک آرٹ کی شان بھی پائی جاتی ہے کیونکہ تزکیہ کا مطمحِ نظر صرف اسی قدر نہیں معلوم ہوتا کہ ہمارا نفس کسی نہ کسی شکل میں راہ پر لگ جائے بلکہ تزکیہ اس سے آگے بڑھ کر نفس کو خوب سے خوب تر بنانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ تزکیہ صرف اتنا ہی نہیں چاہتا ہے کہ ہمیں خدا اور اس کی شریعت کا کچھ علم حاصل ہو جائے بلکہ وہ اس سے بڑھ کر یہ بھی چاہتا ہے کہ ہمیں خدا اور اس کی صفات کی سچی اور پکی معرفت حاصل ہو جائے۔ تزکیہ صرف یہی نہیں پیشِ نظر نہیں رکھتا ہے کہ ہماری عادتیں کسی حد تک سنور جائیں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم تمام مکارمِ اخلاق کے پیکرِ مجسم بن جائیں تزکیہ صرف اتنے پر ہی قناعت نہیں کرتا کہ ہمارے جذبات میں ایک ہم آہنگی اور ربط پیدا ہو جائے بلکہ وہ اس پر مزید ہمارے جذبات کے اندر رقت و لطافت اور سوز و گداز کی گھلاوٹ بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ تزکیہ کا مطالبہ صرف اسی قدر نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی نہ کسی طرح ہمارا نفس، احکامِ شریعت

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتب

www.KitaboSunnat.com

کے تحت آجائے بلکہ اس کا اصل مطالبہ یہ ہے کہ ہمارا نفس خدا اور اس کے رسول کے ہر حکم کو اس طرح بجا لائے جس طرح اس کے بجا لانے کا حق ہے۔ اس کا مطالبہ ہم سے صرف خدا کی بندگی ہی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اس بات کے لیے بھی ہوتا ہے کہ ہم خدا کی اس طرح بندگی کریں گویا ہم اسے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مختصر الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ تزکیہ ایمان، اسلام اور احسان تینوں کے تقاضے بیک وقت ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے خدا کو اس کی تمام صفتوں کے ساتھ مانیں، پھر وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم اس کے تمام احکام کی زندگی کے ہر گوشہ میں اطاعت کریں اور پھر اس کا مطالبہ ہم سے یہ بھی ہے کہ یہ ماننا اور اطاعت کرنا محض رسمی اور ظاہری طریقہ پر نہ ہو بلکہ پورے شعور اور گہری للہیت کے ساتھ ہو جس میں ہمارے اعضاء و جوارح کے ساتھ ہمارا دل بھی پورا پورا شریک ہو۔

اس چیز نے تزکیہ کو ایک مستمر جدوجہد اور ایک مسلسل تگ و دو کی چیز بنا دیا ہے اس میں کوئی وقفہ یا ٹھیراؤ نہیں ہے، اس سفر میں کوئی موڑ یا مقام ایسا نہیں آتا ہے جہاں پہنچ کر آدمی یہ سمجھ سکے کہ بس اب یہ آخری منزل آگئی ہے، یہاں پہنچ کے ذرا سستا لینا چاہیے یا بیں کمر کھول دینی چاہیے۔ یہ ایک خوب سے خوب تر کی جستجو ہے، اس خوب سے خوب تر کی جستجو میں نگاہ کو کہیں ٹھہرنے کی جگہ نہیں ملتی جس رفتار سے اعمال و اخلاق اور ظاہر و باطن میں جلا پیدا ہوتا جاتا ہے، اسی رفتار سے مذاق کی لطافت، حس کی ذکاوت اور آنکھوں کی بصارت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دامن کے پچھلے دھبے دھو کے ابھی فارغ نہیں ہوئے کہ نگاہ کچھ اور ڈھونڈ کے سامنے رکھ دیتی ہے کہ اب انہیں دھوئیے ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں   اب دیکھیے ٹھیرتی ہے جا کر نظر کہاں؟

عمل تزکیہ کی اس فطرت نے اس کو نہایت مشکل اور دشوار کام بنا دیا ہے۔ اگر ایک شخص اس کی وسعتوں کو دیکھ کر بالفرض نہ بھی گھبرائے تو بھی ڈر رہتا ہے کہ مبادا یہ تسلسل اس کی کمر ہمت توڑ کے رکھ دے، لیکن اگر یہ عمل فطری طریقہ پر اس تدریج و ترتیب کے ساتھ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا جاتا رہے جو اس کے لیے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں بتایا گیا ہے تو اس وسعت اور اس لامنتاہیت کے باوجود ایک طالب حق کے لیے اس سے زیادہ لذیذ اور پرکشش کام کوئی دوسرا نہیں ہے، اس کی وسعتوں کو دیکھ کر دل پر ہراس ضرور طاری ہوتا ہے لیکن اس راہ میں ہر قدم پر غیب سے جو راہنمائی حاصل ہوتی ہے وہ راہنمائی اس قدر تسلی بخش ہوتی ہے کہ ہمت برابر بندھی رہتی ہے اور دل کبھی بے حوصلہ نہیں ہونے پاتا۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ — جو ہماری طلب میں جدوجہد کرتے ہیں، ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھول دیتے ہیں

اس طرح اس راہ کے تسلسل سفر سے جو تکان لاحق ہوتی ہے اس کا ازالہ ان نئے نئے حقائق و لطائف کے انکشاف سے ہوتا رہتا ہے جو برابر تازہ زندگی بخشتے رہتے ہیں۔

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

جد و جہد کے تسلسل کے ساتھ اگر تازہ بتازہ فتوحات برابر حاصل ہوتی رہیں اور ہر نئی کامیابی پچھلی تمام کامیابیوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہو تو محنت کی یکسانی اور اس کے تسلسل کے باوجود طبیعت کند نہیں ہونے پاتی بلکہ ہر نیا مرحلہ نئے ذوق و شوق کے ساتھ شروع کرنے کا حوصلہ بار بار خود پیدا ہوتا رہتا ہے۔

تزکیہ کا اصل موضوع

اوپر کی تفصیل سے اگرچہ عمل تزکیہ کی فطرت اور اس کی دشواریوں اور مشکلوں کا اندازہ ایک حد تک کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے سارے پہلوؤں کو نگاہ کے سامنے لانے کے لیے مناسب طریقہ یہ ہوگا کہ تزکیہ کے اصل موضوع کو سامنے رکھ کر اس کے سارے اطراف کو احاطہ میں لینے کی کوشش کی جائے کیونکہ جتنے پہلو اس موضوع کے ہوں گے، لازماً اتنے ہی پہلو اس تزکیہ کے بھی ہوں گے لباس ہمیشہ قامت کو سامنے رکھ کر تراشا جاتا ہے، اس وجہ سے اگر قامت کا اندازہ ہو جائے تو لباس کے طول و عرض کا اندازہ آپ سے آپ ہو جائے گا۔

تزکیہ کا موضوع ظاہر ہے کہ نفس انسانی ہے لیکن خود نفس کیا ہے؟ یہ ایک بڑا

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اہم سوال ہے، اس سوال کو اسلام کے فلسفہ میں بھی اہمیت دی گئی ہے اور جاہلیت کے فلسفہ میں بھی اس کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ ایتھنز کے معبد کے دروازہ پر سقراط کا یہ مقولہ کندہ تھا کہ: "اے انسان تو اپنے آپ کو پہچان!" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی حکمت میں معرفتِ نفس کو حصولِ تزکیہ کی راہ میں بنیادی چیز خیال کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہ مقولہ مشہور ہے:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ عَرَفَ رَبَّهٗ — جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے خدا کو پہچانا۔

اس وجہ سے ضروری ہے کہ خود نفس کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ یہ کن صفات اور کن تقاضوں سے مرکب ہے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کا تزکیہ کن کن باتوں کا متقتضی ہوگا۔

نفس کے تجزیہ سے ہمارا مطلب یہاں اس طرح کا تجزیہ نہیں ہے جس طرح کا تجزیہ فلسفی لوگ کسی چیز کی ماہیت و حقیقت معلوم کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں، ہمارے نزدیک نہ تو نفس کی حقیقت و ماہیت معلوم ہو سکتی ہے اور نہ ہمارے مقصد کے لیے اس کی ماہیت و حقیقت کا معلوم ہونا کچھ ضروری ہے۔ ہم صرف نفس کے صفات اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور اس کے صرف ان عقلی و اخلاقی پہلوؤں کو سامنے لائیں گے جو علمِ تزکیہ میں زیرِ بحث آتے ہیں یا آنے چاہئیں۔

نفسِ انسانی کے مختلف پہلو

اب آئیے غور کیجیے کہ ہمارے نفس کے (جس کو ہم عربی میں "أنا" اور اردو میں "میں" سے تعبیر کرتے ہیں) کیا کیا پہلو ہیں جن پر تزکیہ کا عمل واقع ہو سکتا ہے اور جن کے تزکیہ کے بغیر اس کا اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پروان چڑھنا ناممکن ہے۔

ہم اپنے نفس پر جب غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے اس کے جو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں اور جو بدیہی طور پر عملِ تزکیہ کے تحت آتے ہیں وہ دو ہیں۔

ایک یہ کہ ہمارا نفس ادراک کرتا ہے۔

دوسرا یہ کہ ہمارا نفس عمل کرتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادراک ہمارے نفس کا اصل جوہر ہے ، یہ نہ ہو تو انسان اینٹ پتھر سے زیادہ وقعت دیئے جانے کے لائق نہیں ہے پھر یہ ادراک جیسا کہ ظاہر ہے صرف جزئیات ہی کا ادراک نہیں ہے بلکہ کلیات اور حقائق کا ادراک بھی ہے اور ہمارے نفس کی یہی وہ صفت ہے جو درحقیقت اس کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے ورنہ وہ ایک جانور سے زیادہ اہمیت دیئے جانے کا مستحق نہ قرار پایا ، یہ کلیات کا ادراک اس کے لیے تعقل و تفکر کی وسیع راہیں کھولتا ہے ، اسی سے اس کے تمام علوم و افکار اور تمام عقائد و نظریات وجود میں آتے ہیں ، اسی کی مدد سے وہ ظاہر سے باطن اور مجاز سے حقیقت تک پہنچتا ہے ، اسی کی راہنمائی میں وہ مخلوق سے خالق اور مصنوع سے صانع تک رسائی حاصل کرتا ہے ، اسی کی روشنی میں وہ مصنوع کو دیکھ کر صانع کی صفتوں اور اس کی پسند اور ناپسند کا اندازہ کرتا ہے اور پھر اسی کی مدد سے وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے لیے زندگی کی صحیح روش کیا ہے ؟ اور اس پر بحیثیت ایک انسان کے کیا فرائض اور کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں اور ان ذمہ داریوں کو اسے کس احساسِ مسئولیت اور کس مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے ۔

اندازہ کیجیے کہ ہمارے نفس کا یہ پہلو کس قدر اہم ہے ۔ بدیہی طور پر نظر آتا ہے کہ نفس کے دوسرے تمام پہلو اسی کے تابع ہیں ، اگر اس کی اصلاح ہو تو پورے نفس کی اصلاح ہو سکتی ہے اور اگر اس کے اندر کوئی ادنیٰ خرابی بھی موجود رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہو سکتی ۔ یہ انسان کی فکر ہی ہے جو اس کو گمراہ یا راہ یاب بناتی ہے اگر فکر کا ایک قدم بھی غلط اُٹھ جائے تو سارا فلسفہ ہی غلط ہو کے رہ جائے اور نتائج نکالنے میں کوئی معمولی فروگذاشت بھی ہو جائے تو علم کی ساری عمارت ہی دھڑام سے زمین پر آ رہے اور پھر اس خرابی کے نتیجہ کے طور پر لازماً زندگی کے ہر گوشہ میں فساد پھیل جائے ۔

تزکیۂ علم و ادراک

علم و ادراک کی اس اہمیت کے سبب سے تزکیہ میں علم و ادراک کے تزکیہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے ، اس میں مقدم شے یہ ہے کہ پہلے وہ بنیادی سوالات طے کر دیے جائیں جو فکر و نظر کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں مثلاً یہ کہ ہم کیا ہیں ؟ کہاں سے آئے ہیں ؟ کہاں جائیں گے ؟

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہم خالق ہیں یا مخلوق؟ مختار ہیں یا مجبور؟ غیر مسئول ہیں یا کسی کے آگے جواب دہ؟ اگر کسی کے آگے جواب دہ ہیں تو اس کی صفات کیا ہیں؟ ہماری زندگی کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے؟ وہ کیا پسند کرتا ہے، کیا ناپسند کرتا ہے؟ اگر کسی روش کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے اختیار کرنے والے کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے؟ ان سارے سوالوں کا نہایت قطعی اور حتمی جواب نفس کو علمی کجرویوں اور گمراہیوں سے بچانے کے لیے ناگزیر ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان سوالوں کے جو صحیح اور قطعی جوابات مہیا کیے جائیں ان پر تقلید و جمود اور غفلت و نسیان کا گرد و غبار نہ جمنے پائے اور اگر خدانخواستہ کسی گوشہ میں زنگ لگتا ہوا نظر آئے تو اس کو مانجھ کر برابر صاف کیا جاتا رہے۔

تزکیۂ عمل

اسی طرح دوسرے پہلو یعنی عمل کو لیجیے، یہ پہلو بھی علم ہی کی طرح وسیع ہے، انسان کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا ہے جس میں وہ کوئی نہ کوئی عمل نہ کرتا ہو، اور اس کا یہ عمل اس کے نفس پر کوئی بُرا یا بھلا چھاپ نہ چھوڑتا ہو۔

ان اعمال کے متعلق صرف جائز اور ناجائز کا ہی سوال پیدا نہیں ہوتا، بلکہ جائز و ناجائز سے زیادہ اہمیت رکھنے والا سوال ان کے محرکات سے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ انسان کے اعمال کی محرک کوئی ایک ہی شئے نہیں ہوتی، بلکہ مختلف محرکات ہیں جو اس کو عمل کے لیے اکساتے ہیں اور ان سے ہر محرک کا عمل کے مزاج پر براہ راست اثر پڑتا ہے، ایک ہی عمل ایک محرک کے تحت نیکی کا عمل بنتا ہے اور وہی عمل دوسرے محرک کے تحت بدی کا عمل بن جاتا ہے۔

پھر ہمارے اندر جتنے بھی محرکات ہیں، ان کے متعلق یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کن پر اعتماد کیا جائے؟ کون ہیں جن کی ترغیب و تحریک قبول کی جائے اور کون ہیں جن کی ترغیب و تحریک آنکھ بند کر کے قبول کرنے میں اندیشے اور خطرے ہیں۔

کبھی ہم کوئی عمل کسی ضرورت کی تحریک سے کرتے ہیں مثلاً بھوک لگتی ہے تو کھانا کھاتے ہیں، پیاس لگتی ہے تو پانی پیتے ہیں، تکان محسوس ہوتی ہے تو آرام کرتے ہیں۔

اسی طرح ہم بہت سے عمل خواہشوں کی تحریک سے کرتے ہیں مثلاً شہرت و ناموری کے حصول کے لیے بہادری کے کام کرتے ہیں، ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لیے رفاہِ عام کے کارنامے

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انجام دیتے ہیں۔ دولت مند بننے کے لیے صنعت و حرفت اور تجارت کے کاروبار پھیلاتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس ہمارے بہت سے کام جذبات کے تحت ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم کسی سے محبت اور کسی سے نفرت کرتے ہیں۔ کسی پر حسد اور کسی پر مہربانی کرتے ہیں۔ کسی پر احسان کرتے ہیں اور کسی سے انتقام لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہم گہرے تجزیۂ نفس سے یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بہت سے اعمال ایسے بھی ہیں جن کا محرک مذکورہ تمام محرکات سے بالاتر ہوتا ہے، اس کے تحت ہمارے تعقل و تفکر اور ایثار و بے غرضی کے وہ سارے کام آتے ہیں جن کے اندر اپنے باریک ترین تجزیہ سے بھی ہم کسی نفسانی شائبہ کا سراغ نہیں پاتے ہیں۔ اس محرک کو ہم رُوحِ ملکوتی یا نفسِ ناطقہ کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہ چاروں قسم کے محرکات ہمارے اندر کبھی الگ الگ کام کرتے ہیں اور کبھی ملے جُلے ہوئے ہوتے ہیں۔ نیز یہ اپنے فعل میں افراط و تفریط کے بھی مرتکب ہوتے ہیں، اس وجہ سے ہر عمل میں ان کا تجزیہ کرتے رہنا اور ان کی افراط و تفریط پر ان کا محاسبہ کرتے رہنا اور ان کو ان کے فطری و شرعی حدود کا پابند بنانا ایک بڑا طویل سلسلہ ہے، اس سارے سلسلہ کو ایک خاص نظم کے تحت منظم کرنا بھی تزکیہ کے فرائض میں داخل ہے۔

تزکیۂ تعلقات و معاملات

علم و عمل اور جذبات و محرکات کے بعد ہمارے نفس کا دوسرا پہلو اس کے تعلقات و معاملات کا ہمارے سامنے آتا ہے اور یہ بھی اپنی وسعت میں کسی طرح مذکورہ پہلوؤں سے کم نہیں ہے بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

نفس کے تعلقات میں سب سے پہلے جو تعلقات زیر بحث آتے ہیں وہ نفس کا تعلق خدا کے ساتھ اور خود اپنے ساتھ ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو خالق نہیں بلکہ مخلوق تسلیم کرتے ہیں تو یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ خالق کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ اور وہ بالکل صحیح بنیادوں پر کس طرح قائم ہو سکتے ہیں؟

اِس کے بعد دوسرے درجہ میں خود اپنے نفس کا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے، ہم جس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چیز کو "انا" یا "میں" سے تعبیر کرتے ہیں وہ بدیہی طور پر بہت سی چیزوں کا مالک یا امین ہے اس کے قبضہ میں ایک جسم ہے، دل و دماغ ہیں، قوتیں اور قابلیتیں ہیں، احساسات اور جذبات ہیں، آخر وہ ان ساری چیزوں کے ساتھ کس طرح معاملہ کرے گا ؟ کیا وہ ان ساری چیزوں کا مالک ہے اور اس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کو جس طرح چاہے استعمال کرے یا وہ ان چیزوں کا امین ہے اور ان کو وہ صرف ان حدود کے اندر ہی استعمال کر سکتا ہے جو امانت رکھنے والے کی طرف سے ان کے استعمال کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں ؟ اگر دوسری شکل ہے تو پھر یہ سوال بھی اُٹھتا ہے کہ وہ حدود کیا ہیں ؟ جن کی نگہداشت اس سلسلہ میں لازمی ہے اور پھر انہی کے ساتھ ان ظاہری اور باطنی صفات کا جاننا بھی ناگزیر ہوگا جو اس نگہداشت کے فرض سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہیں۔

خدا اور اپنی ذات کے بعد نفس کا تعلق اپنے ماحول سے جڑتا ہے، انسان کے متعلق یہ حقیقت محتاج بحث نہیں ہے کہ وہ ایک اجتماعی وجود ہے، وہ جب بھی پایا جاتا ہے اور جہاں کہیں بھی پایا جاتا ہے، کسی خاندان کے فرد، کسی معاشرہ کے رکن، کسی ریاست کے شہری ہی کی حیثیت سے پایا جاتا ہے۔ ایک بیل جس طرح اپنے پھیلنے، اپنے پروان چڑھنے اور اپنے پھلنے پھولنے کے لیے لازماً کچھ سہاروں کی محتاج ہوتی ہے، اسی طرح انسان بھی اپنے نشوونما اور اپنی ترقی اور کمال کے حصول کے لیے ان سہاروں کا محتاج ہے، ان سہاروں سے الگ ہو کر اوّل تو اس کا وجود پایا ہی نہیں جاتا اور اگر پایا جاتا بھی ہے تو اس طرح کہ اس کی ساری صلاحیتیں بالکل ٹھٹھر کے رہ جاتی ہیں۔ اس وجہ سے تزکیہ ہمارے نفس کے سارے تعلقات کا جائزہ لے کر ان کو صحیح بنیادوں پر استوار کرتا ہے تاکہ وہ اس معراج کمال تک پہنچ سکے جہاں تک وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے پہنچ سکتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تزکیہ کوئی مفرد اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے اطراف دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں، ہمارے نفس کا ہر گوشہ اور ہماری زندگی کا ہر پہلو خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی، عقلی ہو یا عملی، اخلاقی ہو یا اجتماعی و سیاسی، اس کے تحت آتا ہے۔ ہمارے نفس کے تزکیہ کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ اس کے کسی ایک گوشہ میں اُجالا ہو گیا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ہر گوشہ میں روشنی پھیل گئی، ہمارا علم بھی جگمگا اٹھا، ہمارا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عمل بھی پاکیزہ ہو گیا، ہمارے تعلقات و معاملات بھی درست ہو گئے۔

اب ہم تزکیہ کی ان تینوں قسموں۔ تزکیۂ علم اور تزکیۂ تعلقات پر الگ الگ ابواب میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

[redacted]

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تزکیۂ علم

علمِ حقیقی کا سرچشمہ خدا کی معرفت ہے

علم کے تزکیہ پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم مختصراً یہ بتائیں کہ حقیقی علم کیا ہے اور اس علم کے حصول کے وسائل و ذرائع کیا ہیں۔

علم خواہ کسی معمولی سے معمولی بات کا بھی ہو، بہرحال علم ہے اور جہل کے مقابل میں وہ انسان کو فطرتاً عزیز و مرغوب ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس علم کی پیاس انسان کے اندر سب سے زیادہ شدت کے ساتھ موجود ہے، جس علم کو وہ سب سے پہلے ڈھونڈھتا ہے اور جس علم کو وہ دوسرے تمام علموں پر ترجیح دیتا ہے یہ علم محض اس کائنات کے چند طبیعی قوانین و ضوابط کے جان لینے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ علم چند مابعدالطبیعی سوالات کے اطمینان بخش حل سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ سوالات اگرچہ مابعدالطبیعی ہیں، اگرچہ ان سوالات کا تعلق انسان کے بالکل قریبی ماحول سے براہِ راست نہیں ہے اور اگرچہ ان کے حل ہونے سے بظاہر انسان کی کوئی مادی ضرورت بھی پوری نہیں ہوتی تاہم ہر معقول انسان کے فکر و ذہن پر ان کا اس قدر غلبہ ہوا کرتا ہے کہ آدمی اپنے بالکل پاس کے سارے سوالات کو چھوڑ کر سب سے پہلے انہی مابعدالطبیعی سوالات کے حل کرنے کے درپے ہوتا ہے۔

بادی النظر میں یہ بات کچھ عجیب سی ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن اگر گہری نگاہ سے انسان

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتب

www.KitaboSunnat.com

کا ذہنی وفکری تجزیہ کیا جائے تو اس واقعہ سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اسباب خواہ کچھ ہی ہوں لیکن انسان اسی ترتیب سے سوچتا ہے اور اسی ترتیب سے وہ اپنے ذہن میں اُبھرنے والے سوالات کو حل کرنا چاہتا ہے، اس کے سامنے پہلے یہ سوال نہیں آتا کہ اس کا جو جسم ہے وہ کن اجزاء سے بنا ہوا ہے؛ بلکہ پہلے وہ اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس کو پیدا کس نے کیا ہے؛ اسی طرح اس کے ذہن میں پہلے یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ جو پانی وہ پی رہا ہے، اس میں کن کن اجزاء کی کتنی کتنی مقدار شامل ہے اور جو غذا وہ کھا رہا ہے وہ کن کن وٹامینی جوہروں پر مشتمل ہے بلکہ ان سوالات کے پیدا ہونے سے پہلے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ ذات کون ہے جس نے اس کے لیے بلا کسی استحقاق کے یہ خوانِ کرم بچھایا ہے اور اس ذات کی صفتیں کیا ہیں اور اس کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؛ علیٰ ہذا القیاس اس کے ذہن کو پہلے اس تحقیق کی خواہش پریشان نہیں کرتی کہ جس زمین پر وہ چل پھر رہا ہے وہ گول ہے یا چپٹی، ساکن ہے یا متحرک، بلکہ سب سے پہلے اس کے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اس وسیع زمین کو اتنے عجائب کے ساتھ وجود میں کون لایا ہے؛ اور وہ اس کو وجود میں لا کر خود کہاں چھپ کے بیٹھا ہوا ہے؛ وہ اپنے اوپر اس سقفِ نیلگوں کو، اور اس کے ساتھ ان ہزاروں لاکھوں ستاروں اور چاند اور سورج کو دیکھ کر نہ تو اس بات کے دریافت کرنے کے درپے ہوتا ہے کہ یہ جو ایک چھت سی نظر آرہی ہے فی الواقع یہ چھت ہی ہے یا یہ محض ایک خلائے لامتناہی ہے؛ وہ دوربین لے کر نہ چاند کے اندر نظر آنے والے دھبوں کی تحقیقات کے لیے دوڑتا ہے، نہ سورج اور زمین کے درمیان کے فاصلہ کی پیمائش کی فکر میں سرگرداں ہوتا ہے بلکہ سب سے پہلے اگر اس کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کے حل کے لیے بے چین ہوتا ہے تو وہ یہ سوال ہے کہ وہ کون ہے جو ان ساری حیرت انگیز چیزوں کو وجود میں لایا ہے اور ان چیزوں کے وجود میں لانے سے اس کا مقصد کیا ہے[1]؛

---

[1] ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ موجودہ زمانہ کے ماہرینِ سائنس کی ساری توجہ تو اس وقت انہی سوالات پر مرکوز ہے جو اس کائنات کے ظواہر سے متعلق ہیں، خالقِ کائنات کے سوال پر غور کرنے والے تو ان میں بہت کم ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ صورتِ واقعہ یہی ہے لیکن اس سے ہمارا دعویٰ باطل نہیں ہوتا، جہاں تک سوال پیدا ہونے کا (باقی صفحہ ۴۷ پر)

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسان کے سوچنے کا یہ انداز اس کے وہمی پن کا یا محض اس کی ذہنی اپج کا نتیجہ نہیں ہے، وہ ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ اس کو پاس کی چیزیں چھوڑ کر دُور کی کوڑی لانے کا کچھ شوق ہے بلکہ فی الواقع سوچنے کی صحیح ترتیب ہی یہی ہے۔ یہی سوال درحقیقت وہ سوال ہے جس کے حل ہونے سے اس کی رُوح اور اس کی عقل کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ سرا ہے جو مل جائے تو اس کائنات کا سارا الجھاؤ لمحہ بھر میں سُلجھ سکتا ہے اور اگر نہ ملے تو انسان قیامت تک سر مارتا رہے لیکن وہ کسی ایک گرہ کو بھی نہیں کھول سکتا اور اگر کوئی گرہ کھولتا بھی ہے تو پھر اس گرہ کے اندر سے ہزاروں گرہیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس سوال کو حل کیے بغیر اس دنیا میں انسان ہوائی جہازوں پر اڑتے اور ایٹمی آلات جیسی خطرناک چیزیں ایجاد کرنے کے باوجود بھی اس کائنات کے متعلق بالکل اندھیرے ہی میں رہتا ہے وہ ایک گھر کے اندر ہے لیکن اس کو کچھ پتہ نہیں کہ یہ گھر کس کا ہے؟ وہ اس گھر کی مختلف چیزوں کو توڑ پھوڑ رہا ہے، ان کو الٹ پلٹ رہا ہے، ان کو اپنے استعمال میں لا رہا ہے، لیکن اس کو کچھ خبر نہیں کہ اس کے یہ سارے تصرفات اس گھر والے کی مرضی کے مطابق بھی ہیں یا نہیں؟ وہ اس گھر کی بے شمار نعمتوں سے آزادانہ متمتع ہو رہا ہے لیکن اسے کچھ معلوم نہیں کہ ان تمام نعمتوں کے جواب میں اس گھر والے کی طرف سے اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عاید کی گئی ہیں یا نہیں؟ وہ اس گھر کے ہر حصے میں دندنا رہا ہے لیکن اسے کچھ علم نہیں کہ اس گھر والے کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس گھر کو، گھر والے نے اس کو ہمیشہ کے لیے سونپ دیا ہے یا اس میں صرف اس کو چند دنوں کی عارضی سکونت کی اجازت دی ہے؟ اگر عارضی سکونت کی اجازت دی ہے تو اس کے ساتھ کچھ شرطیں بھی ہیں یا یہ حق تصرف بالکل بے قید و شرط ہے؟ اگر کچھ شرطیں ہیں، تو وہ شرطیں

(بقیہ صفحہ ۴۶) تعلق ہے، پیدا تو آج بھی سب سے پہلے یہی سوال ہوتا ہے کہ اس کائنات کا خالق کون ہے؟ اور اس کی صفتیں کیا ہیں؟ لیکن موجودہ زمانہ کے فلسفی اس سوال پر غور کرنے اور اس کو حل کرنے کی بجائے اس سے فرار اختیار کرنے میں سلامتی سمجھتے ہیں، وہ کہنے کو تو بظاہر یہ کہتے ہیں کہ یہ سوال حل نہیں ہو سکتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا حل چونکہ ان کی خواہشوں کے خلاف ان پر بہت سی ذمہ داریاں عاید کرتا ہے، اس وجہ سے وہ اس کو حل کرنے اور اس کی ذمہ داریوں سے دوچار ہونے کے بجائے یا تو اس کے مقابلے میں شتر مرغ کی پالیسی اختیار کرتے ہیں یا اس کے کسی غلط حل پر ہی قانع ہو جاتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا ہیں ؟ اور اگر شرطیں پوری نہ ہو سکیں تو گھر والا ان کے متعلق کوئی باز پرس بھی کرے گا یا نہیں ؟
غور کیجیے کہ کیا کسی کودن سے کودن آدمی کی نسبت بھی یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی عالیشان اور آراستہ و پیراستہ محل کے اندر جا گھسے گا ، اس کی ہر چیز سے بے تکلف فائدہ اٹھانا شروع کردے گا ، اس کے ایک ایک گوشے اور ایک ایک کونے کی تحقیق و تفتیش شروع کردے گا ، اس کے مخفی خزانوں ، اور پوشیدہ دفینوں تک کی چھان بین کرنے لگ جائے گا اور یہ سب کچھ کرنے سے پہلے وہ یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرے گا کہ اس محل کا مالک کون ہے ؟ وہ اس کو اپنے محل میں گھسنے دینے کا روادار بھی ہے یا نہیں ؟ اور اگر بالفرض وہ اس کو اس میں کچھ تصرف کرنے کی اجازت بھی دے رہا ہے تو اس پر اُس نے کچھ پابندیاں اور شرطیں بھی عاید کی ہیں یا بغیر کسی پابندی اور بغیر کسی شرط ہی کے اس نے اپنا پورا محل اس کے حوالے کر دیا ہے ؟ ایک چور اور ایک نقب زن تو بلاشبہ کسی تحقیق و تفتیش کے چکر میں پڑے بغیر اس طرح کے کسی محل میں جا گھسے گا اور اس میں من مانے تصرفات بھی شروع کردے گا ، لیکن کسی شریف آدمی کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کبھی اس قسم کی جسارت کر سکے گا ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عاقل آدمی کے اندر سب سے پہلے اس کائنات کے متعلق یہ مابعد الطبیعی سوالات جو پیدا ہوتے ہیں وہ عین اس کی فطرت کی جڑ سے پیدا ہوتے ہیں ، یہی سوالات ہیں جو پیدا ہونے چاہئیں اور انہی کے صحیح جواب سے دراصل اس کے رُوح و دل کو حقیقی طمانیت و مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور انہی سے علمِ حقیقی کی راہیں بھی کھلتی ہیں ۔

جب آدمی کو اس کائنات کے خالق و مالک کا سراغ مل گیا تو اس کو گویا وہ کلید مل گئی جس سے علمِ حقیقی کے تمام دروازے کھولے جاسکتے ہیں ، اس کے بعد اس کے فکر کے لیے وہ نقطۂ آغاز مل جاتا ہے جہاں سے تحقیق و تفتیش کا صحیح قدم اٹھایا جاسکتا ہے ، اس کے بعد انسان یہ سوال طے کر سکتا ہے کہ یہ دنیا کہاں سے آگئی ہے ۔ اس کے بعد وہ خود اپنی حیثیت اور اپنے مرتبہ کو بھی متعین کر سکتا ہے ، اس کے بعد وہ آفاق و انفس کے مطالعہ سے اس خالق و مالک کی صفتوں کا بھی علم حاصل کر سکتا ہے اور ان صفتوں کو خیر و شر اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کے لیے کسوٹی بھی بنا سکتا ہے ، اس کے بعد اس کے لیے یہ سوال حل کر لینا بھی

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کچھ مشکل نہیں رہ جاتا کہ اس کے لیے زندگی بسر کرنے کی پسندیدہ روش کیا ہے اور ناپسندیدہ روش کیا ہے ؛ بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی سعادت وشقاوت اور قوموں کے عروج وزوال سے متعلق کیا اصول جاری ہیں ؛

انسان کی انفرادی واجتماعی سعادت سے متعلق یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جو سب سے پہلے حل ہونے چاہییں۔ان کے حل ہو جانے کے بعد جہاں تک انسان کی عقلی وروحانی طمانیت کا تعلق ہے وہ اس کو حاصل ہو جاتی ہے۔رہی اس کی مادی وجسمانی آسائش تو وہ اپنی سعی وکوشش اور اپنے تجربی علم کے ذریعے سے قدرت کے قوانین کے دریافت کرتے اور ان کو اپنے معاشی وتمدنی مصالح کی ترقی میں استعمال کرنے کا سلیقہ جس قدر بڑھاتا جائے گا، اسی قدر اپنی معاشی خوشحالیوں میں اضافہ کرتا چلا جائے گا۔

خدا کی معرفت کا صحیح مفہوم

اس تفصیل سے ایک حد تک یہ بات تو واضح ہو گئی کہ حقیقی علم جس سے انسان کی رُوح اور اس کے دل کو طمانیت وتسلی حاصل ہوتی ہے۔اس کا سرچشمہ خدا کی معرفت ہے، لیکن یہاں ہمیں مختصراً یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کی معرفت کا صحیح مفہوم کیا ہے ؛ اس مسئلہ کی وضاحت خاص طور پر اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ ہمارے اربابِ تصوّف کے یہاں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے معاً آدمی کا ذہن خدا کی ذات اور اس کے انوار وتجلیّات کے مشاہدہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن ہم اس لفظ سے ہرگز اس قسم کی کوئی چیز مراد نہیں لے رہے ہیں، ہمارے نزدیک اس سے خدا کے متعلق صرف ان باتوں کا جاننا مُراد ہے جن کو انسان جان سکتا ہے اور جن کو جان لینے کے بعد اس کی عقل مطمئن ہو جاتی ہے کہ معرفتِ الٰہی سے متعلق جس حد تک اس کے حیطۂ ادراک میں ہے وہ یہی ہے اس سے آگے نہ اس کی رسائی ہے اور نہ اس سے آگے کا علم اُس کے لیے ضروری ہے۔مثلاً :

الف: تفصیلی دلائل کے ساتھ اس بات کا علم کہ خدا ہے۔

ب : پُوری وضاحت کے ساتھ خدا کی صفات کا علم۔

ج : اس بات کا علم کہ فلاں فلاں باتوں اور کاموں کو وہ پسند کرتا ہے اور فلاں فلاں باتوں اور کاموں کو ناپسند کرتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

د : اس بات کا علم کہ وہ افراد اور جماعتوں کے ساتھ فلاں فلاں قوانین کے تحت معاملہ کرتا ہے۔

ہ : اس بات کا علم کہ مرنے کے بعد بھی اسی سے سابقہ پڑنے والا ہے، اور وہ اپنے نیک اور بد بندوں کے ساتھ اس اس طرح کا معاملہ کرنے والا ہے۔

خدا کے متعلق اگر مذکورہ بالا باتیں ایسے دلائل کے ساتھ معلوم ہو جائیں جو دل کے اندر اطمینان پیدا کر دیں تو پھر اس کی معرفت کے لیے کسی اور بات کے جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی اور اگر یہ باتیں ایک شخص کو معلوم نہ ہوں تو اگرچہ وہ اپنے خیال میں ہر آن تجلیات و انوار کا مشاہدہ ہی کر رہا ہو، لیکن درحقیقت وہ خدا سے بالکل بے خبر ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس معرفت کے مدارج ہوا کرتے ہیں، اس میں بھی شبہ نہیں کہ کمیّت و کیفیت کے اعتبار سے مختلف عارفین کی معرفت میں فرق ہوا کرتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ معرفت کسی شخص کے لیے محض قال ہوا کرتی ہے اور کسی کے لیے حال بھی بن جایا کرتی ہے۔ لیکن معرفت کی دسترس میں بہرحال وہی چیزیں آتی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ ان سے آگے بڑھ کر اگر انسان خدا کی ذات کا مشاہدہ یا اس کی ذات کی معرفت حاصل کرنا چاہے یا ذاتِ بحت کی تجلیات اور اس کے انوار دیکھنا چاہے تو یہ چیز اس کے امکان سے باہر ہے۔ انسان کو جو عقل ملی ہوئی ہے اس کی رسائی صرف خدا کی صفات ہی تک ہے خدا کی ذات کا وہ کوئی تصور کر ہی نہیں سکتی، اسی طرح انسان کو جو حواس عطا ہوئے ہیں وہ صرف خدا کی نشانیوں اور اس کی آیتوں ہی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، خدا کی تجلیات اور اس کے انوار کا مشاہدہ ان کی قوتِ برداشت اور ان کے تحمل سے باہر ہے۔ قرآن مجید میں یہود کے متعلق بیان ہوا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ جب تک وہ ان کو ذاتِ الٰہی کا کھلم کھلا مشاہدہ نہیں کرائیں گے، اس وقت تک وہ ان کی یہ بات ہرگز باور نہیں کریں گے کہ خدا ان سے کلام کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مطالبہ کو پسند کرنے اور اس کو قبول کرنے کی بجائے اس کو ان کی سرکشی اور حماقت کا نتیجہ قرار دیا اور بجائے اس کے کہ ان کی یہ خواہش معرفتِ الٰہی کی جستجو کا درجہ پاتی اور اس کے جواب میں ان کے لیے تجلیات و انوار کے دروازے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھلتے ان کی یہ خواہش گستاخی قرار پائی اور اس کی سزا میں وہ جلالِ خداوندی کی ڈانٹ سے بے ہوش کر دیے گئے

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

اور یاد کرو جب کہ تم نے موسیٰؑ سے کہا کہ اے موسیٰؑ! ہم تمہاری بات نہیں ماننے کے جب تک کہ ہم خود خدا کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں۔ تو تم کو کڑک نے آدبوچا اور تم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ پھر ہم نے تم کو تمہاری بے ہوشی کے بعد اٹھایا تاکہ تم شکر گزار ہو

(بقرہ - ۵۵ - ۵۶)

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ انسان کے لیے خدا کی ذات کا مشاہدہ بالکل محال ہے وہ خدا کو صرف اس کی نشانیوں اور اس کے کرشموں کی اوٹ ہی سے دیکھ سکتا ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن مجید میں مذکور ہے کہ انھوں نے بھی خدا کی ذات کا مشاہدہ کرنے کی تمنا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جواب دیا کہ تم میری ذات کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ میری تجلیٔ ذات کی تاب تو پہاڑ بھی نہیں لاسکتا تو تم کس طرح لاسکو گے؟ تم صرف میری نشانیوں کا اور میری صفات کے مظاہر کا مشاہدہ کر سکتے ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی پہاڑ پر ظاہر کی جس کا اثر یہ ہوا کہ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی

اور جب موسیٰؑ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوا اور اس کے خداوند نے اس سے کلام کیا تو اس نے درخواست کی کہ اے میرے خداوند! مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھ لوں، اس نے جواب دیا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے، ہاں پہاڑ کی طرف دیکھو اگر وہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ جائے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے تو جب اس کے خداوند نے پہاڑ پر اپنی تجلی ظاہر کی تو اس کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَكَ	پاش پاش کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے، پھر جب
تُبۡتُ اِلَیۡكَ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ	ہوش میں آئے تو بولے کہ تو پاک ہے میں نے تیرے حضور
(اعراف - ۱۴۳)	توبہ کرتا ہوں اور میں پہلے ایمان لانے والا بنتا ہوں۔

یہی بات احادیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

حجابه النور لو كشفه	اس کا نور حجاب ہے، اگر وہ اس حجاب کو ہٹا دے تو اس
لاحرقت سبحات وجهه ما	کے چہرہ کے انوار سے وہ ساری مخلوق جل کے رہ جائے
انتهى اليه بصره من خلقه	جہاں تک اس کی نظر پہنچے۔

(مسلم)

اس سے معلوم ہوا کہ ذاتِ الٰہی اور اس کی تجلیات کے مشاہدہ کی تاب حضرات انبیائے کرام بھی نہ لا سکے، چہ جائیکہ عام لوگ۔ اس وجہ سے جو لوگ خدا کی ذات اور اس کی تجلّیات کے مشاہدہ کے درپے ہوتے ہیں اور اس غرض کے لیے مجاہدے اور مراقبے کرتے ہیں، ہمارے نزدیک وہ ایک سعی لاحاصل میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کے بارہ میں یہ کہنا بھی کچھ بے جا نہ ہوگا کہ یہ لوگ درحقیقت اسی گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہیں جس گستاخی کے مرتکب بنی اسرائیل ہوئے۔

بعینہٖ یہی حقیقت مختلف طریقوں سے حدیثوں میں بھی سمجھائی گئی ہے کہ اپنی عقل کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں غور کرنے کی چھوٹ آدمی اسی وقت تک دے جب تک وہ اس کی صفات و آیات اور اس کی شانوں اور اس کے کرشموں پر غور کرے۔ جب وہ حد سے آگے بڑھ کر خدا کی ذات سے متعلق سوالات اٹھانے شروع کر دے تو آدمی کو چاہیے کہ وہ وہیں رک جائے، اور شیطان کے فتنوں سے خدا کی پناہ مانگے، کیوں کہ یہ سوالات اس کے ذہن میں شیطان کی وسوسہ اندازی ہی کے سبب سے پیدا ہو رہے ہیں اور اس کا نتیجہ حیرانی و درماندگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ شیطان اس چکر میں اس کو صرف اس لیے ڈال رہا ہے کہ اس طرح اس کو کفر اور الحاد میں مبتلا کر دے۔ اسی حقیقت کو مندرجہ ذیل حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یاتی الشیطان احدکم فیقول من خلق کذا من خلق کذا حتی یقول من خلق ربک فاذا بلغہ فلیستعذ باللہ فلینتہ۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ)	ہے کہ تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور یہ سوال شروع کرتا ہے کہ فلاں چیز کس نے پیدا کی، فلاں چیز کس نے بنائی، یہاں تک کہ یہ سوال کرنے لگتا ہے کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا، جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو اس کو چاہیے کہ شیطان کے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگے اور آگے سوچنا بند کر دے۔

معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کا طریقہ

معرفتِ الٰہی کی اہمیت اور اس کا اصلی مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب جو سوال ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس معرفت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب اس مسئلہ پر غور کرنے والے مختلف گروہوں نے مختلف دیا ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے، اس وجہ سے ہم صرف تین گروہوں سے بحث کریں گے، ایک فلاسفہ، دوسرے متکلمین، تیسرے صوفیہ۔ ان گروہوں کے اندر بھی اس سوال کے جواب میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف کے سبب سے ان میں سے ہر گروہ مختلف فرقوں میں بٹ گیا ہے۔ ہم ان اختلافات سے قطع نظر کر کے اس بارہ میں عام فلاسفہ، عام متکلمین اور عام صوفیہ، کی جو رائے ہے وہ اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں

فلاسفہ کی رائے

فلاسفہ خواہ قدیم ہوں یا جدید، ان میں سے جو کسی نوعیت سے بھی خدا کے قائل ہیں (اور انہی سے یہاں بحث ہے) وہ خدا کی معرفت کے لیے انسان کی فطرت اور اس کی عقل کو بالکل کافی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک پیدا کرنے والے نے انسان کو عقل اور فطرت کی راہ نمائی دے کر اس کو کسی مزید غیبی راہنمائی کی ضرورت اور اس کی مداخلت سے بالکل مستغنی کر دیا ہے۔ عقل کا چراغ ہر تاریکی میں اُجالا کرنے کے لیے اُن کے نزدیک کافی ہے۔ اس اندرونی ہادی کی راہنمائی حاصل ہو جانے کے بعد کسی معاملہ میں بھی انسان ان کے خیال میں اس بات کا محتاج نہیں رہا کہ وہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے اپنے سے کسی

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خارج رہنمائی کی طرف متوجہ ہو، ان کے نزدیک عقل انسان کے سارے طبیعی اور مابعد الطبیعی سوالات حل کر سکتی ہے اور اگر وہ نہیں حل کر سکتی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہماری عقل ان سوالات کو حل کرنے کے قابل ہی نہیں ہے بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ابھی وہ ترقی کے اس درجہ پر نہیں پہنچی ہے کہ ان سوالات کو حل کر سکے۔ عقل کی راہنمائی پر یہ اعتماد صرف انہی فلسفیوں نے نہیں ظاہر کیا ہے جو رسالت اور نبوّت کے سلسلہ کے منکر ہیں، بلکہ سلسلۂ نبوت و رسالت کے قائل فلسفیوں نے بھی عقل پر یہی اعتماد ظاہر کیا ہے۔ وہ بھی فلسفہ کے زیر اثر عقل کے ساتھ اس قدر حُسنِ ظن رکھتے ہیں کہ اس کو انسان کی راہنمائی کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور اگر مذہب کے زیر اثر دبی زبان سے کسی حد تک نبی اور رسول کی راہنمائی کی ضرورت تسلیم کرتے بھی ہیں تو محض عوام کالانعام کے لیے، فلاسفہ اور حکماء کو انبیاء کی راہنمائی کی ضرورت سے مستغنی کر دیتے ہیں۔

متکلمین کی رائے

اس کے بالکل برعکس نظریہ ہمارے متکلمین کی اکثریت (بالخصوص اشاعرہ) کا ہے۔ یہ لوگ انسان کی عقل اور فطرت کو ان مابعد الطبیعی سوالات کے حل کے لیے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، بالکل ناکارہ سمجھتے ہیں، ان لوگوں کے نزدیک عقل صرف انہی سوالات کا کچھ الٹا سیدھا حل معلوم کر سکتی ہے جن کا تعلق اس عالمِ محسوس سے ہے۔ اس عالمِ محسوس سے ماوراء حقائق تک پہنچنے کے لیے ان کے نزدیک عقل کے پاس کوئی ذریعہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے ان معاملات میں انسان ایک عاقل مخلوق ہونے کے باوجود ان لوگوں کے نزدیک بالکل ایک مادر زاد اندھے سے مشابہ ہے جو چند قدم چلنے کے لیے بھی کسی عصاکش کا محتاج ہوا کرتا ہے اور اگر عصاکش نہ ہو تو ہر قدم پر یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑے، چنانچہ عام فلاسفہ انسان کو کسی مافوق عقل راہنمائی سے جس شدّت کے ساتھ بالکل مستغنی ثابت کرتے ہیں، ان کے نزدیک ان سارے سوالات کو، جو انسان کی زندگی سے حقیقی تعلق رکھنے والے ہیں، صرف خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء ہی حل کر سکتے ہیں، عقل سے یہ لوگ اس قدر بدگمان ہیں کہ عقل نہ صرف یہ کہ ان سوالات کا کوئی حل دریافت نہیں کر سکتی بلکہ ان سوالات کے جو حل انبیاء بتاتے ہیں، ان لوگوں کے نزدیک عقل ان کی قدر و قیمت بھی نہیں بتا سکتی۔ واضح تر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک انبیاء کی بتائی ہوئی باتوں میں عقل کو سرے سے کوئی دخل ہے ہی نہیں، یہاں تک کہ خود نبی کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہچاننے کے لیے بھی ان لوگوں کے نزدیک کوئی عقلی کسوٹی موجود نہیں ہے۔ یہ لوگ نبی کو صرف اس کے معجزات کے ذریعہ سے پہچانتے ہیں، اُس کی تعلیم، اس کی حکمت، اس کے کارناموں اور اس کے اخلاق کو اس کے پہچاننے میں کوئی دخل نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ یہ لوگ مسلّم اخلاقی اصولوں کے بارہ میں بھی عقل اور انسان کی فطرت کو کوئی فیصلہ کن معیار تسلیم نہیں کرتے، ان کے نظریہ کے لحاظ سے جھوٹ کی بُرائی اور سچ کی اچھائی بھی کوئی عقلی اور وجدانی شے نہیں ہے۔ انبیاء نے سچ کو اچھا کہا، اس وجہ سے وہ اچھا ہے، اور جھوٹ کو بُرا کہا اس وجہ سے وہ بُرا ہے۔ اگر وہ اس کے بالکل برعکس فیصلہ دے جاتے تو عقلی حیثیت سے جھوٹ کے اچھے ہونے اور سچ کے بُرے ہونے میں بھی کوئی قباحت اُن کے خیال میں نہیں تھی۔

صُوفیہ کی رائے

صوفیہ کے نزدیک خدا کی معرفت حاصل کرنے کا اصلی ذریعہ وجدان، کشف اور مشاہدہ ہے۔ ان لوگوں نے معرفت کا معیار جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس قدر اونچا رکھا ہے کہ وہاں تک عقلی اور استدلالی علم کے پہنچنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ جس علم کی بنیاد استدلال پر ہو وہ ان حضرات کے نزدیک ایک پائے چوبیں ہے اور اس پائے چوبیں کے ذریعے سے معرفت کی منزل نہیں طے کی جا سکتی۔ ع

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں عقل کی نارسائیوں پر جو کچھ لکھا ہے اور جس زور سے لکھا ہے یہ ان کے اکیلے کی آواز نہیں ہے بلکہ انہوں نے درحقیقت صوفیہ کے ہر طبقہ کی رہنمائی کر دی ہے۔

حضرات صوفیائے کرام کی یہ رائے صرف فلاسفہ اور حکماء ہی کے علم کے بارہ میں نہیں ہے کہ وہ معرفت کے مقصد کے نقطۂ نظر سے ناکارہ ہے اور اس کی حیثیت ایک پائے چوبیں کی ہے بلکہ وہ علمِ شریعت بھی جس کی بنیاد وحی پر ہے، ان حضرات کے نزدیک حقیقی معرفت کے مقصد کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ اکابر صوفیہ کھلم کھلا

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شریعت کی تحقیر نہیں کرتے بلکہ بہر حال اس کی حیثیت ان کی نظر میں محض "علم ظاہر" کی ہے اور یہ علم ظاہر" ان کے نزدیک اس "علم باطن" کے برابر نہیں ہے جس کو وہ علم حقیقی سمجھتے ہیں اور جس کے متعلق انکا دعویٰ ہے کہ وہ شریعت سے بالکل الگ ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض صوفیوں نے ترنگ میں آکر علم شریعت کے بارہ میں ایسے الفاظ استعمال کر دیے جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے "علم باطن" کے مقابلہ میں اس کو کوئی خاص وقعت نہیں دیتے۔

مثلاً، ایک شیخ تصوف کا ارشاد ہے کہ:

"ہم اپنا علم ایک ایسی ذات سے حاصل کر رہے ہیں جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والی نہیں اور تم اپنا علم ایسے زندہ سے حاصل کر رہے ہو جسے ایک دن بہر حال مر جانا ہے۔"

ایک دوسرے بزرگ سے کہا گیا کہ:

"آپ عبدالرزاق سے حدیث حاصل کرنے کے لیے کیوں سفر نہیں کرتے؟" جواب میں ارشاد فرمایا:

"جو خود خلاق سے حاصل کر رہا ہو وہ عبدالرزاق سے کیا حاصل کرے گا۔"

ایک اور شیخ کا ارشاد ہے کہ:

العلم حجاب بين القلب وبين الله عزّ وجلّ	علم، اللہ اور دل کے درمیان ایک حجاب بن جاتا ہے

ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے:

اذا رأيت الصوفى يشتغل بحدثنا فاغسل يدك منه	جب تم کسی صوفی کو دیکھو کہ وہ حدثنا اور اخبرنا کے چکر میں پڑ گیا ہے تو بس اس سے ہاتھ دھو لو۔

لہ یہ اقوال ہم نے مدارج السالکین ج ۲ صفحہ ۲۴۹ سے لیے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس علم کو قرآن مجید "العلم" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس کے ہوتے ہوئے کسی اور علم کے اتباع کو وہ اتباعِ ہوا اور اتباعِ ضلالت قرار دیتا ہے، اس علم کی قدر و قیمت ہمارے صوفیوں کے ایک گروہ کے نزدیک کیا ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝	اگر تم نے اس "العلم" کے بعد جو تمہارے پاس اللہ کی طرف سے آیا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ کے مقابل میں تمہارا کوئی کارساز اور (باقی صفحہ ۵۰ پر)

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صوفیوں کے نزدیک علم اور معرفت کی حقیقت

صوفیوں کے نزدیک علم اور معرفت کے جو مدارج ہیں اور جس علم کو وہ علم اور جس معرفت کو وہ معرفت کہتے ہیں، ہم یہاں مختصراً اس کی وضاحت کریں گے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ دوسروں کے معیارِ علم و معرفت اور ان کے معیارِ علم و معرفت میں کیا فرق ہے اور اس

(بقیہ صفحہ ۵۶) (بقرۃ ۱۲۰) مددگار نہ ہوگا۔

دوسری جگہ ہے:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ۝

اور اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے، بعد اس کے کہ تمہارے پاس العلم آچکا ہے تو تم اس وقت ظالموں میں سے شمار ہو گے۔

(بقرہ۔ رکوع۔ ۲۷)

لیکن ہمارے صوفیوں کا ایک طبقہ اس علم کو حجاب سمجھتا ہے اور اگر وہ کسی کو اس علم کی طلب میں مشغول پاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان کی نگاہوں میں اس کی کچھ قدر ہو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص ضائع ہو گیا۔ یہاں تک کہ صوفیوں کے نزدیک علم کی اصطلاح ہی سرے سے ایک حقیر اصطلاح بن گئی ہے، وہ جس علم کو علم تحقیقی سمجھتے ہیں، اس کو علم کی اصطلاح سے تعبیر کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ اس کے لیے انھوں نے اپنی ایک خاص اصطلاح "معرفت" کی وضع کی ہے اور جب وہ اپنے علم کو تعبیر کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے مدارج السالکین میں ایک جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ صوفیوں نے اپنے علم کے لیے علم کی جگہ معرفت کی اصطلاح اختیار کی ہے، لیکن انھوں نے اس کا سبب نہیں بیان کیا کہ آخر صوفیوں کو قرآن و حدیث کی اصطلاح کو چھوڑ کر ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ میرے نزدیک ان لوگوں کو اس نئی اصطلاح کے وضع کرنے کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ علم یا العلم کی اصطلاح علم وحی اور علم شریعت کے لیے معروف ہو چکی تھی اور اس علم کو یہ حضرات اپنے علم کے مقابل میں محض ایک علمِ ظاہر کی حیثیت دیتے تھے، اس وجہ سے انہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ اس علم کے لیے وہ کوئی اور اصطلاح وضع کریں جس کو وہ علم شریعت سے افضل و برتر سمجھتے ہیں اور جو اُن کے نزدیک علمِ حقیقی کی حیثیت رکھتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علم و معرفت کے حاصل کرنے کے ان کے ہاں ذرائع کیا ہیں۔ اس وضاحت کے لیے ہم پانچویں صدی ہجری کے مشہور امامِ تصوّف شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل ہروی حنبلی متوفّی ۴۸۱ھ کی یادگار تصنیف منازل السائرین سے پہلے علم کی حقیقت اور اس کے مختلف مدارج کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم معرفت کی حقیقت اور اس کے مراتب پر ان کی رائے نقل کریں گے۔

علم کی حقیقت

شیخ الاسلام نے علم کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ وہ بدیہی علم جو آدمی کے حس و مشاہدہ میں آتا ہے یا جس کی بنیاد قابلِ اعتماد نقل و روایت پر ہے، یا جو سابق تجربات کی صحت پر مبنی ہے

۲۔ وہ علمِ خفی جو پاکیزہ جسموں کی پاکیزہ رُوحوں کے اندر نشوونما پاتا ہے، جو بے ریا ریاضت کے پانی سے سیرابی حاصل کرتا ہے، جو بلند ہمت اشخاص انفاسِ صادقہ کے اندر خلوت کے اوقات اور دنیا کے ہنگاموں سے ناآشنا کانوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ وہ علمِ لدنّی جس کا وجود ہی اس کی سند ہے، جس کا ادراک ہی اس کا مشاہدہ ہے جس کا حکم ہی اس کی تعریف ہے۔

ان میں سے پہلے درجہ کے علم کی صوفیوں کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام نے بھی اس کا ذکر بالکل ایک ابتدائی درجہ کی چیز کی حیثیت سے کیا ہے اور ایک لفظ بھی اس کے متعلق ایسا نہیں لکھا ہے جس سے ذرا بھی اس کی اہمیت محسوس ہوتی ہو۔ حالاں کہ علمِ شریعت بھی ان حضرات کے نزدیک اسی درجہ میں داخل ہے، اس لیے کہ وہی علم ہے "جس کی بنیاد قابلِ اعتماد نقل و روایت پر ہے"۔

دوسرے درجہ کے علم کے بارہ میں شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ:

هو علم يظهر الغائب ويغيب یہ علم غیب کو ظاہر اور حاضر کو غائب کر دیتا ہے

لہ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی مدارج السالکین مطبوعہ مصر میں شروع میں منازل السائرین کا متن درج ہے میں یہاں اس کے مطالب اردو میں پیش کروں گا اور حتی الامکان ٹھیک ٹھیک پیش کرنے کی کوشش کروں گا ـــــ جو اصحاب اصل عبارتیں دیکھنا چاہیں وہ مذکورہ کتاب کی طرف مراجعت کریں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الشھادۃ ویشیر الی الجمع — اور مقامِ جمع کی طرف رہبری کرتا ہے۔)

اس عبارت کی شرح اپنی طرف سے کرنے کی بجائے میں شیخ الاسلام کی کتاب کے سب سے بڑے شارح علامہ ابن قیم کے وہ الفاظ یہاں نقل کیے دیتا ہوں، جو انہوں نے اپنی کتاب مدارج السالکین میں اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے لکھے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"وھو یظھر الغائب" کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز عارف سے اوجھل ہوتی ہے، یہ علم اس چیز کا کشف کر دیتا ہے۔ "ویغیب الشھادۃ" سے یہ مراد ہے کہ یہ علم عارف کو اس کے شہودِ حقیقی کے سوا ہر چیز کے مشاہدہ سے بے خبر کر دیتا ہے۔ "ویشیر الی الجمع" میں وحدانیت و فردانیت کے مقام کی طرف اشارہ ہے جہاں تمام رسوم و قیود مٹ جاتے ہیں، یہاں تک کہ خود شاہد بھی اپنے آپ کو اس فردانیت میں گم کر دیتا ہے[1]"

علم کا تیسرا درجہ جس کو شیخ الاسلام نے علم لدنّی سے تعبیر فرمایا ہے، درحقیقت یہی علم اربابِ تصوّف کے یہاں علم و معرفت کی حقیقی معراج ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام نے اس کی شان میں یہاں تک فرما دیا ہے کہ "لیس بینہ وبین الغیب حجاب" علم لدنّی اور غیب کے درمیان سرے سے کوئی پردہ حائل ہی نہیں رہ جاتا، اس کی تعریف میں بھی شیخ الاسلام نے جو فقرے ارشاد فرمائے ہیں، ان کی وضاحت بھی میں اپنی طرف سے کرنے کی بجائے بہتر سمجھتا ہوں کہ ان کی تفسیر میں جو کچھ علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے اس کو یہاں درج کر دوں، علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

"اسنادہ وجودہ" اس کا وجود ہی اس کی سند ہے، کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس کے علاوہ جو علم ہے[2] اس کے حصُول کا راستہ اسناد ہے، اسی طرح اس علم کے حصُول کا راستہ وجدان ہے۔ "وادراکہ عیانہ" (اس کا ادراک ہی اس کا مشاہدہ ہے) کا مطلب یہ ہے کہ یہ علم فکر و استنباط سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ کشف اور مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ "ونعتہ حکمہ" (جس کا حکم ہی اس

[1] مدارج السالکین مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۴۲ [2] یہ اشارہ صاف علم شریعت کی طرف ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی تعریف ہے) کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ اپنی دلیل ہے، اس کی دلیل کہیں اور سے نہیں لائی پڑتی ۔ وہ خود دلیل، اور خود مدلول ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے درمیان اور غیب کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہ جاتا، بخلاف علم کی دوسری اقسام کے کہ ان کے درمیان اور غیب کے درمیان پردہ حائل رہتا ہے ۔ صوفیوں کے نزدیک اس سے مراد ایک نور ہے جو مشہودِ حقیقی کی طرف سے عارف کی طرف آتا ہے اور وہ اس کے حواس کی تمام قوتوں اور ان کے افعال کو مٹا کر عارف کے اندر خود ان کی جگہ لے لیتا ہے ۔ پھر وہ مشہودِ حقیقی کو اسی نور کے ذریعے سے دیکھنے لگتا ہے اور اس نور کے ظہور کے بعد مشہودِ حقیقی کے سوا عارف کی نظر میں سب کچھ فنا ہو جاتا ہے[1] ۔"

شیخ الاسلام کی اس پوری بحث پر ایک نظر دوبارہ ڈال کر وہ نتائج سامنے رکھیے جو اس سے نکلتے ہیں :

سب سے پہلے چیز تو یہ سامنے آتی ہے کہ معرفت کے نقطۂ نظر سے صوفیائے کرام کے نزدیک علمِ شریعت کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، علمِ شریعت جس کی بنیاد نقل و روایت پر ہے ان کے نزدیک بالکل ابتدائی درجہ کی چیز ہے، معرفت کے نقطۂ نظر سے جس علم کی اہمیت ہے وہ علم خفی ہے یا علم لدنی ۔

علم خفی اور علمِ لدنی کو جس طرح نقل و روایت سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ اسی طرح عقل و استدلال اور فکر و استنباط سے بھی ان کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ تمام سِرّ، وجدان، کشف اور مشاہدہ پر مبنی ہوتے ہیں ۔

ان کے حصول کا راستہ تعقل، تفکر، اور استنباط و اجتہاد نہیں ہے بلکہ مراقبہ، توجہ، ریاضت اور خلوت گزینی ہے ۔

یہ علم عارف کے حواس کو معطل کر کے خود اس کی جگہ لے لیتا ہے، اور عارف کو تمام دنیا و ما فیہا سے بے خبر کر کے مشہودِ حقیقی کے اندر گم کر دیتا ہے ۔ یہ علم غیب کے تمام پردے

---

[1] مدارج السالکین جلد ۲ صفحہ ۲۴۳ ۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اٹھا دیتا ہے اور عارف تمام حقائق کا گویا برای العین مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

اس بحث پر تنقید کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ معرفت کی حقیقت اور اس کے مدارج پر شیخ الاسلام نے جو کچھ لکھا ہے اس کو بھی مختصراً ناظرین کے سامنے رکھ دیں تاکہ یہ بھی واضح ہو جائے کہ معرفت کا معیار صوفیائے کرام کے نزدیک کیا ہے؛

معرفت کی حقیقت

سب سے پہلے شیخ الاسلام نے معرفت کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ: المعرفة احاطة بعين الشيء كما هو (معرفت کسی شے کی حقیقت کا اس طرح احاطہ کر لینا ہے جیسی کہ فی الحقیقت وہ ہے۔)

اس کے بعد علم کی طرح معرفت کے بھی شیخ الاسلام نے تین درجے قرار دیے ہیں اور لوگوں کو تین طبقات۔ عوام، خواص اور اخص الخواص۔ میں تقسیم کرکے ہر طبقہ کی معرفت اس کے درجہ کے اعتبار سے الگ الگ بتائی ہے۔

معرفت کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ خدا کی جن صفات اور کرشموں کا مظاہرہ اس کی مخلوقات و مصنوعات میں ہو رہا ہے اور جن کا بیان نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے ہوا ہے۔ اُن کی معرفت حاصل ہو۔ یہ معرفت، عوام کی معرفت ہے۔

معرفت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ خدا کی ذات کی معرفت حاصل ہو، اس طرح کہ ذات اور صفات کے درمیان کوئی تفریق نہ واقع ہو۔ یہ خواص کی معرفت ہے۔

معرفت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ خدا خود اپنی معرفت کا نور عارف پر ڈال دے اور عارف کی معرفت اس نور میں گم ہو جائے، اس معرفت تک نہ استدلال کی رسائی ہے نہ اس تک کسی دلیل کی راہنمائی ہے اور نہ یہاں تک کسی وسیلہ کی پہنچ ہے۔ دل کا شاہدہ، علم کے حدود و قیود سے آزادی اور مقام جمع کا مطالعہ اس کی خصوصیات ہیں۔ یہ اخص الخواص کی معرفت ہے[1]۔

اب اس بحث کا جو خلاصہ نکلتا ہے اس کو بھی پیش نظر رکھ لیجیے۔

معرفت کی تعریف یہ ہے کہ کسی شے کی اصل حقیقت کا جیسی کہ وہ فی الواقع ہے، احاطہ

---

[1] معرفت کی یہ پوری بحث منازل السائرین سے ماخوذ ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر لیا جائے۔

خدا کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت جس کا ذریعہ انبیاء ہیں، یہ ابتدائی درجہ کی معرفت ہے، معرفت کا اونچا درجہ درحقیقت معرفت ذات کا درجہ ہے۔

حقیقی معرفت جو اخص الخواص کا حصہ ہے وہ عقل و استدلال اور دلیل و شہادت سے ایک بالکل ماوراء شے ہے۔ یہ معرفت جن کو حاصل ہو جاتی ہے وہ حقائق کو دلیل سے معلوم کرنے کی بجائے ان کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ وہ علم کے حدود و قیود سے بالاتر اور خود شہودِ حقیقی کے اندر گم ہو جاتے ہیں۔

فلاسفہ اور متکلمین کے نظریات پر تبصرہ

اب ہم ان مختلف رایوں پر مختصر اتبصرہ کر کے یہ دکھائیں گے کہ ان میں کتنا حصہ حق ہے اور کتنا حصہ محض بے حقیقت خیال آرائی پر مبنی ہے۔

فلاسفہ اور متکلمین میں سے، ہر ایک نے جیسا کہ آپ نے دیکھا، ایک دوسرے کے بالمقابل مسلک اختیار کیا ہے۔ ایک گروہ عقل کو اس قدر اچھالتا ہے کہ انسان کو بالکل آسمان پر پڑھا دیتا ہے اور دوسرا اس کو اس قدر گراتا ہے کہ وہ بالکل تحت الثریٰ میں پہنچ جاتا ہے۔ ایک عقل کی راہنمائی پر اس قدر اعتماد رکھتا ہے کہ انسان کو کسی مافوق عقل راہنمائی سے بالکل ہی بے نیاز اور مستغنی ثابت کر دیتا ہے، دوسرا عقل کو اس قدر ناقابلِ اعتماد ٹھہراتا ہے کہ انسان کو بالکل بے بصیرت اور اندھا بنا کے چھوڑ دیتا ہے۔ حالانکہ انصاف یہ ہے کہ عقل نہ تو اس غیر معمولی احترام و اعتماد ہی کی مستحق ہے جس کا مستحق اس کو فلاسفہ نے گردانا ہے اور نہ اس توہین و تحقیر ہی کی سزاوار ہے جس کی سزاوار اس غریب کو متکلمین نے ٹھہرایا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر سب سے بڑا انعام جو فرمایا ہے وہ یہی ہے کہ اس کو عقل عنایت کی ہے، لیکن یہ عقل ایسی چیز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لیے بالکل کافی ہو اور اس کے بعد انسان کسی مافوق عقل کی راہنمائی کا محتاج نہ رہے۔ عقل تمام خوبیوں کے باوجود اپنے اندر متعدد ایسی خامیاں بھی رکھتی ہے کہ اس کی راہنمائی نہ تو کامل ہو سکتی ہے، نہ بے خطا۔ اول تو یہ جن حواسوں سے کام لیتی ہے، ان کی رسائی ہی بہت محدود

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے ، اس وجہ سے بہت سے سوالات ،خصوصاً مابعد الطبیعی سوالات کے حل میں اس کے یہ وسائل و وسایط بالکل ہی ناکارہ ثابت ہو جاتے ہیں ، دوسرے وہ اپنے حواسوں کی فراہم کردہ معلومات سے جو کلیات ترتیب دیتی ہے اور پھر ان سے جو نتائج نکالتی ہے ان میں بھی وہ غلطیوں سے محفوظ نہیں ، علاوہ ازیں وہ اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی بھی کر سکتی ہے ، وہ پست ہمت بھی ہو سکتی ہے ۔ اور وہ مرعوب و خوف زدہ بھی ہو سکتی ہے اور اپنے نفسانی میلانات و رجحانات کے حق میں جانب دار بھی ہو سکتی ہے ، یہاں تک کہ تمام انسانوں کی عقلوں کو جمع کر کے ان سب کی راہنمائی پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا ، کیوں کہ انہی نقائص کی بنا پر ، جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم اختلاف تو ان کے نتائج فکر میں لازماً رونما ہو کے رہے گا۔

تاہم عقل سے وہ مایوسی اور بدگمانی بھی غلط ہے جس کا اظہار متکلمین نے کیا ہے ۔ عقل کی رسائی محدود ضرور ہے لیکن یہ سمجھ لینا کہ وہ مابعد الطبیعی سوالات کے حل کرنے اور اخلاقی اقدار کی جانچ پرکھ کے معاملہ میں بالکل ہی کوری ہے ، ایک سخت قسم کا مغالطہ بلکہ ایک کھلی ہوئی جہالت ہے ۔ عقل اپنی کوتاہیوں اور نارسائیوں کے باوجود ہماری رہنمائی بہت دور تک کر سکتی ہے ، وہ اس کائنات کے مطالعہ اور اس کے اندر جو نظم و حکمت ہے ، اس کے مشاہدہ سے نہ صرف ایک خالق کا بلکہ خالق کی بہت سی صفات کا بھی اندازہ کر سکتی ہے ۔ وہ خالق کی صفات سے خالق کی پسند اور ناپسند کے متعلق بھی ایک تصور قائم کر سکتی ہے ، وہ اس دنیا کے نظام اور اس کے سنن و قوانین کے مطالعہ سے ایک روز جزا و سزا کا بھی خیال کر سکتی ہے ، وہ انسانی فطرت کے اندر ودیعت کردہ اسلامی یقینیات سے خیر و شر کے اصول بھی متعین کر سکتی ہے ۔ وہ یہ ساری باتیں کر سکتی ہے ، البتہ اس طرح نہیں کر سکتی کہ اس کے کیے ہوئے کو بالکل کامل سمجھا جا سکے یا اس کی صحت و صداقت پر پورا بھروسہ کیا جا سکے ، بس یہ خرابی اس کے کام میں ایک ایسی خرابی ہے جس کے سبب سے راہنمائی کے معاملہ میں تنہا اسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا بالخصوص ایسے معاملات میں جن پر انسان کی حقیقی طمانیت و مسرت اور اس کی انفرادی و نوعی سعادت و کامرانی کا انحصار ہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فلاسفہ نے عقل پر جو اعتماد کیا ہے ، وہ بھی بالبداہت غلط ہے اور متکلمین نے اس کو جو بالکل خارج از بحث قرار دے دیا ہے وہ بھی صریحاً حقیقت کے بالکل خلاف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے، حق ان دونوں کے درمیان ہے۔

شیخ الاسلام کے نظریات پر تبصرہ

اب آئیے شیخ الاسلام کے نظریات کا تجزیہ کر کے دیکھیے کہ اس میں کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ ہم شیخ الاسلام[1] کے خیالات کے اس حصہ کو زیر بحث نہیں لائیں گے جس میں کسی پہلو سے اختلافِ رائے کی گنجائش ہو سکتی ہے بلکہ ان کی صرف انہی غلطیوں کا سامنے لائیں گے جو بالکل واضح ہیں اور جن کی کوئی توجیہہ دلائل کی روشنی میں ممکن نہیں ہے۔ ہمیں شیخ الاسلام کے نظریات پر مندرجہ ذیل اصولی اعتراضات ہیں:

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شیخ الاسلام نے شریعت کے علم کو کشف، مشاہدہ اور الہام کے ذریعہ سے حاصل ہونے والے علم کے مقابل میں حصولِ معرفت کے نقطۂ نظر سے فروتر ٹھہرایا ہے، حالاں کہ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ علمِ شریعت کی بنیاد وحی پر ہے اور وحی میں کسی وہم، کسی وسوسہ، کسی نفسانی خیال آرائی اور کسی شیطانی دراندازی کا کوئی امکان نہیں ہے کیوں کہ انبیاء بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جس علم کی بنیاد وجدان اور کشف و مشاہدہ یا الہام وغیرہ پر ہو اس میں ہر قسم کی شیطانی اور نفسانی مداخلت کا امکان ہوتا ہے کیوں کہ کسی بڑے سے بڑے عارف اور کسی بڑے سے بڑے صوفی کے متعلق بھی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ شیخ الاسلام نے علمِ لدنّی کے بارہ میں نہ صرف یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ فکر و استنباط سے بالاتر ہے بلکہ اس کو بجائے خود دلیل کی حیثیت دے ڈالی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی صحت و صداقت کسی دوسری دلیل کی تصدیق و تائید کی محتاج نہیں رہی جس طرح ایک نبی کو وحی کے ذریعہ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کی تصدیق و تائید کے لیے وہ کسی

---

[1] یہاں کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ یہ نظریات تنہا شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل ہروی ہی کے ہیں، ہم نے شیخ الاسلام کو تمام اکابر تصوف کے ایک قابلِ اعتماد نمائندہ کی حیثیت سے منتخب کیا ہے، جو نظریات شیخ الاسلام کے ہیں، کم و بیش وہی نظریات دوسرے اکابر تصوف کے بھی ہیں اور اگر کسی کے نظریات بنیادی طور پر شیخ الاسلام کے نظریات سے الگ ہیں تو اس کو تصوف کے زمرہ ہی سے الگ سمجھنا چاہیے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خارجی شہادت کا محتاج نہیں رہتا۔ اسی طرح ایک عارف بھی اپنے وجدان یا اپنے کشف یا مشاہدہ یا الہام کے ذریعہ سے جو علمِ لدنّی پاتا ہے اس کو کسی اور کسوٹی پر اس کو جانچنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ جیسا کہ شیخ الاسلام نے فرمایا ہے "اس کا وجود ہی اس کی سند ہے۔

ہمارے نزدیک شیخ الاسلام کی یہ بات دین میں ایک شدید قسم کا فتنہ ہے۔ علم کشفی ہو یا علم لدنّی اس کو بجائے خود دلیل تسلیم کر لینے کے معنی تو یہ ہوئے کہ عارفین کو انبیاء کا درجہ دے دیا جائے اور ان کے کشف و مشاہدہ اور ان کے الہام کو بالکل ہم پایۂ وحی بنا دیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ بات کسی شخص کے لیے اسلام پر قائم رہتے ہوئے تسلیم کرنا ناممکن ہے، کشف و الہام کے ذریعہ سے علم کے حصول کے ہم منکر نہیں ہیں لیکن یہ علم قابلِ قبول صرف اسی حالت میں ہونا چاہیے جب یہ شریعت کے مطابق ہو، اگر یہ شریعت کے خلاف ہو تو لازماً یہ شیطانی وسوسہ ہے اور اس کو قبول کر لینا دیدہ دانستہ اپنی باگ شیطان کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔

اگر اس کشفی یا الہامی علم کو اس درجہ اہمیت دے دی جائے کہ یہ کتاب و سنت کی طرح بجائے خود دلیل بن جائے تو اس سے جس طرح کے فتنے پیدا ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہم شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فیوض الحرمین سے ان کی ایک "تحقیق شریف" نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

تحقیق شریف:- الاولیاء کثیرا ما یلہمون بان اللہ تعالٰی اسقط عنہم التکلیف وانہ خیرہم فی الطاعات ان شاءوا فعلوھا وان لم یشاءوا لم یفعلوھا۔ حکی لی سیدی الوالد رضی اللہ تعالٰی عنہ عن نفسہ انہ الہم بھذا د

ایک نہایت اعلیٰ تحقیق یہ ہے کہ بہت سے اولیاء پر یہ الہام کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام شرعی احکام کی تعمیل سے بری کر دیا ہے اور ان کو طاعت و عبادت کے معاملہ میں اختیار دے دیا ہے کہ وہ چاہیں تو کریں اور اگر نہ چاہیں تو نہ کریں۔ مجھ سے میرے والد ماجد نے خود اپنے بارہ میں یہ بیان فرمایا کہ خود ان کو بھی اسی طرح کا الہام ہوا تھا لیکن انھوں نے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انه دعا الله تعالى ان يقيم عليه التكليف وما اختار الا التمس ولم يكن من مذهبه سقوط التكليف عن احد من خلق الله مادام عاقلا بالغا فرأيته يرى الالهام حقا ويرى مذهبه حقا ويتحير في التطبيق واخبرت عن سيدي العم قدس سره انه كان يخبر عن نفسه انه الهم بسقوط التكليف وقيل له ان عبدت طمعا في الجنة فانا وعدناك ان ندخلك اياها وان عبدت طلبا لرضانا فقد رضينا عنك رضا لا سخط بعده فقال ربي انما اعبدك لا لشيء دونك ـ وكان قدس سره يميل الى ان الكمل يسقط عنهم التكليف والله سبحانه هو الذي يقيم عليهم النواميس من غير اختيارهم هكذا ادري

اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ وہ ان کے اوپر شرعی ذمہ داریوں کو قائم رکھے اور انہوں نے قوانین واحکام کی پابندی ہی کو اختیار کیا، ان کا مسلک یہ نہیں تھا کہ کوئی عاقل و بالغ شرعی ذمہ داریوں سے بری قرار دیا جاسکتا ہے لیکن میں نے ان کو دیکھا کہ وہ اپنے الہام کو بھی حق سمجھتے ہیں اور اپنے مسلک کو بھی حق سمجھتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان تطبیق دینے میں ان کو کچھ حیرانی سی پیش آرہی ہے۔

مجھے میرے عم بزرگوار کی نسبت بھی یہ معلوم ہوا کہ وہ بھی اپنی بابت یہ فرماتے تھے کہ ان کو بھی ذمہ داریوں سے بریت کا الہام ہوا تھا۔ ان کو غیب سے کہا گیا تھا کہ اگر تم کو جہنم سے پناہ دی اور اگر تم جنت کی آرزو میں ہماری عبادت کرتے تھے تو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تم کو اس میں ضرور داخل کریں گے۔ اور اگر تم ہماری خوشنودی کی طلب میں ہماری عبادت کرتے تھے تو ہم تم سے ایسے راضی ہوئے کہ اب اس کے بعد کبھی ناخوش نہ ہوں گے، تو انہوں نے کہا کہ اے رب! میں تیری عبادت محض تیرے لیے کرتا ہوں کسی اور غرض کے لیے نہیں کرتا ہوں۔ عم بزرگوار کا میلان اس بات کی طرف تھا کہ کاملین سے شرعی ذمہ داریاں ساقط کر دی جاتی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عن كثير من اولياء الله تعالى .	ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ خود ہی ان کے اوپر ان کے اختیار کے بغیر شرعی قوانین کو جاری رکھتا ہے اور اسی قسم کی روایت دوسرے بہت سے اولیاء اور کاملین سے ہے ۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک اس قسم کے الہامات کو رحمانی سمجھنے کا تعلق ہے شاہ صاحب کے والد بزرگوار اور عم بزرگوار دونوں حضرات ایک ہی رائے رکھتے تھے ، البتہ ان دونوں بزرگوں کی رائیں اس بارہ میں مختلف تھیں کہ شرعی ذمہ داریوں سے کوئی شخص بری کیا جا سکتا ہے یا نہیں ؟ شاہ صاحب کے والد ماجد کا مذہب یہ تھا کہ شرعی ذمہ داریوں سے کوئی شخص بھی بری نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن ان کے عم بزرگوار کا مذہب یہ تھا کہ کاملین شرعی ذمہ داریوں سے بری تو کر دیے جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے اختیار کے بغیر ہی ان کو تمام شرعی تکالیف کا پابند بنائے رکھتا ہے ۔

خود شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس بارہ میں اپنے عم بزرگوار کے مسلک کے مؤید معلوم ہوتے ہیں چنانچہ انہوں نے اپنے عم بزرگوار کا مذکورہ بالا مسلک نقل کرنے کے بعد اس کا فلسفہ بھی مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے ۔[۱]

والسر فى ذالك عندى	میرے نزدیک اس کے اندر رمز یہ ہے کہ
ان الانسان اذا انتقل عن	آدمی جب ان شرعی احکام پر ایمان غائبانہ
الايمان بالغيب بهذا النواميس	کے درجہ سے ترقی کر کے ایمان شہادت
الى الايمان بها على بينة	(ایمان علی بینہ) کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے
ووجد هذا العبادات و	اور ان عبادات و احکام کی طلب اپنے اندر
النواميس فى نفسه مثل	اسی طرح محسوس کرنے لگتا ہے ، جس طرح
الجوع والعطش مما لا	بھوک اور پیاس کو محسوس کرتا ہے جن کو چھوڑنے
يقدر على تركه فلا معنى	پر وہ قادر نہیں رہتا تو پھر ان چیزوں کا اس

[۱] یہ عبارات فیوض الحرمین صفحہ ۲۳ ، ۲۴ سے نقل کی گئی ہیں ۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لتعلق التكليف بها لانها	کو مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں
من الجبلة التی جبل	کیوں کہ یہ چیزیں تو اب اس کی جبلت بن
علیها۔	چکی ہیں، جن پر وہ پیدا ہوا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف یہ کہ اس قسم کے الہامات کو اپنے والد ماجد اور عمِ بزرگوار کی طرح رحمانی سمجھتے ہیں جیسا کہ ان کا ارشاد ہے: والحق عندی ان الالهام کلّه حق۔[1] بلکہ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ کاملین جن کو ایمان بالغیب کی جگہ ایمان بالشہادۃ کا مقام حاصل ہو جاتا ہے وہ شرعی تکالیف سے بری کر دیے جاتے ہیں کیونکہ شرعی تکالیف ان کے لیے بالکل اضطراری نوعیت کی چیز بن جاتی ہیں، جن سے انحراف ان کے لیے ممکن ہی نہیں رہ جاتا، جس طرح وہ طبعی قوانین کی مجبورانہ اطاعت کرتے ہیں اور جس طرح وہ بے بس ہو کر جبلی تقاضوں کی تعمیل کرتے ہیں اسی طرح وہ شرعی احکام کی بھی تعمیل بالکل بے بس ہو کر کرتے ہیں اس وجہ سے ان کو شرعی تکلیف کا مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد سے متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں، جن میں سے بعض کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب اس دلیل کی بنا پر کہ ان کاملین کے لیے شرعی احکام وقوانین جبلی تقاضوں کی حیثیت حاصل کرتے ہیں یہ کہا جا سکتا کہ ان کو شرعی احکام کا مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں تو بعینہٖ اسی دلیل کی بنا پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ جب یہ کاملین ان شرعی احکام کی تعمیل پر جبلی طور پر مجبور ہیں تو ان کی ذمہ داریوں سے ان کو بری قرار دینے کے بھی کوئی معنی نہیں، کیوں کہ کسی چیز سے بری قرار دینے کا سوال تو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اختیار موجود ہو، جب اختیار ہی سلب ہو چکا تو بری قرار دینا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کو معذورین ومجبورین کے زمرہ میں شمار کیے جانے کے سبب سے غیر مکلف سمجھ لیا جائے۔ لیکن یہ مرتبہ اسلامی شریعت میں کاملین کا نہیں بلکہ نابالغوں اور مجانین کا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام عذاب وثواب اختیاری اعمال

---

[1] یہ عبارت فیوض الحرمین صفحہ ۲۳، ۲۴ سے نقل کی گئی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر مرتب ہوتا ہے تو جب یہ اعمال ان کاملین کے لیے اختیاری باقی نہیں رہے تو ان پر ان کو اجر و ثواب کس بات کا ملے گا؟

تیسری بات یہ ہے کہ انبیائے کرام کا ایمان قرآن کی تصریح کے مطابق علیٰ بینہ ہوتا ہے چنانچہ حضرت نوحؑ فرماتے ہیں:

إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ (۲۸ ہود) اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک بینہ پر ہوں۔

حضرت صالحؑ فرماتے ہیں:

إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ (۶۳۔ ہود)

حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ (۸۸۔ ہود)

لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی کے متعلق بھی کوئی ادنیٰ اشارہ ہمیں اس بات کا نہیں ملتا کہ ان کو کبھی اس بات کا الہام ہوا ہو کہ ان کو شرعی تکالیف سے بری قرار دے دیا گیا بلکہ اس کے برعکس ان کو برابر یہی تاکید ہوتی رہی کہ جو کچھ تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اس پر برابر جمے رہو اور سرمو اس سے تجاوز نہ کرنا۔ حالاں کہ شرعی تکالیف اگر کسی کے لیے جبلّی چیزیں بن سکتی ہیں تو سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام ہی ہو سکتے ہیں لیکن جب وہ آخر دم تک مکلف رہے اور دوسروں سے زیادہ مکلف رہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔

ہمارے نزدیک اس طرح کا الہام یا کشف کاملین کو تو ہو سکتا ہے، لیکن ہم ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یہ الہام یا کشف رحمانی بھی ہو سکتا ہے۔ رحمانی کشف اور رحمانی لقا ہمیشہ بندہ کو صحیح سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ بندہ کو فتنہ میں نہیں ڈالتا فتنہ میں ڈالنا شیطان کا کام ہے۔ یہ کام رحمان کا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے ہزاروں نبیوں اور رسولوں پر وحی نازل فرمائی لیکن یہ وحی ہمیشہ شرعی ذمہ داریوں کے اٹھانے کی تاکید کے ساتھ نازل ہوئی، نبی کے لیے بھی اور اس کی امت کے لیے بھی، ہم کو انبیاء کے پورے گروہ میں سے کسی کے بارہ میں بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کو ایک مرتبہ بھی وحی یا کشف کے ذریعہ سے یہ بتایا گیا ہو کہ اب وہ شرعی فرائض اور ذمہ داریوں سے بری کر دیے گئے ہیں، اگر انبیاء کرام

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی زندگیوں میں اس طرح کی کوئی چیز ملتی ہے تو اس کی نوعیت یا تو شیطانی وسوسہ کی ہے جس سے انہوں نے اللہ کی پناہ مانگی ہے یا پھر انسانی واہمہ کی ہے جس کی انہوں نے اصلاح فرمائی ہے مثلاً ایک مرتبہ بعض لوگوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہؐ! جب آپؐ کے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیے گئے تو آپؐ نوافل میں اس قدر مشقت کیوں اُٹھاتے ہیں آپؐ نے فرمایا:

افلا اکون عبدا شکورا — کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں

اگر کاملیت کا انعام اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہوتا کہ کامل کو شرعی تکالیف ہی سے بری قرار دے دیا جاتا تو سب سے بڑھ کر کامل اور اکمل تو حضور خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی، لیکن قرآن کی کسی آیت یا آپؐ کی حدیث سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپؐ کو زندگی کے کسی دور میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی اس بات کے لیے ہوا ہو کہ آپؐ کو شرعی ذمہ داریوں سے کسی پہلو سے بھی سبکدوش کیا گیا ہے، بلکہ اس کے بالکل برعکس کمالِ عبدیت میں آپؐ جتنے ہی آگے بڑھتے گئے شرعی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اسی قدر بڑھتا گیا۔

ہم یہاں چند آیتیں ایسی نقل کرتے ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کی زندگی کے آخری دور میں خصوصیت کے ساتھ اللہ کی بندگی میں زیادہ سے زیادہ سرگرم رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے،

سورۂ الم نشرح میں ارشاد ہوتا ہے:

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ — پس جب تم فارغ ہو جاؤ، اپنے رب کی بندگی میں کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب کی طرف جھک پڑو۔

جس سورہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تاویل کے مطابق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قربِ وفات کی پیشین گوئی ہے عین اسی سورہ میں آپؐ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ — جب اللہ کی مدد اور فتح آ گئی اور تم دیکھ لو

وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ — کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝

رہے ہیں تو اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو، بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

ایک جگہ صاف صاف یہ ہدایت ہے کہ اپنے رب کی بندگی پر جمے رہو، یہاں تک کہ موت آجائے:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ

اور اپنے رب کی بندگی کرتے رہو، یہاں تک کہ موت آجائے۔

تمام اہل تاویل کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں یقین سے مراد موت ہے بہرحال اس قسم کا القا خدا کی طرف سے تو ہو نہیں سکتا، اگر ہو سکتا ہے، تو شیطان کی طرف سے ہو سکتا ہے وہ بلاشبہ کاملین کو اس مغالطہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ آخرت کی فلاح و کامیابی کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے انہوں نے کر لیا۔ اب مزید کچھ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، اس کوشش میں اگر اس کو کچھ زیادہ کامیابی بالفرض نہ بھی ہو، صرف اتنی ہی کامیابی ہو جائے کہ کوئی خدا کا بندہ اپنے عمل کو زیادہ اہمیت ہی دینے لگ جائے تو یہ بھی اس شخص کی آخرت کی بربادی اور شیطان کی بہت بڑی کامیابی ہے اور اہل تقویٰ اس فتنہ میں اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں اور اگر شیطان کے اسی وسوسہ کو کوئی بزرگ اپنی سادہ لوحی سے سچ مچ القاء رحمانی ہی سمجھ بیٹھیں اور اس کی تعمیل میں تمام شرعی تکالیف سے چھٹکارا بھی حاصل کر لیں، تب تو سمجھیے کہ شیطان کو سو فی صدی کامیابی حاصل ہوئی۔ ہمارے نزدیک اس قسم کے الہامی اور کشفی علوم کو بجائے خود دلیل اور معیار قرار دینے کا یہ لازمی نتیجہ ہے جس سے کسی طرح بھی بچا نہیں جا سکتا اسی چیز سے ہزارہا بدعات پیدا ہوئی ہیں اور اگر اس کا دروازہ کھلا رہے تو اس سے ہزارہا بدعات آئندہ پیدا ہو سکتی ہیں۔ بہت سے مبتدع صوفیوں نے اسی قسم کے غیبی اشارات کو آڑ بنا کر اپنے آپ کو شرعی ذمہ داریوں سے بری قرار دے لیا۔ جس کے سبب سے وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور اپنے پیچھے چلنے والوں کو بھی انہوں نے گمراہ کیا، اس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ اس علمِ لدنی کے متعلق شیخ الاسلام نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

لیس بینہٗ و بین الغیب حجاب ۔	اس کے درمیان اور غیب کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہ جاتا۔

جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ جس کو علمِ لدنی حاصل ہو اس کے لیے غیب کے تمام پردے اٹھا دیے جاتے ہیں۔ یہ بات ہمارے نزدیک بالبداہت قرآن کے خلاف ہے۔ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے، اس کے سوا نہ کسی انسان کو حاصل ہے نہ کسی فرشتہ کو، نہ کسی نبی کو، نہ کسی ولی کو، خدا کے نزدیک سب سے زیادہ اونچا مرتبہ نبیوں اور فرشتوں کا ہے، لیکن قرآن مجید میں تصریح ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ سے نہ براہِ راست خطاب کر سکتے ہیں نہ غیب سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ اگر ان سے خطاب کرتا ہے تو یا تو وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی اوٹ سے یہ نہیں ہوتا کہ ان کے لیے سارے حجابات اُٹھا دیے جاتے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ (۵۱ - زخرف)	اور کسی انسان کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے بات کرے، مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی آڑ میں یا اس کے پاس وہ اپنا کوئی فرستادہ (فرشتہ) بھیجتا ہے جو اس کے حکم سے اس کی طرف وحی کر دیتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اللہ بہت بلند اور حکمت والا ہے۔

اسی طرح یہ بھی اللہ ہی کے اختیار میں ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے بندوں کی مصلحت کے لیے کسی نبی یا رسول کو اپنے غیب کی باتوں میں سے کچھ باتوں سے باخبر کر دے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰي غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ	وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب سے کسی کو باخبر نہیں کرتا ہاں اگر کسی رسول کو منتخب کرے تو اس کے آگے اور پیچھے اپنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتب

www.KitaboSunnat.com

مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ رَصَدًا۔ پہرہ دار مقرر کرتا ہے؛

انبیاء کی دعوت کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب کی دعوت دیتے ہیں، وہ بلاتے ہی انہی لوگوں کو ہیں جو عقل و استدلال سے کام لینے، آفاق و انفس میں خدا کی جو نشانیاں ہیں، ان پر غور کرنے اور ان کے نتائج کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں، وہ ان لوگوں کو اپنی دعوت کے لیے بالکل بیکار سمجھتے ہیں جو تفکر و تدبر کی بجائے ہر حقیقت کے مشاہدہ و معائنہ کے طالب ہوں، جو لوگ غیب کا مشاہدہ کر لینے کے بعد اللہ کو ماننے اور اس سے ڈرنے کے لیے تیار ہیں، قرآن میں ایک جگہ بھی ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے، نہ صرف یہ کہ ایسے لوگوں کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس دنیا میں مشاہدۂ غیب کو حکمتِ الٰہی کے بالکل خلاف اور اس قسم کے ایمان کو بالکل غیر معتبر قرار دیا گیا ہے۔ اس دنیا میں اصلی آزمائش ہی یہی ہے کہ آدمی مشاہدۂ غیب کے بغیر محض عقل و فطرت کی شہادت اور انبیاء کی گواہی کی بنا پر حق کو مانے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جان و مال کی قربانیاں دے۔ اگر فی الواقع کوئی ایسا علم ہے جو غیب کے پردوں کو اٹھا دیتا ہے اور اس دنیا میں وہ انسانوں کو حاصل بھی ہو سکتا ہے تو اس کے پانے کے سب سے زیادہ مستحق حضراتِ انبیائے کرام ہی ہو سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی اس علم سے آگاہ نہیں کیا حالانکہ ان کی قوموں کی طرف سے برابر یہ مطالبہ رہا کہ وہ ایمان لانے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ان کو غیب کا مشاہدہ کرا دیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ جواب ملا کہ اس دنیا میں غیب کا مشاہدہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے، پھر کس طرح ممکن ہے کہ جو چیز انبیاء کو نہیں عطا کی گئی اور جس کا دیا جانا حکمتِ الٰہی کے خلاف قرار دیا گیا، وہ صوفیوں کو حاصل ہو گئی؟

یہاں اس قصہ سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو جو سورۂ کہف میں حضرت موسیٰؑ اور خضر کا بیان ہوا ہے۔ خضر کو جو علم عطا ہوا تھا اس کے متعلق قرآن میں اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ اس علم نے ان کے لیے غیب کے تمام پردے اٹھا دیے تھے۔ اس سے زیادہ جو کچھ نکلتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند معاملات میں خضر کو اپنی مشیت کی تنفیذ کا واسطہ بنایا تھا اور ان کے اوپر ان معاملات کی حکمت بھی کھول دی تھی جہاں تک حضرت موسیٰؑ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا تعلق ہے انہوں نے خضر کی باتیں جو گوارا کیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو وحی کے ذریعہ سے یہ ہدایت ہوئی تھی کہ وہ ان کے پاس ایک خاص امر کی تعلیم کے لیے جائیں ان کا خدا کی طرف سے خضر کے پاس جانا خود اس بات کی دلیل تھا کہ خضر خدا کے خاص بندے ہیں۔ ان کا علم قابلِ اعتماد ہے اور ان کا عمل خدا کے حکم کے خلاف نہیں ہو سکتا، چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے خضر کی وہ باتیں جو ان کی نگاہ میں حق کے خلاف نظر آئیں محض اس وجہ سے گوارا کیں کہ ان کو وحی کے ذریعہ سے خضر کے اوپر اعتماد کرنے کی ہدایت ہوئی تھی اگر وحی کے ذریعے سے ان کو خضر پر اعتماد کرنے کی ہدایت نہ ہوتی تو یقیناً حضرت موسیٰ خضر کے ایک فعل کو بھی برداشت نہ کرتے۔ خود خضر نے بھی آخر میں حضرتِ موسیٰ کو یہی اطمینان دلایا کہ مَا فَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِیْ کہ یہ جو کچھ میں نے کیا ہے خدا کے حکم سے کیا ہے، اپنے جی سے نہیں کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خضر نے چند کام حضرت موسیٰؑ کے سامنے ان کو اس بات کی تعلیم دینے کے لیے کیے کہ خدا کے کام اگرچہ بظاہر کتنے ہی بے حکمت نظر آئیں لیکن ان کے اندر نہایت گہری حکمت ہوتی ہے جس کو صرف خدا ہی جانتا ہے اور یہ کام انہوں نے براہِ راست خدا کے احکام کے تحت اسی طرح انجام دیے جس طرح فرشتے اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ اپنی مشیت کی تنفیذ کا واسطہ جس طرح فرشتوں کو بناتا ہے، اسی طرح کسی انسان کو بھی اگر اس نے کسی مصلحت کے تحت کسی وقت بنایا تو اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ لیکن اس چیز کو آڑ بنا کر کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کوئی اقدام شریعت کے خلاف کر ڈالے اور جب اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس کا یہ فعل شریعت کے خلاف ہے تو وہ یہ جواب دے کہ میں نے تو یہ براہِ راست خدا کے حکم کے تحت اس کی مشیت کی تنفیذ کی ہے کیوں کہ دوسروں کے پاس اس کے صدق و کذب کے جانچنے کا ذریعہ وحی الٰہی ہی ہے اور وحی الٰہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منقطع ہو چکی ہے۔ اب حق و باطل کی کسوٹی قرآن و سنت ہے، اگر کسی شخص کا فعل کتاب و سنت کے خلاف ہو تو وہ اس عذر پر کتاب و سنت کی گرفت سے نہیں بچ سکتا کہ اس نے یہ جو کچھ بھی کہا یا کیا ہے علمِ لدنی کی رہنمائی کے تحت کیا ہے اور یہ علم بجائے خود دلیل ہے، اس کو کسی اور کسوٹی پر جانچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴ شیخ الاسلام نے معرفت کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ:

المعرفة احاطة بعين الشئ كما هو — معرفت یہ ہے کہ کسی شے کی حقیقت کا جیسی کہ وہ ہے، احاطہ کر لیا جائے۔

معرفت کی اس تعریف کی رو سے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی بھی معرفت نہیں حاصل کی جا سکتی چہ جائیکہ خدا کی ذات اور اس کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت حاصل ہو سکے اس طرح معرفت ہم اس ہوا کی بھی حاصل نہیں کر سکتے جس کے اندر ہم ہر وقت سانس لیتے ہیں، اس پانی کی بھی نہیں کر سکتے جس کو پیتے ہیں، اُس سورج کی بھی نہیں کر سکتے جس کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھ سکتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اس طرح کی معرفت اگر ہم خود اپنے وجود کی بھی حاصل کرنا چاہیں تو یہ ہمارے لیے محال ہے اگرچہ ہمارے وجود سے زیادہ ہم سے قریب تر شے کوئی بھی نہیں ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اس طرح کی معرفت ہم زمین پر رینگنے والی کسی ننھی سی چیونٹی کی بھی حاصل نہیں کر سکتے پھر غور کیجیے کہ انسان جب اپنے گردوپیش کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بھی کماحقہٗ معرفت حاصل نہیں کر سکتا تو اُس کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہے جو ہمارے خیال و گمان اور قیاس و وہم سب سے بالاتر ہے

ع

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

۵ معرفت کی اس تعریف کے بعد ستم یہ ہے کہ خدا کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت کو بالکل ابتدائی درجہ کی چیز بتایا گیا ہے، معرفت کا دوسرا درجہ جو خواص کا حصہ ہے، ان حضرات کے نزدیک معرفتِ ذات سے شروع ہوتا ہے، حالاں کہ انسان خدا کی ذات کی کماحقہٗ معرفت تو درکنار اس کا سرے سے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ خدا کی صفات مثلاً سمع، بصر، علم، قدرت وغیرہ کا تصور تو انسان کچھ کر سکتا ہے (اگرچہ وہ کتنا ہی ناقص ہو) کیوں کہ ان صفات کی ایک جھلک وہ اپنے اندر بھی پاتا ہے، لیکن خدا کی ذات کا تصور کرنے کے لیے تو اس کے تمام ذخیرہ معلومات میں سرے سے کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے جس قدر بھی بحث کی ہے خدا کی صفات، اس کے افعال اور اس کے قوانین و سنن سے کی ہے۔ اس کی ذات سے کوئی بحث نہیں کی ہے اور اس بات کی صاف تصریح کر دی ہے کہ اس دنیا میں انسان خدا کی ذات

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی تجلی کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ احادیث میں خدا کی ذات کے سوال پر غور کرنے کی بھی ممانعت کی گئی ہے کیوں کہ اس سوال پر غور کرنے کے لیے انسان کے پاس سرے سے کوئی ذریعہ ہے ہی نہیں۔ اگر وہ اس سوال پر غور کرے گا تو حیرانی و درماندگی کے سوا اس کو کچھ حاصل نہیں ہوگا اور حیرانی و درماندگی بجائے اس کے کہ انسان کو کچھ دے اس سے وہ کچھ بھی چھین لیتی ہے جو اس کے پاس پہلے سے ہوتا ہے، چنانچہ اس بات کا تو حضرات صوفیائے کرام کو بھی اقرار ہے کہ جس کو تجلیٔ ذات کا مشاہدہ ہو جاتا ہے وہ بسا اوقات فرائض و واجبات بھی چھوڑ بیٹھتا ہے[۱]۔

ہمارے نزدیک تجلیٔ ذات اوّل تو جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کسی کو حاصل نہیں ہوتی لیکن اگر کوئی شخص اس کے درپے ہو تو وہ کچھ پانے کے بجائے الٹے وہ بھی کھو آتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے۔

۴ معرفت کا تیسرا درجہ جس کو اخص الخواص کا حصہ قرار دیا گیا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ خالص وحدت الوجود کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کو علم کے حدود و قیود سے بالکل بالاتر کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ علم سے مراد علمِ شریعت ہے جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ علمِ شریعت نہ تو اس معرفت کا وسیلہ و ذریعہ ہی ہو سکتا ہے اور نہ وہ اس معرفت پر کوئی حکم ہی لگا سکتا ہے کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ ان حضرات کے نزدیک، عارف ایک صاحبِ حال ہے اور ایک صاحبِ حال نے کشف اور مشاہدہ سے جو کچھ حاصل کیا ہے اس پر مجرد ایک صاحبِ قال کو کوئی حکم لگانے کا حق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نظریہ بنیادی طور پر شریعت کے خلاف ہے۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارہ میں انسان کو اپنے جی سے کچھ کہنے کا حق نہیں دیا ہے بلکہ صاف صاف فرمایا ہے کہ اپنی ذات و صفات کو اللہ تعالیٰ خود ہی جانتا ہے انسان اس کو اپنے محدود ذرائع علم سے کما حقہٗ نہیں جان سکتا، اس وجہ سے اس کو چاہئیے کہ وہ اپنے ظن و گمان اور اپنے کشف و مشاہدہ کی بنا پر خدا کے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے اللہ کی وحی کو رہنما بنائے اور اس کے بارہ میں وہی کچھ بتائے جو خود اس نے اپنے متعلق بتایا ہے۔

---

[۱] مدارج السالکین ص ۸۷ ج ۲۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

پس تم اپنے جی سے اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو، اپنے آپ کو اللہ ہی جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔

اگر کوئی شخص خدا کے بارہ میں کوئی ایسا تصور پیش کرتا ہے جو خود خدا کے پیش کردہ تصور سے مختلف ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ اس کو اپنے کشف یا مشاہدہ کے ذریعہ سے خدا کی یہی معرفت حاصل ہوئی ہے تو لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ یہ شخص یا تو کسی وہم میں مبتلا ہے یا غلط بیانی کر رہا ہے۔

خدا کی معرفت کے بارہ میں صحیح مسلک

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ خدا کی معرفت سے متعلق فلاسفہ، متکلمین اور اربابِ تصوّف نے جو نقطہ ہائے نظر پیش کیے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے اندر کچھ نہ کچھ خلا ہے، اب ہم مختصراً بتائیں گے کہ خدا کی معرفت کا بالکل صحیح اور قابلِ اطمینان ذریعہ کیا ہے؟

ہمارے نزدیک خدائی معرفت کا صحیح اور قابلِ اطمینان ذریعہ انبیا علیہم السلام ہیں لیکن ہمارے اس کہنے کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ عقل و فطرت کو وجدان اور کشف کو معرفت الٰہی میں سرے سے کوئی دخل ہی نہیں ہے کہ ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ عقل یا کشف وغیرہ کے ذریعہ سے جو معرفت حاصل ہوتی ہے اس میں غلطی اور وہم کے امکانات ہیں اور انبیاء کا طریقہ غلطی اور وہم کے تمام امکانات سے محفوظ ہے، انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کی بنیاد جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے عقل اور فطرت ہی پر ہے اور اس کے اندر وجدان اور کشف کو بھی دخل ہے، لیکن ان کے طریقہ میں چونکہ عقل یا وجدان تنہا کام نہیں کرتے بلکہ وحی الٰہی کی راہنمائی بھی ان کی مدد کرتی ہے۔ اس وجہ سے اس طریقہ میں اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ انسان کسی غلطی یا گمراہی میں مبتلا ہو سکے۔

انبیاء علیہم السلام کو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، وحی کے ذریعہ سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ وحی کے ذریعے سے حاصل ہونے والے اس علم کو قرآن کی اصطلاح میں "العلم"

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہا گیا ہے۔ "العلم" یعنی علمِ حقیقی، جو تمام علوم کا سرچشمہ ہے، جو انسان کے لیے حقیقی صلاح و فلاح کی راہ کھولتا ہے، جو اس کے قلب اور اس کی روح کو سچی طمانیت اور سکینت بخشتا ہے، جو اس کی دنیا کو بھی سنوارتا ہے اور اس کی آخرت کو بھی روشن کرتا ہے، جو ہر قسم کے اختلاط و التباس اور ہر قسم کے شبہ سے بالاتر ہے جس میں کسی قسم کے وہم یا وسوسہ کی کسی آمیزش کا اندیشہ نہیں ہے، جو ہر قسم کی شیطانی دخل اندازی سے بالکل محفوظ ہے، جس کو دینے والا خدا ہے، جس کو لانے والے جبریل امین ہیں اور جس کو دنیا میں پھیلانے والے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جس کو دنیا میں اتارتے وقت اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی دونوں جگہ اس امر کا اہتمام فرمایا کہ نہ شیاطین الجن[1] اس کے قریب پھٹک سکیں اور نہ شیاطین الانس اس کے اندر کوئی خرابی پیدا کر سکیں[2] جس کی عظمت اور پاکیزگی اور جس کے محافظین و حاملین کے صدق و

---

[1] نزولِ وحی کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے وحی کو ہر قسم کی شیطانی دسترس سے محفوظ کر دینے کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ آسمان کے اندر شیطانوں کی آمد و شد بند کر دی اور اس کو روکنے کے لیے نہایت مضبوط قسم کا پہرہ لگا دیا۔ سورہ جن میں اس کا ذکر خود جنوں کی زبان سے یوں ہوا ہے۔

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا	اور ہم نے آسمان کا جائزہ لیا تو ہم نے پایا
مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا	کہ اس کو سخت قسم کے پہرہ داروں، اور شہاب
وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ	ثاقب سے بھر دیا گیا ہے اور ہم اس میں استراق
لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ	سمع کے لیے گھات کی جگہوں پر بیٹھا کرتے
يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝	تھے لیکن اب جو استراق سمع کے لیے گھات
(۱۰-جن)	لگائے گا تو وہ ایک شہاب ثاقب کو اپنی
	گھات میں پائے گا۔

[2] اسی طرح شیاطین الانس اللہ کے اتارے ہوئے علم اور اس کے دین میں جو گھپلا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کو روکنے کا بھی اس نے انتظام فرمایا۔

فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ	پس اللہ مٹا دیتا ہے اس چیز کو جو شیطان ملانے
ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ	کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اللہ (باقی بر صفحہ ۷۹)

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وفا کی شہادت خود ان کے آتارنے والے نے ان الفاظ میں دی ہے :

فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ	گرامی صحیفوں میں بلند اور پاکیزہ ،
مُّطَهَّرَةٍ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ کِرَامٍ	باوقار اور باوفا منشیوں کے
بَرَرَةٍ ؕ (۱۳-۱۶ عبس)	ہاتھوں میں ۔

جس کی معنوی قدر و قیمت کی شہادت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دی :

ان هذا القرآن حبل الله	یہی قرآن اللہ کی رسی ہے ، یہی نورِ مبین ہے
وهو النور المبين و الشفاء	اور شفاء نافع ہے ، یہی اس کی پناہ ہے
النافع وعصمة من تمسك	جو اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے اور اس
به و نجاة من تبعه	شخص کے لیے وسیلۂ نجات ہے جو اس
	کی پیروی کرے ۔

جس کے بارہ میں حضرت علیؓ نے جو تمام اربابِ تصوف کے نزدیک سب سے بڑے عارف ہیں ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کی ہے :

قال اما انی سمعت رسول	فرمایا یاد رکھو میں نے رسول اللہ صلی اللہ
الله صلى الله عليه وسلم	علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہے کہ آپ نے فرمایا
يقول الا انها تكون فتنة	عنقریب ایک بڑا فتنہ سر اٹھائے گا ، میں
قلت فما المخرج منها يا	نے عرض کیا ، اس سے نجات کیا چیز دلائے
رسول الله ، قال كتاب الله	گی ؟ یا رسول اللہ ! آپ نے فرمایا ، اللہ
فيه نباء ما قبلكم و خبر	کی کتاب ، اس میں تمہارے اگلوں کی سرگزشت
ما بعدكم وحكم ما بينكم	ہے جو کچھ بعد میں آنے والا ہے اس کی خبر

(بقیہ صفحہ ۷۸)

عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ	اپنی آیتوں کو مستحکم کرتا ہے اور اللہ علم والا
(۵۲ - حج)	اور حکمت والا ہے ۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وهو الفصل ليس بالهزل	ہے اور جو کچھ تمہارے درمیان پیدا ہوگا، اس کا
من ترکه من جبار قصمه	فیصلہ ہے اور یہ ایک دوٹوک بات ہے،
الله و من ابتغى الهدى فى	کوئی ہنسی، دل لگی نہیں ہے، جو سرکش اس کو
غيره اضله الله وهو حبل	چھوڑ دے گا اللہ اس کی پشت کی ہڈی توڑ
الله المتين وهو الذكر	دے گا، جو اس کے سوا کوئی اور مرجع ہدایت
الحكيم، وهو الصراط	بنائے گا، اللہ اس کو گمراہ کر دے گا، خدا کی
المستقيم، وهو الذى لا	مضبوط رسی یہی ہے، حکمت سے بھری ہوئی
تزيغ به الاهواء ولا تلتبس	کتاب یہی ہے، خدا کی کھولی ہوئی سیدھی راہ
به الالسنة ولا تشبع منه	یہی ہے، اس کے ہوتے ہوئے خواہشیں نہیں
العلماء ولا يخلق على كثرة	گمراہ کرتیں اور زبانیں نہیں لڑکھڑاتیں، علماء
الرد ولا تنقضى عجائبه	اس سے کبھی نہیں آسودہ ہوتے، کتنی ہی پڑھو
وهو الذى لم تنته الجن	اس سے سیری نہ ہوگی، اس کے عجائب حکمت
اذا سمعته حتى قالوا انا	کبھی ختم نہیں ہوں گے، اس کے سنتے ہی
سمعنا قرانا عجبا يهدى	جنات پکار اٹھے ہم نے عجیب وغریب
الى الرشد فأمنا به من	قرآن سنا ہے جو ہدایت کی طرف بلاتا ہے
قال به صدق ومن عمل	تو ہم اس پر ایمان لائے، جس نے اس کی
به اجر ومن حكم به	سند پر کہا، سچ کہا، جس نے اس پر عمل کیا
عدل ومن دعا اليه هدى	اجر پائے گا، جس نے اس کی مدد سے فیصلہ
الى صراط مستقيم۔	کیا اس نے عدل کیا، جس نے اس کی طرف
(ترمذی)	دعوت دی اس نے صراطِ مستقیم کی دعوت

دی۔

یہی علم ہے جس کے بارے میں ہم اوپر اپنی حضرت علیؓ کا ایک قول نقل کر آئے ہیں۔

سئل علیؓ هل خصكم	حضرت علیؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ کو

www.KitaboSunnat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشیء دون الناس فقال لا والذی فلق الحبۃ وبرأ النسمۃ الا فہما یؤتیہ اللہ عبدا فی کتابہ۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مخصوص علم ایسا بھی سکھایا تھا جو دوسروں کو نہ سکھایا ہو، آپ نے جواب دیا کہ نہیں اس ذات کی قسم جس نے تخم پھاڑا اور خلق کو پیدا کیا، مجھے آپ نے اس قسم کا کوئی علم نہیں سکھایا البتہ وہ فہم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کا کسی بندے کو عطا فرماتے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ علم خاص جو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ بھی درحقیقت وحی الٰہی کے فہم ہی کا ثمرہ تھا، اس سے کوئی علیحدہ چیز نہیں تھا۔

وحی الٰہی کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ ارباب تصوّف کے علمِ خفی یا علمِ لدنّی کی طرح عقل وفطرت سے بالکل ماوراشے نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے عقل اور فطرت ہی پر ہوتی ہے۔ قرآن کہیں بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ باتیں جو تم سے کہی جارہی ہیں، ان کا وجود ہی ان کی سند ہے یا یہ خود ہی دلیل اور خود ہی مدلول ہیں بلکہ وہ ہر جگہ یہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل انہی باتوں کا مطالبہ کرتی ہے اور تمہاری فطرت ان کی صحت اور صداقت پر گواہ ہے، وہ ان چیزوں کا باقاعدہ منطقی طریقہ پر ثابت کرنے کے لیے آفاق اور انفس کے اندر سے دلیلیں پیش کرتا ہے اور اس خوبی اور اس وضاحت کے ساتھ ان کو ثابت کرتا ہے کہ کوئی ہٹ دھرم ہی ان کا انکار کرسکتا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ وحی الٰہی ہماری اپنی ہی فطرت کے مدفون خزانہ کو ہماری نگاہوں کے سامنے کردیتی ہے اور ہماری ہی عقل کو ہمارے اوپر گواہ بنادیتی ہے۔ اگر یہ کام ہم خود کرتے تو اس میں غلطیوں کا امکان تھا اور یہ غلطیاں ہماری دنیا اور آخرت دونوں ہی ہمارے لیے مہلک ثابت ہوسکتی تھیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ کام وحی کے ذریعہ سے انجام دے دیا جو ہر شک وشبہ سے بالا ہوتے ہیں اہل تصوّف کے کشف ومشاہدہ سے کہیں ارفع ہے، اور اگر کوئی شخص اس میں کما حقہٗ فہم وبصیرت حاصل کرلے تو اس کو وہ نورِ یقین اور شرحِ صدر بھی حاصل ہوجائے جو اصل مقصود

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اور جس کو حاصل کرنے کے لیے صوفیہ طرح طرح کی ریاضت کر کے کشف و مشاہدہ کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی حقیقت کی طرف حضرت علیؓ نے اپنے مذکورہ بالا قول میں اشارہ کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صوفیوں کے علمِ مخفی یا علمِ لدنّی کی طرح انبیاء علیہم السلام کا علم عقل کو مفلوج اور خیرہ نہیں بناتا بلکہ وہ تمام بنیادی معاملات میں رہنمائی کر کے عقل کو صحیح اور قطعی نتائج تک پہنچا دیتا ہے اور اس طرح وہ اس کی ایسی تربیت کر دیتا ہے کہ بقیہ مسائل میں وہ آپ سے آپ صحیح طرز پر سوچنے لگ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بار بار مخاطب کو تعقل، تفکر اور تذکر کی دعوت دی گئی ہے۔

تعقل کا منشا یہ ہوتا ہے کہ آدمی زندگی کے معاملات میں محض جذبات، شہوات اور خواہشات کو اپنا راہنما نہ بنا لے اور نہ اوہام و خیالات کے ہاتھ میں اپنی باگ دے بیٹھے بلکہ اس کے اندر خدا نے جو عقل رکھی ہے اس کو رہنما بنائے اور اس کی راہنمائی پر اعتماد کرے۔

تفکر کا مطلب یہ ہے کہ نظامِ عالم کے قوانین و احکام اور فطرتِ انسانی کے مطالبات اور تقاضوں پر حکیمانہ طور پر غور کیا جائے اور ان سے زندگی کے لیے جو اصول پیدا ہوتے ہیں ان کو پوری سچائی اور ایمان داری کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔

تذکر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جن بدیہیات پر یقین رکھتا ہے۔ ان بدیہیات کو جذبات و شہوات کی ہلچل کے اندر بھی یاد رکھے اور پھر ان سے بالکل لازمی طور پر جو نتائج نکلتے ہیں ان کو بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے تسلیم کرے۔

الغرض وحیِ الٰہی ہم کو خدا کی معرفت کی منزل تک ہماری عقل پر پٹی باندھ کر نہیں لے جاتی بلکہ وہ ہماری عقل ہی کو آفاق و انفس کے اندر خدا کی صفات اور اس کے سنن و قوانین کا مشاہدہ کراتی ہے۔ پھر ان صفات اور ان سنن و قوانین سے جو اخلاقی اصول پیدا ہوتے ہیں اور پھر ان سے زندگی کے لیے جو ضابطہ بنتا ہے، ان کو ہمارے سامنے رکھتی ہے اور پھر اس سے جزا و سزا اور آخرت کے لیے جو راہنمائی ملتی ہے اس کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے، اس طرح ہماری عقل ایک بالکل مامون ہادی کی راہنمائی میں خدا کی معرفت کے اس مقام تک پہنچ جاتی ہے، جہاں تک اس کے

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اندر پہنچنے کی صلاحیت ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ درحقیقت قرآنِ حکیم ہی ہے جو خدا کی معرفت کا اصل ذریعہ ہے اور اسی کے تدبر سے انسان کو تعقل، تفکر اور تذکر کی وہ صحیح تربیت ملتی ہے جس سے انسان خدا شناسی اور خدا رسی کا اہل بنتا ہے اور اس راہ میں اس منزل تک پہنچتا ہے جہاں تک وہ پہنچ سکتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

باب دوم

عجائبُ القلب اور حقیقتِ نفس و روح

یہ باب مشہور و معروف تصنیف **"عجائبُ القلب"** سے ماخوذ ہے،

جس میں انسان کے باطنی نظام — یعنی **نفس، روح، اور قلب** — کی حقیقت کو نہایت گہرائی اور لطافت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

یہ حصہ تزکیۂ نفس کے عملی اور روحانی پہلو کو سمجھنے کے لیے نہایت بنیادی اہمیت رکھتا ہے،

کیونکہ انسان کی اصل اصلاح اُس وقت ممکن ہوتی ہے جب وہ اپنے باطن کی ساخت اور اُس میں جاری کشمکش کو پہچان لے۔

قلب، نفس اور روح — باطنِ انسان کی حقیقت

انسان کا باطن ایک پیچیدہ مگر حسین نظام ہے۔

یہاں تین بنیادی قوتیں کام کر رہی ہوتی ہیں: **نفس، روح، اور قلب۔**

- **نفس** انسان کے اندر خواہش، غفلت، اور برائی کی طرف مائل قوت ہے۔
- **روح** اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھونکی گئی وہ لطیف حقیقت ہے جو انسان کو ایمان، خیر، اور بلندی کی طرف ابھارتی ہے۔
- **قلب** ان دونوں کے درمیان وہ مرکز ہے جہاں سے فیصلے جنم لیتے ہیں — یعنی انسان کا ضمیر، اس کا باطنی کنٹرول سنٹر۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ **قلب ہی انسان کا اصل بادشاہ** ہے،

اور باقی تمام اعضا اس کے لشکر ہیں — جو اسی کے حکم سے عمل کرتے ہیں۔

قلب کی باطنی کیفیتیں اور عام غلط فہمیاں

قلب کی حالت کبھی ایمان واطمینان سے روشن ہوتی ہے اور کبھی غفلت ووسوسوں سے دھندلا جاتی ہے۔

اکثر لوگ دل کی ظاہری نرم مزاجی کو ہی پاکیزگی سمجھ لیتے ہیں،

حالانکہ حقیقی پاکیزگی اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب دل گناہ، ریا، اور تکبر سے بالکل صاف ہو جائے۔

یہ باب ان غلط فہمیوں کو دور کرتے ہوئے

قلب کی حقیقت، اس کی منازل، اور اس میں پیدا ہونے والے روحانی تغیرات کو واضح کرتا ہے۔

قلب کے لشکر — خیر وشر کی طاقتیں

انسان کے قلب میں دو طرح کی قوتیں کام کرتی ہیں:

1. **ملکی لشکر (نوری قوتیں):** جو فرشتوں کی طرف سے آتی ہیں، انسان کو خیر، نیکی اور عبادت کی طرف بلاتی ہیں۔
2. **شیطانی لشکر (ظلمانی قوتیں):** جو شیطان کی طرف سے وسوسوں اور گناہ کے داعیات کے ذریعے حملہ آور ہوتی ہیں۔

دل انہی دو افواج کے درمیان میدانِ جنگ بن جاتا ہے۔

جب فرشتوں کا لشکر غالب آتا ہے تو دل منور ہو جاتا ہے،

اور جب شیطانی وساوس اثرانداز ہوتے ہیں تو دل تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔

وسوسوں کے ذریعے شیطان کا حملہ

شیطان انسان کے دل پر براہِ راست حملہ نہیں کرتا بلکہ

وہ **وسوسے، غفلت، اور خواہش** کے دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے۔

یہ وسوسے کبھی شک کی صورت میں، کبھی حسد یا غرور کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔

امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ **شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار "غفلت" ہے۔**

جب انسان اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے تو دل کا دروازہ کھل جاتا ہے اور شیطان بآسانی داخل ہو جاتا ہے۔

فرشتے اور شیطان — دو باطنی داعی

ہر انسان کے باطن میں دو قوتیں مسلسل اثر انداز رہتی ہیں:

- **ملک (فرشتہ):** جو نیکی، ذکر، خیر، اور اطاعت کی تحریک دیتا ہے۔
- **شیطان:** جو برائی، غفلت، اور معصیت کی دعوت دیتا ہے۔

انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ان دونوں پیغامات میں فرق پہچانے اور اپنے دل کو فرشتے کے الہام کے مطابق ڈھالے۔

شیطان سے بچنے کے راستے

قرآن و سنت میں شیطان سے حفاظت کے کئی طریقے بتائے گئے ہیں، مثلاً:

1. **اللہ کی پناہ طلب کرنا:**

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (الاعراف: 200)

2. **ذکرِ الٰہی اور تلاوتِ قرآن:** دل کو نورانی بناتے ہیں، جو شیطان کے لیے ناقابلِ رسائی بن جاتا ہے۔
3. **صحبتِ صالحین:** نیک صحبت میں بیٹھنے سے دل مضبوط اور باطن محفوظ رہتا ہے۔
4. **محاسبۂ نفس:** اپنے اعمال کی نگرانی دل کو بیدار رکھتی ہے اور وسوسوں کا دروازہ بند کرتی ہے۔

ریاضتِ نفس — اصلاحِ باطن کا عملی راستہ

ریاضتِ نفس سے مراد ہے اپنے نفس کو قابو میں رکھنا، خواہشات کو لگام دینا،

اور دل کو اللہ کی رضا کے تابع کرنا۔ یہ مجاہدہ دراصل تزکیہ کا عملی پہلو ہے. جس میں بندہ اپنے نفس کی مخالفت کر کے روحانی آزادی حاصل کرتا ہے۔

ریاضت کے بنیادی اصول ہیں:

- صبر و ضبطِ نفس

- قناعت و زہد
- خلوت و ذکر
- خدمت و انکسار
- اور نیت کی پاکیزگی

یہی وہ ریاضت ہے جس سے دل روشن اور نفس مطمئن ہوتا ہے۔

قلب کے امراض اور ان کا علاج

دل کے امراض ظاہری جسمانی بیماریوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں، کیونکہ یہ روح کو مردہ کر دیتے ہیں۔

ان میں سے چند نمایاں امراض یہ ہیں:

- حسد
- تکبر
- ریا
- حبِّ دنیا
- غفلت

قرآن ان امراض کے علاج کے طور پر **ذکر، توبہ، استغفار، اور اخلاص** کی تاکید کرتا ہے۔

جب دل ان آلودگیوں سے پاک ہو جاتا ہے تو وہ **عرشِ الٰہی کا آئینہ** بن جاتا ہے، جس میں ایمان، نور، اور یقین جھلکنے لگتے ہیں۔

یہ باب دراصل انسان کے باطن کی ایک روحانی تشریح ہے۔ اس میں دل، نفس، اور روح کے تعلقات کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ قاری اپنے اندر کی دنیا کو پہچان کر اصلاح کی راہ اختیار کر سکے۔ دل جب پاک ہوتا ہے تو ایمان میں روشنی آتی ہے،

اور ایمان جب **مضبوط** ہوتا ہے تو دل نورِ معرفت سے منور ہو جاتا ہے۔ یوں انسان تزکیۂ نفس کی اُس منزل پر پہنچتا ہے جہاں اس کا قلب **اللہ کی محبت، خشیت، اور قرب** سے لبریز ہو جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

کتابُ شرح عجائب القلب

قلب کے عجائبات کا بیان

تمام مخلوقات پر انسان کی فضیلت اور شرف کا راز یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کی استعداد اور صلاحیت سے محروم نہیں ہے' یہی معرفت دنیا میں انسان کا جمال اور اس کے لیے وجہ کمال ہے' اور آخرت میں ذریعۂ نجات ہے۔ معرفت کی صلاحیت و استعداد قلب کو عطا کی گئی ہے اعضاء و جوارح کو نہیں۔ قلب ہی کو الوہیت کا علم ہے' وہی حق تعالیٰ سے قریب ہے' وہی اللہ کے لیے عمل پیرا اور راہ حق میں مصروف جدوجہد ہے' قلب ہی سے مخفی امور منکشف ہوتے ہیں' باقی تمام اعضاء قلب کے تابع ہیں اور اس کے لیے آلات اور خدمت گذاروں کا درجہ رکھتے ہیں' وہ ان سے اس طرح کام لیتا ہے جس طرح مالک اپنے غلام سے' حاکم اپنی رعایا سے' صانع اپنی مصنوعات سے کام لیا کرتا ہے اگر قلب غیر اللہ سے پاک ہے تو وہ بارگاہ خداوندی میں مقبول ہے' اور غیر اللہ میں مشغول ہے تو محجوب ہے' بازپرس اور تنبیہ و نکیر کا تعلق قلب سے ہے' اور اوامر و نواہی کا مخاطب قلب ہے' یہی قرب الٰہی کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوتا ہے' اور یہی احکام الٰہی سے روگردانی پر عتاب کا مستحق قرار دیا جاتا ہے' قلب کی فلاح تزکیہ اور صفا پر موقوف ہے' قلب معصیت کی آلائشوں سے آلودہ ہو تو ہر سعادت سے محروم اور ہر شقاوت کا مستحق ہے' اللہ تعالیٰ کی حقیقی اطاعت قلب کا عمل ہے۔ اعضاء کی عبادت اسی عمل کا مظہر ہے' معصیت بھی قلب کا فعل ہے' اعضاء کی سرکشی اور تمرد' فواحش کا ارتکاب یہ سب اسی فعل کا ردِ عمل ہیں' قلب کے اجالے سے اعضاء کے محاسن اور اس کی تاریکی سے اعضاء کے قبائح ظاہر ہوتے ہیں' برتن میں سے وہی چیز چھلکتی ہے جو اس میں ہوتی ہے۔

دل کا حال یہ ہے کہ اگر انسان اس کی معرفت حاصل کرلے تو وہ اپنے نفس کی معرفت حاصل کرلیتا ہے اور اس سے جاہل رہے تو اپنے نفس سے جاہل رہ جاتا ہے' اور نفس کی جہالت باری تعالیٰ کی معرفت کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے' اس لیے کہ جو شخص اپنے نفس کو نہیں پہچان سکتا ہے وہ غیر نفس (دوسرے) کو کیسے پہچان پائے گا اکثر لوگ اپنے دلوں اور نفسوں سے ناواقف ہیں' ان کے اور باری تعالیٰ کے درمیان حجاب حائل ہے۔ ارشاد باری ہے:

أَنَّ اللّٰهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ (پ ۹' ر ۱۷ آیت ۲۴)

(اور جان رکھو) کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی اور اس کے قلب کے درمیان میں۔

خدا تعالیٰ کے حائل ہونے سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کے قلب کو اپنی ذات کے مشاہدے' مراقبے' اور اپنی صفات کی معرفت سے روک دے' اور اسے یہ علم نہ ہونے دے کہ وہ باری تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان کس طرح منقلب رہتا ہے اور یہ کہ کبھی اس کا میلان اسفل السافلین کی طرف ہو جاتا ہے' اور اس تعلق سے شیطان اس کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے' اور کبھی اس کی طبیعت اعلیٰ علیین کی طرف مائل رہتی ہے' اور عالم ملائکہ تک عروج کرجاتا ہے' جو شخص اپنے قلب کے احوال سے بے خبر ہو اور اس کی نگہبانی و حفاظت سے غفلت کے باوجود ملکوتی خزانوں کی امید رکھے وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے متعلق باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (پ ۲۸' ر ۶' آیت ۱۹)

جنہوں نے اللہ (کے احکام) سے بے پروائی کی سو اللہ تعالیٰ نے خود ان کی جان سے ان کو بے پروا بنادیا یہی لوگ نافرمان ہیں۔

بہرحال قلب کی معرفت اور اس کے اوصاف کی حقیقت کا علم حاصل کرنا دین کی اصل' اور راہِ سلوک کا پہلا قدم ہے' اس کتاب کے نصف اول کی دو جلدوں میں ہم نے اعضاء کے اعمال یعنی عبادات اور معاملات سے بحث کی ہے' یہ بحث علم ظاہر سے متعلق تھی' ہم نے وعدہ کیا تھا کہ نصف آخر کی دوسری جلدوں میں قلب کی ان صفات پر گفتگو ہوگی جن میں سے بعض ہلاکت کا پیش خیمہ ہیں' اور بعض نجات کا باعث ہیں' یہ علمِ باطن کی بحث ہے' اولاً ہم دو باب قائم کرتے ہیں' پہلے باب میں قلب کے عجائب اور اخلاق کی شرح مذکور ہوگی' اور دوسرے باب میں ریاضتِ قلب اور تہذیبِ نفس کے طریقے بیان کئے جائیں گے' اور ان دونوں مقدمات سے فراغت کے بعد مہلکات اور منجیات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ عجائبِ قلب کی تشریح کے لیے ہم عام فہم مثالوں سے مدد لیں گے' کیونکہ یہ عجائب و اسرار عالمِ ملکوت میں داخل ہیں' اور عالم ملکوت سے متعلق چیزوں کے ادراک کرنے سے اکثر لوگ عاجز ہیں۔

پہلا باب

نفس' روح' قلب اور عقل کے معانی اور مُرادات

واضح رہے کہ یہ چاروں الفاظ مہلکات اور منجیات کے ابواب میں بکثرت استعمال ہوں گے' علماء میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو ان چاروں لفظوں کے حقیقی معنیٰ سے واقفیت رکھتے ہوں' اور ان کے معانی کے اختلاف' حدود' اور مسمیات کا صحیح علم رکھتے ہوں' یہی وجہ ہے کہ عام طور پر ان اسماء کے مدلول متعین کرنے میں غلطی ہوجاتی ہے' ذیل میں ہم ان چاروں لفظوں کی وہ تشریح کریں گے جو ہمارے مقصد سے متعلق ہے۔

<u>پہلا لفظ۔ قلب</u> : قلب کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے' ایک گوشت کے اس لوتھڑے پر جو صنوبری شکل کا ہے' اور سینے کے بائیں جانب ٹھہرا ہوا ہے' یہ ایک خاص قسم کا گوشت ہے' اس کے درمیان میں خلا ہے' جس میں سیاہ خون رہتا ہے اور یہ منبعِ روح اور سرچشمۂ حیات ہے' لیکن اس قلب کی شکل یا کیفیت کا بیان ہمارے مقصود سے متعلق نہیں ہے۔ یہ اطباء کا موضوع ہے' دینی اغراض اس سے متعلق نہیں ہیں' اس طرح کے قلب سے انسان تو انسان چوپائے بھی خالی نہیں ہیں' بلکہ زندہ جسموں کی طرح مردہ جسم بھی اس سے محروم نہیں ہوتے' اس کتاب میں ہم جہاں کہیں بھی لفظ قلب استعمال کریں گے اس سے یہ قسم مراد نہیں ہوگی' کیوں کہ اس معنیٰ کی رو سے قلب گوشت اور خون سے مرکب ایک لوتھڑے کا نام ہے' اور عالمِ محسوس سے تعلق رکھتا ہے' صرف انسان ہی نہیں بلکہ بہائم بھی اپنی آنکھوں سے اسی کا ادراک کرلیتے ہیں۔ دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ قلب ایک روحانی ربانی لطیفہ ہے جس کا اس جسمانی قلب سے تعلق ہے۔ اور یہی لطیفہ انسان کی حقیقت ہے' مُدرِک (ادراک کرنے والا) بھی یہی ہے عالم بھی یہی ہے' خطاب اور عتاب بھی اسی سے ہوتا ہے۔ اس لطیفہ کو جسمانی قلب سے جو تعلق ہے اس کی وجہ کے ادراک سے عام طور پر عقلیں عاجز ہیں' کیونکہ اس لطیفے کو جسمانی قلب سے وہی تعلق اور مناسبت ہے جو اعراض کو اجسام سے اور اوصاف کو موصوفات سے ہے' یا آلات استعمال کرنے والے کو آلات سے اور مکین کو مکان سے ہے۔ ہم اس مناسبت اور تعلق و ارتباط کے اسباب دو وجہوں سے بیان نہیں کرتے' ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق علومِ مکاشفہ سے ہے' جب کہ اس کتاب سے ہمارا مقصود علومِ معاملہ کا بیان ہے نہ کہ علومِ مکاشفہ کا دوسری وجہ یہ ہے کہ اس تعلق کی وضاحت کے لیے روح کے راز سے پردہ اٹھانا ہوگا۔ اور روح ایک ایسا راز ہے جس کے بارے میں زبانِ نبوت سے بھی کچھ ارشاد نہیں ہوا۔ غیر نبی کو کیا حق ہے کہ وہ اس سلسلے میں لب کشائی کرے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس کتاب میں جہاں کہیں ہم لفظ قلب بولیں گے وہاں یہی لطیفہ مراد ہوگا' ہم اس لطیفے کے احوال اور اوصاف بیان کریں گے' اس کی حقیقت اور ماہیت سے بحث کرنا ہمارا مقصود نہیں

ہے۔

دوسرا لفظ۔ روح : اس کے بھی دو معنیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ روح ایک جسم لطیف کا نام ہے جس کا منبع جسمانی قلب کا خلا ہے اپنے اس مرکز سے روح رگوں اور شریانوں کے ذریعہ تمام اعضاء بدن میں پھیلتی ہے روح کا بدن میں پھیلنا اور اعضاء بدن کو زندگی کی روشنی اور حواس خمسہ کو حس کی صلاحیت دینا ایسا ہے جیسے کسی گھر میں چراغ رکھ دیا جائے اور اس کے چاروں طرف اُجالا ہو جائے اس تمثیل سے ثابت ہوا کہ روح کی حیثیت چراغ کی ہے اور حیات بمنزلہ نور کے ہے اور روح کا بدن میں جاری و ساری ہونا ایسا ہے جیسے چراغ کی روشنی اطراف میں پھیلتی اور سرایت کرتی ہے۔ روح کے یہ معنیٰ اَطبّاء کی اصطلاح کے مطابق ہیں یعنی یہ کہ روح ایک لطیف بخار کا نام ہے جو قلب کی حرارت سے بنتا ہے اور یہ معنیٰ ہماری غرض سے متعلق نہیں ہیں بلکہ ان اَطبّاء کی بحث و نظر کا موضوع ہیں جو بدن کا علاج کرتے ہیں دین کے اَطبّاء جو قلب کے امراض کا علاج کرتے ہیں اس معنیٰ سے بحث نہیں کرتے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ روح انسان میں ایک لطیفہ مدرکہ ہے اس لطیفے کی وضاحت ہم قلب کے معنیٰ کے ضمن میں بھی کر چکے ہیں۔ نیز حسب ذیل آیت کریمہ میں بھی یہی معنیٰ مراد ہیں:

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (پ ۱۵ ر ۱۰ آیت ۸۵)

آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے۔

یہ ایک ایسی عجیب و غریب ربّانی شئی ہے کہ جس کی حقیقت اور ماہیت کے ادراک سے اکثر عقلیں قاصر نظر آتی ہیں۔

تیسرا لفظ۔ نفس : یہ لفظ بھی متعدد معانی کے لیے مشترک ہے ان میں سے دو معنیٰ ہمارے مقصد سے قریب ہیں۔ ایک یہ کہ نفس وہ شئی ہے جو انسان کے اندر غضب اور شہوت کی قوتوں کو جامع ہو جیسا کہ عنقریب اس معنیٰ کی تشریح کی جائے گی۔ صوفیاء کے یہاں یہی معنیٰ شائع و ذائع ہیں ان کے نزدیک نفس وہی ہے جو مذموم صفات کا جامع ہو اسی لیے وہ کہا کرتے ہیں کہ نفس کے خلاف مجاہدہ کرنا اور اس کی شہوتوں کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا منشاء بھی یہی ہے۔

اعدی عدوک نفسک التی بین جنبیک (بیہقی۔ ابن عباس)

تیرا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو تیرے پہلو میں ہے۔

نفس کے دوسرے معنیٰ اسی لطیفۂ ربّانی سے عبارت ہیں جس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ اس معنیٰ کی رو سے فی الحقیقت نفس انسان اور ذات انسان یہی ہے البتہ یہ نفس مختلف حالات میں مختلف صفات کے ساتھ متصف ہوتا ہے چنانچہ جب وہ اطاعت کے تحت ٹھہر جاوے اور شہوت سے جنگ کرتے کرتے اس کا اضطراب زائل ہو جائے تو اسے نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے نفسِ مطمئنہ کو ان الفاظ میں خطاب کیا ہے۔

یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (پ ۳۰ ر ۱۴ آیت ۲۷)

اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش ہو اور وہ تجھ سے خوش۔

اس سے پہلے نفس کے جو معنیٰ بیان کئے گئے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع مقصود نہیں ہوتا جو شانِ عبدیت ہے۔ بلکہ اس میں سرکشی اور حکم الٰہی سے روگردانی پائی جاتی ہے جو شیطانی عمل ہے۔ اور ایک نفس وہ ہے جو کمال اطاعت کی صفت سے محروم ہو لیکن اطاعت میں عجز اور قصور پر اپنے آپ کو لعنت ملامت بھی کرتا ہو اسے نفسِ لوّامہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (پ ۲۹ ر ۱۷ آیت ۲)

اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے۔

ایک نفس وہ ہے جو خواہشاتِ نفس کے بہاؤ کو نہ روک سکے اور خود کو اسی کے سپرد کر دے یہ نفس امّارہ بالسّوء کہلاتا ہے قرآن پاک

میں اس نفس کا ذکر حضرت یوسف علیہ السلام یا عزیز مصر کے واقعے میں آیا ہے۔

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ (پ ۱۳' ر ا آیت ۵۳)

اور میں اپنے نفس کو بری اور پاک نہیں بتلاتا (کیونکہ) نفس تو بری ہی بات بتلاتا ہے۔

بہرحال نفسِ امّارہ بالسّوء ہونے کی حیثیت سے برا ہے' اور مطمئنہ ہونے کے لحاظ سے محمود ہے'

چوتھا لفظ۔ عقل : یہ لفظ بھی مختلف معانی کے لیے مشترک ہے' کتاب العلم میں یہ معانی ہم بیان بھی کرچکے ہیں' ان میں سے دو معنی ہمارے مقصد سے قریب تر ہیں' ایک یہ کہ عقل حقائق امور کے علم کا نام ہے' اس صورت میں عقل صفت علمی سے عبارت ہوگی' اس صفت کا محل قلب ہے' کبھی عقل سے مراد مُدرِک للعلوم (علوم کا ادراک کرنے والا) ہوتا ہے' یہ قلب کا خاصہ ہے' اس تعریف کی رو سے عقل بھی وہی لطیفۂ ربانی ہوا جس کا ذکر پہلے تین الفاظ کی تشریح کے ضمن میں گذر چکا ہے۔ ان دونوں معنوں کی وضاحت کے لیے سمجھئے کہ یہ حقیقت سب کو معلوم ہے کہ جو عالم ہے وہ بنفسہ موجود اور بظاہر قائم ہے' علم کی صفت اس کے اندر حلول کئے ہوئے ہے' اور صفت اپنے موصوف کی غیر ہوتی ہے' چنانچہ عقل سے کبھی تو یہ صفت مراد ہوتی ہے جسے علم بھی کہہ سکتے ہیں' اور کبھی محل ادراک یعنی موصوف مراد ہوتا ہے' حدیث شریف میں عقل کے یہی معنی مراد ہیں ارشاد فرمایا:

اول ماخلق العقل

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عقل کی تخلیق فرمائی۔

یہاں علم کی صفت مراد نہیں ہوسکتی' کیونکہ علم بذاتہ قائم نہیں ہے' بلکہ ایک عرض ہے' عرض کی تخلیق پہلے کیسے ہوگی' بلکہ یہ ضروری ہے کہ پہلے محل ادراک کی تخلیق ہو' پھر صفت علم کی' یا دونوں ساتھ ساتھ پیدا کئے جائیں' پھر علم کی صفت سے خطاب بھی ممکن نہیں ہے' جب کہ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقل سے فرمایا سامنے آ' وہ سامنے آئی پُشت پھیر' اس نے پُشت پھیرلی۔

حاصل یہ نکلا کہ ان چاروں الفاظ کے مدلولات الگ الگ بھی ہیں' اور مشترک بھی' الگ الگ مدلولات یہ ہیں۔ جسمانی قلب' جسمانی روح' شہوانی نفس' اور علوم' اور مشترک لطیفۂ معنی مدرکہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر لفظ کے دو معنی ہیں۔ اکثر علماء ان الفاظ کے اختلاف سے غلط فہمی کا شکار ہوگئے' اور ان کے مدلولات متعین کرنے میں انہیں دشواری ہوئی' یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان چاروں کے لیے خواطر کا لفظ استعمال کیا' یعنی یہ کہا کہ یہ خاطر قلب ہے' یہ خاطر روح ہے' یہ خاطر نفس ہے' یہ خاطر عقل ہے۔ لیکن اس اختلاف پر نظر رکھنے والا شخص جانتا ہے کہ ان چاروں لفظوں میں فی الحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی نقطے کی وضاحت کے لیے ہم نے ہر لفظ کے مختلف اور مشترک معنی بیان کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

قرآن کریم اور حدیث شریف میں جہاں کہیں قلب کا لفظ آیا ہے وہاں اس سے اشیاء کی حقیقت کا ادراک کرنے والی قوت مراد ہے' یہ قوت انسان کے اندر موجود ہے' اس کے لیے لفظ قلب بطور کنایہ استعمال کیا جاتا ہے' کیونکہ اس قوت مدرکہ کو اس قلب سے مخصوص مناسبت اور خاص تعلق ہے' اگرچہ وہ قوت تمام بدن سے متعلق ہے' اور ہر عضو سے کام لیتی ہے' لیکن اس کا تعلق اعضائے بدن سے براہِ راست نہیں ہے' بلکہ قلب کے واسطے سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قلب جسمانی اس لطیفۂ مذکورہ کا محل' عالم' دارالسلطنت اور سواری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سہل تستری نے قلب کو عرش اور سینے کو کرسی سے تشبیہ دی ہے' اس تشبیہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قلب اللہ تعالیٰ کا عرش' اور اس کی کرسی ہے۔ کیونکہ یہ امر محال ہے' بلکہ ان کا منشا یہ ہے کہ قلب اس لطیفے کی مملکت اور تخت شاہی ہے' جس میں رہ کر یا جس پر بیٹھ کر وہ تمام بدن پر حکومت کرتا ہے' قلب اس کے تصرف کا نقطۂ آغاز ہے' حاصل کلام یہ ہے کہ لطیفۂ مذکورہ سے قلب اور سینے کو وہ نسبت اور تعلق ہے جو نسبت عرش و کرسی کو اللہ تعالیٰ سے ہے۔ یہ تشبیہ اسی ایک وجہ سے صحیح ہوسکتی ہے' کیونکہ اس سے ہمارا مقصود متعلق نہیں ہے اس لیے ہم اس بحث کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

قلب کے لشکر

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ (پ ۲۹ ر ۱۵ آیت ۳۱)

تمہارے رب کے لشکروں کو بجز رب کے کوئی نہیں جانتا۔

اس آیت میں باری تعالیٰ کے لشکروں کا ذکر ہے جن کی تعداد سے سوائے رب کریم کے کوئی دوسرا واقف نہیں ہے' یہ لشکر قلوب' ارواح اور دوسرے بے شمار عالموں میں موجود ہیں' کیونکہ ہمارے گفتگو کا موضوع قلب ہے اس لیے ہم قلب کے بعض لشکروں کا ذکر کرتے ہیں۔

قلب کے دو لشکر ہیں' ایک وہ جو ظاہری آنکھ سے دکھائی دیتا ہے' اور دوسرا وہ جو عقل کی آنکھ سے محسوس ہوتا ہے' قلب کی حیثیت بادشاہ کی ہے' اور لشکر اعوان و خدام کا حکم رکھتے ہیں' ظاہری آنکھ سے نظر آنے والے لشکر میں ہاتھ' پاؤں' آنکھ' کان' زبان اور دوسرے تمام اعضاء شامل ہیں' یہ سب اعضاء خواہ جسم کے ظاہر میں ہوں یا باطن میں قلب کے خادم ہیں' اور انہیں اس کی اطاعت کا پابند کر دیا گیا ہے' وہ ان میں جس طرح چاہتا ہے تصرف کرتا ہے' ان کا وظیفہ خدمت اور اطاعت ہے' وہ اپنے وظیفے سے رُوگردانی کی قدرت نہیں رکھتے' اور نہ اس کے خلاف عمل کرنے کا یارا رکھتے ہیں' مثلاً جب آنکھ کھلنے کا حکم ہوتا ہے وہ کھل جاتی ہے' بند کرنے کے لیے کہا جاتا ہے بند ہو جاتی ہے' پاؤں کو حرکت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے تو وہ حرکت کرنے لگتا ہے' زبان کو بولنے کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ بول پڑتی ہے' تمام اعضاء کا یہی حال ہے ان کی اطاعت بعض وجوہ سے باری تعالیٰ کے لیے فرشتوں کی اطاعت کے مشابہ ہے' چنانچہ فرشتے فطری طور پر مطیع ہیں' ان کی تخلیق کا مقصد اطاعت ہے' اور وہ اس مقصد سے انحراف نہیں کر سکتے ان کا حال یہ ہے۔

لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (پ ۲۸ ر ۱۹ آیت ۶)

کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو بجالاتے ہیں۔

البتہ فرشتوں کی اطاعت اور اعضاء کی اطاعت میں ایک فرق ہے' اور وہ یہ کہ فرشتے اپنی اطاعت کا علم رکھتے ہیں' جب کہ اعضاء کی اطاعت میں یہ بات نہیں ہے' آنکھ سے کھلنے کے لیے کہا جاتا ہے وہ کھل جاتی ہے لیکن نہ اسے اپنے وجود کی خبر ہوتی ہے' اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے حاکم قلب کی اطاعت میں کھل رہی ہے۔

جس طرح قلب راہ سلوک کا سفر طے کرنے کے لیے سواری اور زاد راہ کا محتاج ہے اسی طرح اسے اعوان و خدام کی بھی ضرورت ہے' یہ سفر وہ ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے' ارشاد باری ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (پ ۲۷ ر ۲ آیت ۵۶)

اور میں نے جنّ اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔

قلب کی سواری بدن ہے' علم اس کا زاد راہ ہے' اور اس زاد راہ کے حصول کا ذریعہ نیک اعمال ہیں' کسی بندے کے لیے ممکن نہیں کہ وہ دنیا میں قیام کیے بغیر اللہ تک پہنچ سکے' بعید ترین منزل تک پہنچنے کے لیے قریب ترین منزل کا قطع کرنا ضروری ہے' یہی وجہ ہے کہ دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا جاتا ہے' دنیا ہدایت کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے' اس کا نام دنیا اسی لیے رکھا گیا ہے کہ یہ قریبی منزل ہے' بہرحال اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے اس منزل سے زاد راہ لینا ضروری ہے' کیونکہ بدن منزل تک پہنچنے کے لیے سواری کے درجے میں ہے' اس لیے اس کی نگرانی اور حفاظت بھی ناگزیر ہے' اور بدن کی حفاظت اس طرح ہوگی کہ اسے وہ غذا دی جائے جو اس کے موافق ہو' اور اس غذا سے روکا جائے جو اسے ہلاک کر سکتی ہو' حصول غذا کے لیے دو لشکریوں کی ضرورت ہے' ایک باطنی یعنی شہوت (بھوک وغیرہ کی خواہش)

اور دوسرا ظاہری یعنی ہاتھ اور دیگر اعضاء جن سے غذا فراہم ہوتی ہے۔ قلب میں خواہش اسی لیے پیدا کی گئی ہے' اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے ظاہر جسم میں اعضاء بھی عنایت کئے گئے ہیں اسی طرح مُہلکات سے بچنے کے لیے بھی دو لشکری دیئے گئے ہیں' ایک باطن میں جو غضب کہلاتا ہے اس کی وجہ سے آدمی مُہلکات دور کرتا ہے' اور دشمنوں سے انتقام لیتا ہے' دوسرا لشکر ظاہر میں ہے جو ہاتھ اور پاؤں سے عبارت ہے' آدمی ان کے ذریعہ غضب کے تقاضے پر عمل کرتا ہے بدن میں ان اعضاء کا وجود ایسا ہے جیسے کسی سپاہی کے پاس ہتھیار اور آلات جنگ ہوں' پھر غذا کی خواہش اور ضرورت ہی کافی نہیں ہے' بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کو اس غذا کا حال معلوم ہو' اس کے لیے بھی باطنی اور ظاہری لشکریوں کی ضرورت ہے' ظاہری لشکری یہ ہے کہ آدمی حواسِ خمسہ یعنی سمع' بصر' شم' لمس اور ذوق رکھتا ہو' اور باطنی لشکری یہ ہے کہ ان حواسِ خمسہ کے ادراک سے محروم نہ ہو۔ قلب کے لیے ان اَعوان و خُدّام کی ضرورت پر بہت کچھ گفتگو کی جاسکتی ہے' یہ بحث اتنی تفصیل طلب ہے کہ مبسوط جلدیں بھی ناکافی ہیں ہم نے کتاب الشکر میں مختصر طور پر کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے' طالب کو اسی پر اکتفا کرنا چاہئے۔

قلب کے خُدّام تین طرح کے ہیں' ایک وہ جو اسے کسی شئی کی رغبت دلائیں' خواہ وہ جلبِ منفعت ہو یا دفعِ مضرت۔ اول کی مثال شہوت (بھوک وغیرہ) اور دوسرے کی مثال غضب ہے۔ اس قسم کے خادم کو ارادہ بھی کہتے ہیں' دوسری قسم میں وہ خُدّام شامل ہیں جو حصولِ مقصد یا تکمیل ارادہ کے لیے اعضاء کو تحریک دیں' اسے "قدرت" کہتے ہیں' یہ تمام اعضاء اور ہر ہر جزو بدن و رگ و پے میں پھیلی ہوئی ہے' تیسری قسم میں وہ خُدّام ہیں جو جاسوسوں کی طرح اشیاء کا ادراک کرلیں' اور ان کی حقیقت معلوم کرلیں' بینائی' سماعت' سونگھنے' چھونے اور چکھنے وغیرہ کی قوتیں اسی قسم سے متعلق ہیں۔ یہ قوتیں متعینہ اعضاء میں منتشر ہیں' اس قسم کو علم اور ادراک کہتے ہیں' ان باطنی خُدّام کے ساتھ ظاہری خُدّام بھی ہیں' یعنی وہ اعضاء جو آلات اور اسباب کی حیثیت رکھتے ہیں' مثلاً گرفت کی قوت انگلیوں سے اور بینائی کی قوت آنکھ سے متعلق ہے' اسی پر دوسری قوتوں اور اعضاء کو قیاس کرنا چاہئے۔

ہماری بحث و گفتگو کا محور ظاہری اعضاء نہیں ہیں کیونکہ یہ عالم ظاہری سے ہیں' بلکہ ہم ان باطنی اَعوان و خُدّام سے بحث کرتے ہیں جن کا مشاہدہ آنکھ سے نہیں ہوتا۔ اور یہ اَعوان و خُدّام "قوائے مُدرِکہ" (ادراک کرنے والی قوتیں) کہلاتی ہیں' پھر ان قوائے مُدرِکہ کی بھی دو قسمیں ہیں' کچھ وہ ہیں جو ظاہری اعضاء میں سکونت پذیر ہیں' اور وہ حواس خمسہ ہیں یعنی سمع' بصر' شم' ذوق اور لمس۔ اور کچھ وہ ہیں جن کا مسکن دماغ کی رگوں میں ہے' یہ بھی پانچ ہیں' چنانچہ آدمی کسی چیز کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کرلے' اور اس کی تصویر اپنے دل میں پائے تو اسے خیال کہتے ہیں' پھر یہ صورت کسی چیز کے یاد رکھنے سے اس کے ساتھ ہو جاتی ہے اسے "حافظہ" کہتے ہیں' پھر جو چیز حافظے میں رہ جائے اس میں غور کرکے بعض کو بعض سے ملائے اور جو بھول جائے اسے یاد کرے' اور بھولی ہوئی صورت ذہن میں دوبارہ آجائے' اور تمام معانی محسوسات کو حسِّ مشترکہ اپنے خیال میں جمع کرلے اسے ذکر' فکر' اور حسِ مشترک کہتے ہیں' اگر اللہ تعالیٰ حفظ' فکر' ذکر اور خیال کی قوتیں پیدا نہ فرماتے تو دماغ ان سے خالی ہوتا جس طرح ہاتھ پاؤں اور قوتوں سے خالی ہیں۔ جس طرح یہ قوتیں باطنی ہیں اسی طرح ان کے مسکن بھی باطنی ہیں۔

قلب کے لشکروں کی یہ قسمیں ہیں' ان کا فہم وقتِ نظری پر موقوف ہے' کم علموں کو سمجھانے کے لیے تفصیل کی ضرورت ہے' اس لیے ہم کچھ مثالوں کے ذریعہ ان قسموں پر روشنی ڈالتے ہیں تاکہ مُبتدی بھی سمجھ لیں۔

قلب کے باطنی خُدّام اور عام فہم مثالیں

قلب کے دو خادم یعنی غضب اور شہوت جب اس کی پورے طور پر اطاعت کرتے ہیں تو راہِ سلوک میں اسے ان سے بڑی مدد ملتی ہے' وہ انہیں بہترین رفیقِ سفر' اور بے لوث اور مخلص مددگار تصور کرتا ہے' کبھی یہ دونوں خادم نافرمانی اور بغاوت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں' اور

بجائے اس کی اطاعت کے خود اسے اپنی اطاعت پر مجبور کردیتے ہیں' اور اسکی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں' لیکن کیونکہ قلب کے صرف یہی دو خادم نہیں ہیں بلکہ اور بھی خدام اور اعوان ہیں' اگر شہوت و غضب آمادۂ بغاوت ہوجائیں تو قلب کو مایوس نہ ہونا چاہئے بلکہ ان کے خلاف اپنے دوسرے خدام کی مدد حاصل کرنی چاہئے' غضب اور شہوت کبھی کبھی شیطان کی جماعت سے جاملتے ہیں' اگر اس نے اللہ کے گروہ سے مدد نہ لی' اور اپنے نفس پر غضب اور شہوت کی فوجوں کو غلبہ دیا تو وہ یقینی ہلاکت' اور زبردست خسارے کی طرف گامزن ہے۔ اکثر لوگوں کا یہی حال ہے' ان کی عقلیں شہوتوں کی تابع ہیں' کیونکہ وہ تقاضائے شہوت کے لیے حیلے تراشتی ہیں' حالانکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ ان کی شہوتیں عقل کے تابع ہوتیں۔ ہم چند مثالوں کے ذریعہ اس نقطے کی وضاحت کرتے ہیں۔

پہلی مثال : فرض کیجئے کہ نفس انسانی یعنی وہ لطیفہ ربانی جس کا ذکر مقدمہ میں کئی بار ہوچکا ہے اپنے ملک اور دارالحکومت میں بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بدن اس کی مملکت اس کا مستقر' اس کا دارالحکومت اور اعضاء و جوارح کی حیثیت وہ ہے جو شاہی عملے کے ارکان کی ہوتی ہے' قوت عقلیہ اس کا مخلص مشیر' اور عقلمند و خیر خواہ وزیر ہے' غضب اس کا باڈی گارڈ اور کوتوال شہر ہے' دشمنوں سے بادشاہ کی حفاظت اس کے فرائض میں شامل ہے' شہوت اس کا وہ بد خلق ملازم ہے جس کے ذمے اہل شہر کے لیے کھانے کا نظم کرنا ہے۔ یہ شخص انتہائی جھوٹا فریبی' دھوکہ باز' اور خبیث ہے' بظاہر خیر خواہ نظر آتا ہے' لیکن اس کی خیر خواہی کے پردے میں زہر ہلاہل اور سم قاتل ہے۔ مخلص وزیر کی رائے اور تدبیر سے اختلاف کرنا اس کی عادت ہے' کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ اس کی مخالفت نہ کرتا ہو' اس صورت میں اگر بادشاہ اپنے وزیر کی تدابیر پر عمل کرے' اس سے مشورے حاصل کرے' اور اس خبیث غلام سے اعراض کے ذریعہ یہ ظاہر ہے کہ حکومت کے حق میں اس سے دور رہنا ہی بہتر رہے' نیز کوتوال شہر کو بھی تادیب کرے کہ وہ اس بدباطن غلام اور اس کے تابعین پر نظر رکھے' اگر وہ کسی غلط کام میں مشغول ہوں تو انہیں سزا دے' امید یہی ہے کہ اس صورت میں غلام سرکشی نہ کرسکے گا' اور بادشاہ کا مغلوب و محکوم بنا رہے گا اور حکومت نہایت عدل اور نظم کے ساتھ چلے گی۔ اسی طرح اگر نفس اپنی عقل سے مدد حاصل کرتا رہے' اور کبھی غضب کے محافظ کے ذریعہ شہوت کے غلام پر کاری ضرب لگاتا رہے اور کبھی غضب کے غلبے کو کم کرنے کے لیے شہوت سے مدد چاہتا رہے تو اس کے قوی اعتدال پر رہیں گے' اخلاق بہتر رہیں گے' اور اگر اس طریقہ سے اعراض کرے گا تو ان لوگوں میں سے ہوگا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (پ ۲۵' ر ۱۹ آیت ۲۳)

سو کیا آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے اس کو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کردیا ہے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ (پ ۹ ر ۲ آیت ۱۷۶)

اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا سو اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے یا اس کو چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔

نفس کو شہوات کے فریب سے دور رکھنے والے کے متعلق ارشاد فرمایا:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ (پ ۳۰ ر ۴ آیت ۴۰' ۴۱)

اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگا۔

غضب اور شہوت کو ایک دوسرے پر مسلط کرنے کی کیفیت' اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے ثمرات کا تذکرہ ریاضت نفس کے باب میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔

دوسری مثال : فرض کیجئے بدن ایک شہر ہے' اور عقل یعنی انسان کی قوت مدرکہ اس شہر کا حاکم ہے' اور ظاہری اور باطنی حواس اس کے اعوان و سپاہی ہیں' اور اعضاء رعیت ہیں' اور نفس امارہ جسے شہوت اور غضب سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں اس کا وہ دشمن ہے جو اس کی حکومت چاہتا ہے' اور اس کی رعایا کو موت کی نیند سلانے کا خواہش مند ہے۔ اس صورت میں بدن محاذ جنگ کی طرح ہے جہاں حاکم شہر بنفس نفیس دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے موجود ہے' اگر اس نے جنگ میں غلبہ حاصل کیا' اور دشمن کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کردیا تو اس کی یہ جدوجہد اعلیٰ دربار میں تعریف و تحسین کا خراج وصول کرے گی' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً (پ ۵ ر ۱۰ آیت ۹۵)

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بنایا ہے جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں بہ نسبت گھر میں بیٹھنے والوں کے۔

لیکن اگر اس نے محاذ جنگ میں بہادری کے جوہر نہ دکھائے' اور دشمن سے ہزیمت اٹھائی تو یہ مذموم فعل ہوگا اور اسے غفلت کی سزا دی جائے گی' چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ایسے شخص سے کہا جائے گا کہ:

یا راعی السوء اکلت اللحم و شربت اللبن ولم تاو الضالة ولم تجبر الکسیر الیوم انتقم منک (۱)

اے خبیث چرواہے! تو نے گوشت کھایا' اور دودھ پیا' مگر گم شدہ کا پتا نہ لگایا' شکستہ کو صحیح نہ کیا' آج میں تجھ سے انتقام لوں گا۔

حدیث شریف میں اسی جہاد کی طرف اشارہ ہے۔

رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر (سنن بیہقی۔ جابر)

ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہیں۔

تیسری مثال : فرض کیجئے کہ عقل ایک سوار ہے جو شکار کے ارادے سے نکل رہا ہے' شہوت اس کا گھوڑا ہے' اور غضب اس کا کتا ہے' اب اگر وہ سوار اپنے فن میں ماہر ہو' گھوڑا بھی سدھا ہوا ہو' اور کتا بھی تعلیم یافتہ ہو تو بلاشبہ یہ شکاری اپنے مقصد میں کامیاب ہے' اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی نقصان اٹھائے بغیر شکار لے کر واپس آئے گا' دوسری صورت یہ ہے کہ وہ خود بھی شکار کے فن سے ناواقف ہو' گھوڑا بھی سرکش ہو' اور کتا بھی دیوانہ' ایسے شخص کے بارے میں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کامیابی کے ساتھ واپس آئے گا' اگر وہ صحیح و سلامت واپس آجائے تو غنیمت ہے' سوار کی ناواقفیت انسان کی جہالت کے مشابہ ہے' گھوڑے کی سرکشی غلبۂ شہوت اور کتے کی دیوانگی غلبۂ غضب کی مثال ہے۔

انسان کے قلب کی خصوصیات

اب تک جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف انسان ہی کو نہیں بلکہ حیوانات کو بھی حاصل ہیں' مثال شہوت' غضب' ظاہری اور باطنی

۱۔ مجھے اس روایت کی کوئی اصل نہیں ملی۔

حواس انسان کی طرح حیوان میں بھی ہیں، حتیٰ کہ بکری بھیڑیئے کو آنکھوں سے دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ وہ اس پر حملہ کرنا چاہتا ہے، اور وہ قلب سے اس کے ارادے کو بھانپ کر فرار ہو جاتی ہے، یہ باطنی ادراک ہی تو ہے، اس میں انسان کی تخصیص نہیں ہے، بلکہ بے عقل جانور بھی اس قوت سے کام لیتے ہیں، اور اپنے نفع و نقصان کا ادراک کرتے ہیں، یہاں ہمارا مقصود ان امور کا ذکر ہے جو صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہیں، اور جن کے باعث اسے دوسری مخلوقات پر شرف اور فضیلت اور اللہ عزوجل کی قربت حاصل ہے۔

جاننا چاہئے کہ قلب انسانی کے ساتھ مخصوص امور صرف دو ہیں ایک علم، دوسرا ارادہ۔ علم سے مراد ان دنیوی اور اُخروی اور عقلی حقائق کا علم ہے، یہ امور اور حقائق محسوسات سے ماوراء ہیں، اور ان میں حیوانات انسانوں کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔ بلکہ بدیہی علوم کلیہ بھی عقل کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لیے کہ انسان ہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ایک ہی شخص کا ایک ہی حالت اور ایک ہی وقت میں دو مکانوں میں پایا جانا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ اس نے دنیا کے چند افراد دیکھے ہیں، لیکن اس کا یہ حکم تمام افراد کو شامل ہوگا، معلوم ہوا کہ تمام افراد پر اس کا یہ حکم لگانا حواس سے زائد ایک امر ہے جو عقل ہی سے متعلق ہو سکتا ہے۔ جب بدیہی اور ظاہری علوم کا حال یہ ہے تو نظری علوم کا درجہ اولیٰ ہوگا۔ ارادہ سے مراد یہ ہے کہ جب انسان کسی امر کے انجام پر نظر ڈالتا ہے، اور اس میں کوئی بہتری نظر آتی ہے تو اس میں اس کا شوق، اور اسے حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، یہ ارادہ وہ نہیں جسے شہوت کہتے ہیں یا جو حیوانات میں بھی موجود ہے، بلکہ یہ ارادہ شہوت کے ارادے کی ضد ہے، شہوت اور ارادے کا فرق اس مثال سے ظاہر ہوگا کہ شہوت فصد کھلوانے اور پچھنے لگوانے سے نفرت کرتی ہے، مگر عقل اس کی افادیت سمجھتی ہے، اور اس کا ارادہ کرتی ہے، بلکہ اس کے لیے مال تک خرچ کرا دیتی ہے، اسی طرح بیماری کی حالت میں شہوت لذیذ کھانوں کی طرف مائل رہتی ہے لیکن عقل اسے مُضِر سمجھ کر روکتی ہے۔ یہ ممانعت شہوت کی طرف سے نہیں ہوتی، بلکہ عقل کی رو سے ہوتی ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس ارادے کی تخلیق نہ فرماتا جس سے عقل کے مقتضیات کو تحریک ملتی ہے اور ان پر عمل ہوتا ہے تو عقل کی تخلیق کا مقصود فوت ہو جاتا۔

معلوم ہوا کہ انسان کی قلب میں علم اور ارادہ دو ایسے امر ہیں جو حیوانات میں نہیں پائے جاتے بلکہ کمسن بچے بھی ان سے محروم ہوتے ہیں، یہ خصوصیات انہیں بُلوغ کے بعد حاصل ہوتی ہیں، اگرچہ ان میں شہوت، غضب، ظاہری اور باطنی حواس روز اول ہی سے موجود ہوتے ہیں۔

ان علوم کے حصول کے دو درجے : معلوم ہوا کہ بچہ بُلوغ کے بعد ہی یہ خصوصیات حاصل کرپاتا ہے، اس حصول یا اِکتساب کے دو درجے ہیں، ایک درجہ تو یہ ہے کہ اسے بدیہیات کا علم ہو، مثلاً یہ کہ وہ محال کو محال اور ممکن کو ممکن سمجھتا ہو، اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ وہ بدیہیات سے تو واقف ہے، لیکن علوم نظریہ کا علم نہیں رکھتا، تاہم یہ کہا جائے گا کہ وہ علوم نظریہ کے حصول کے قریب ہے، اور ان علوم کے تعلق سے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کاتب کہ جو اگرچہ کتابت سے واقف نہیں ہے، لیکن کتابت کے آلات یعنی دوات، قلم، اور مفرد حروف سے واقف ہے ایسے شخص کو مکمل کاتب تو نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس فن سے قریب ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے تجربہ، فکر اور اِکتساب کے ذریعہ ان علوم کا ذخیرہ میسّر آجائے، اور وہ اس ذخیرہ کو اپنے ذہن کے خزانے میں محفوظ کرلے، اس خیال سے کہ وہ جب چاہے گا اس ذخیرے سے فائدہ اٹھالے گا۔ ایسا شخص ماہر کاتب کی طرح ہے، اگرچہ وہ فی الوقت لکھ نہیں رہا ہے، لیکن لکھنے کے فن سے واقف ہے، اور جب جی چاہے لکھ سکتا ہے، یہ انسان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ اس درجے میں بے شمار مراتب ہیں معلومات کی کثرت، قلت، شرف، وسعت اور تحصیل کے طریقوں میں اختلاف کی وجہ سے ہر شخص کا حال جداگانہ ہے، بعض قلوب الہام اور کشف کے ذریعہ ان علوم کا ادراک کرتے ہیں بعض تعلّم اور اکتساب کے ذریعہ علوم حاصل کرپاتے ہیں بہت سے لوگ ایسے ذکی اور سریع الفہم ہوتے ہیں کہ مشکل سے مشکل بات لمحوں میں سمجھ جاتے ہیں، اور بہت سے لوگ اتنے غبی اور کند ذہن ہوتے ہیں کہ تکرار و اعادے اور فکر و نظر کے بغیر کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی، اس میں علماء حکماء، انبیاء اور اولیاء سب کے درجات مختلف ہیں، جہاں تک اعلیٰ ترین درجے کا تعلق ہے اس کی کوئی حد یا انتہا نہیں ہے، کیوں کہ معلومات کا دائرہ بے حد وسیع ہے اس میں اعلیٰ ترین

درجہ اس نبی کا ہوتا ہے جس پر تمام یا اکثر حقائق کسی اکتساب یا ادنیٰ تکلف کے بغیر فضل الٰہی سے منکشف ہو جائیں یہی سعادت بندہ کو اللہ سے قریب کرتی ہے' اس سے مکان و مسافت کے قربت مراد نہیں ہے' بلکہ یہ معنوی' حقیقی اور وصفی قربت ہے' ان درجات میں آگے بڑھنا اور کسی مقام پر ٹھہرنا راہ سلوک طے کرنے والوں کی منزلیں ہیں' ان منازل کی کوئی حد مقرر نہیں ہے' ہر سالک کو ان منزلوں کی خبر رہتی ہے جن سے وہ گزر کر آیا ہے' اگلی منزلوں کا حال اسے معلوم نہیں ہوتا' تاہم وہ ایمان بالغیب کے طور پر ان کی تصدیق کرتا ہے' جس طرح ہم نبی اور نبوت کی تصدیق کرتے ہیں حالانکہ نبوت کی حقیقت نبی کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہوتی نیز جس طرح پیٹ کے بچے کو دودھ پینے والے بچے کا حال' اور دودھ پینے والے کو اس بچے کا حال معلوم نہیں ہوتا جسے کچھ سمجھ آگئی ہو' اور تمیز دار بچے کو عقلمند انسان کا حال معلوم نہیں ہوتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کتنے علوم نظریہ حاصل کئے ہیں اسی طرح عاقل کو بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور اولیاء پر کیا کیا عنایات کی ہیں' اور کون کون سے اسرار منکشف کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا (پ ۲۲ ر ۱۳ آیت ۲)

اللہ جو رحمت لوگوں کے لیے کھول دے سو اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں۔

یہ رحمت باری تعالیٰ کے جود و کرم کے بموجب عام ہے' اس سلسلے میں کسی کے ساتھ بخل سے کام نہیں لیا جاتا' لیکن اس کا ظہور ان دلوں میں ہوتا ہے جو رحمت خداوندی کے جھونکوں کے منتظر رہتے ہیں' اور اپنے دل کے دروازے ان جھونکوں کی آمد کے لیے کھلے رکھتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

ان لربکم فی ایام دھرکم لنفحات الا فتعرضوا لھا (۱)

تمہاری زندگی کے ایام میں باری تعالیٰ کی رحمت کے بہت سے جھونکے ہیں تم ان کی تاک میں رہو۔

ان جھونکوں کے منتظر رہنے اور تاک میں لگے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ دل کو مذموم اخلاق سے حاصل ہونے والی کدورت اور گندگی سے پاک صاف رکھو' عنقریب اس اجمال کی تفصیل آئے گی' اسی جود و کرم کی طرف حسب ذیل حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے:

ینزل اللہ کل لیلة الی سماء الدنیا فیقول ھل من داع فاستجیب لہ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرۃ' ابو سعیدؓ)

اللہ تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ ہے کوئی دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا سنوں۔

حسب ذیل قدسی حدیثیں بھی اسی رحمت کا اعلان ہیں:

لقد طال شوق الابرار الی لقائی وانا الی لقاءھم اشد شوقا (۲)

نیکوں کو میری ملاقات کا شوق بہت ہے' اور مجھے ان کی ملاقات کا زیادہ اشتیاق ہے۔

من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرۃ)

جو شخص مجھ سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے میں اس سے ایک ہاتھ قریب آتا ہوں۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ قلوب کا علوم کے انوار سے محروم رہنا منعم حقیقی کی طرف سے کسی رکاوٹ یا بخل کی بنا پر نہیں ہے بلکہ وہ اپنے قلوب کی خباثت اور کدورت' اور غیر اللہ کے ساتھ اشتغال کی بنا پر ان انوار سے محروم رہتے ہیں' قلوب برتن کی طرح ہیں' جب تک برتن پانی سے لبریز رہتے ہیں ان میں ہوا کا گزر نہیں ہوتا اسی طرح غیر اللہ میں مشغول دلوں میں بھی معرفت الٰہی کی روشنی داخل

---

(۱) یہ روایت کتاب الصلوٰۃ میں بھی گزر چکی ہے

(۲) مجھے اس کی اصل نہیں ملی تاہم مسند الفردوس کے مصنف نے اسے حضرت ابو الدرداءؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے

نہیں ہوتی' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

لولا ان الشیاطین یحومون علی قلوب بنی آدم لنظروا إلی ملکوت السماء

(احمد۔ ابو ہریرہؓ)

اگر شیاطین بنی آدم کے دلوں کے گرد نہ پھرتے ہوتے تو وہ آسمان کے ملکوت کا مشاہدہ کرلیا کرتے۔

مختصر یہ کہ انسان کی خصوصیت علم اور حکمت سے وابستہ ہے' اور علوم میں سب سے افضل علم باری تعالیٰ کی ذات' صفات و افعال کا علم ہے' اس علم میں انسان کے کمال کا راز مضمر ہے' اور اسی کمال پر اس کی سعادت اور فلاح کا مدار ہے' اسی سے باری تعالیٰ کے جوار میں رہنے کی صلاحیت اور اس کے حضور میں حاضر ہونے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے۔ بدن نفس کی سواری ہے' اور نفس محل علم ہے اور علم ہی انسان کی زندگی کا مقصد اور اس کا امتیاز ہے' اسی مقصد کے لیے اس کی تخلیق عمل میں آئی ہے جس طرح گھوڑا بوجھ اٹھانے کی قوت میں گدھے کا شریک اور کرّوفر' حسن ہیئت اور سُرعتِ رفتار میں اس سے ممتاز ہے اسی طرح انسان کو بھی بعض چیزیں گدھے اور گھوڑے سے ممتاز کرتی ہیں' یہ خصوصیات ملائکہ مقربین کی صفات ہیں۔ انسان ملائکہ اور بہائم کے درمیان میں ایک مخلوق ہے' کیونکہ وہ غذا اور نشوونما کے لحاظ سے سبزہ ہے' حس و حرکت اور اختیار و فعل کے اعتبار سے حیوان ہے' صورت اور قامت کے لحاظ سے نقش بردیوار ہے' حقائق اشیاء کی معرفت کی خصوصیت اسی بہائم سے ممتاز کرتی ہے' جو شخص اپنے اعضاء اور قوی سے علم و عمل پر مدد لے وہ ملائکہ کے مشابہ ہے بلکہ اس کا مستحق ہے کہ اسے ملائکہ کے زُمرہ میں شمار کیا جائے' اور "ملک ربانی" کہا جائے جیسا کہ باری تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کا مشاہدہ کرنے والی عورتوں کی زبان سے اعتراف کرایا:

مَا هٰذَا بَشَرًا إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ (پ ۱۲ ر ۱۴ آیت ۳۱)

یہ شخص آدمی ہرگز نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔

جس شخص نے بدنی لذات کو اپنے فکر و عمل کا محور قرار دیا اور ان ہی کا ہو رہا وہ چوپایوں کی طرح ہے جن کا مقصد چرنے اور کھانے کے علاوہ دوسرا نہیں ہوتا' وہ ان بہائم میں داخل ہو کر یا تو بیل کی طرح بے وقوف ہوگا' یا خنزیر کی طرح حریص ہوگا' یا بلّی اور کتّے کی طرح غرّانے والا ہوگا یا اونٹ کی طرح کینہ پرور' چیتے کی طرح متکبر اور لومڑی کی طرح مکّار و عیّار بن جائے گا' اور اگر ان تمام صفات اور بہیمانہ خصائل کا جامع ہوا تو شیطان رجیم ہوگا۔

انسان کا کوئی ظاہری عضو' یا باطنی حس ایسی نہیں ہے جس سے وصل الی اللہ پر مدد نہ لی جاسکتی ہو' جیسا کہ کتاب الشکر میں اس کی تفصیل آئے گی' جس شخص نے اپنے اعضاء کا صحیح صحیح استعمال کیا اس نے کامیابی حاصل کی' اور جس نے حکم عدولی کیا اس نے نقصان اٹھایا' اور رسوائی حاصل کی۔ کمال سعادت' اور تمام فلاح یہ ہے کہ انسان لقاء خداوندی کو اپنا مقصد' آخرت کو اپنا مستقر' دنیا کو عارضی منزل' بدن کو سواری' اور اعضاء کو خدمت گزار سمجھے' اور اپنی قوت مدرکہ کو جس کا محل مملکت جسم کا وسط حصہ قلب ہے بادشاہ خیال کرے' اور مقدم دماغ میں قوتِ خیال کو بادشاہ کا پیغمبر سمجھے' کیونکہ محسوسات کی خبریں اس تک پہنچتی ہیں' اور قوتِ حافظہ ان کا مسکن بنتی ہے' اور خزانچی کی طرح حفاظت کرتی ہے' زبان اس کی ترجمان متحرک اعضاء اس کے محرّرین' اور حواسِ خمسہ اس کی مملکت کے جاسوس ہیں' اس میں سے ہر حاسہ اخبار کی تلاش اور ترسیل پر مقرر ہے' آنکھ کا کام رنگوں کی دنیا سے متعلق ہے' کان آواز کی دنیا اور ناک بو کی دنیا پر مقرر ہے۔ یہ سب حواس اپنی اپنی دنیا سے خبریں جمع کرتے ہیں اور انہیں قوتِ فکر و خیال تک پہنچاتے ہیں' قوتِ خیال جو در اصل قاصد ہے ان خبروں کو خازنِ شہر یعنی قوتِ حافظہ کے سُپرد کردیتی ہے' خازن انہیں بادشاہ سلامت کے گوش گزار کردیتا ہے' بادشاہ ان میں سے وہ خبریں منتخب کرلیتا ہے جو ملک کا نظام چلانے میں مفید ہوں' اور جن سے پیش آمدہ سفر پورا ہوسکے' مملکت کے دشمنوں کا قلع قمع ہوسکے' اور راستے کے لٹیروں سے نمٹایا جاسکے۔ اگر اعضاء کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنا اور انہیں ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مشغول رکھنا ہی سعادت ہے اور اسی میں باری تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بھی ہے۔ ان اعضاء کو غفلت میں مبتلا رکھنے والا شقی' بدبخت اور رسوا ہے۔ وہ خدا

تعالیٰ کی نعمتوں کا منکر ہے' اس نے لشکرِ الٰہی کو جو دشمنوں کے خلاف مدد حاصل کرنے کے لیے اسے دیا گیا تھا ضائع کیا' دشمنانِ خدا کو عزت دی اور حزبُ اللہ کو ذلت میں مبتلا کیا' انجام کار شدید ترین عذاب اور آخرت کی رُسوائی مستحق ہے۔ ہم آخرت کی رسوائی اور اس کے ہولناک عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

ہماری بیان کردہ مثال کی تائید حضرت کعب احبارؓ کی روایت سے ہوتی ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ انسان کی آنکھیں رہنما' اس کے کان محافظ' زبان ترجمان' ہاتھ لشکر' پاؤں قاصد اور قلب بادشاہ ہے' اگر بادشاہ اچھا ہو گا تو اس کے توابع بھی اچھے ہوں گے' انہوں نے فرمایا تم صحیح کہتے ہو' میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح سنا ہے۔ (۱) حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ نے قلب کی مثال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ قلوب زمین میں اللہ تعالیٰ کے برتن ہیں' ان میں سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ترین وہ ہے جو سب سے زیادہ نرم' صاف اور مضبوط ہے' قلب کی نرمی' صفائی اور مضبوطی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے لیے نرم ہو' یقین میں صاف ہو' اور دین میں سخت ہو' قرآن کریم کی اس آیت کا منشاء بھی یہی ہے:

أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ (پ۲۶ ر۱۲ آیت ۲۹)

وہ کافروں کے مقابلے میں تیز ہیں۔

حضرت اُبی بن کعب نے آیت کریمہ:

مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ (پ۱۸ ر۱۱ آیت ۳۵)

اس کے نور (ہدایت کی حالت عجیبہ) ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے اور اس میں ایک چراغ رکھا ہے۔

کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ مؤمن کے نور اور اس کے دل کی مثال ہے' اور یہ مثال:

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ (پ۱۸ ر۱۱ آیت ۴۰)

یا وہ ایسے ہیں جیسے بڑے گہرے سمندر کے اندرونی اندھیرے۔

منافق کے دل کی ہے۔ زید ابن اسلم نے قرآن کریم میں وارد لوحِ محفوظ کو مؤمن کا دل کہا ہے' اور حضرت سہیل تستری نے قلب و صدر کو عرش و کرسی سے تشبیہ دی ہے۔

جامع اوصافِ قلب اور اس کی مثالیں

جاننا چاہئے کہ انسان کی تخلیق و ترکیب میں چار چیزوں کی آمیزش ہے' اس لیے اس میں چار طرح کے اوصاف جمع ہیں یعنی سبعی' بہیمی' شیطانی اور ربّانی۔ اس حیثیت سے کہ اس پر غضب کا تسلط ہے وہ سباع کے افعال یعنی عداوت' بغض' مار پیٹ اور گالی گلوچ کا مرتکب ہوتا ہے اور اس حیثیت سے کہ اس پر شہوت کا غلبہ ہے وہ بہائم کے افعال یعنی حرص و ہوس اور طمع و حسد کا ارتکاب کرتا ہے اور اس لحاظ سے کہ وہ فی نفسہٖ امرِ ربّانی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ہے:

قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (پ۱۵ ر۱۰ آیت)

آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے۔

اپنے لئے ربوبیت کا دعویٰ کرتا ہے' اسے تعلّی' تکبّر' دوسروں پر برتری' تخصیص' اور انفرادیت پسند ہے' عبودیت تواضع اور محکومیت ناپسند ہے' اسی لحاظ سے وہ یہ چاہتا ہے کہ تمام علوم پر مطلع رہے علم کی طرف اپنی نسبت اسے محبوب ہے اور جہل کی طرف نسبت اسے

---

(۱) یہ روایت ابو نعیم نے طب نبوی میں' طبرانی نے مسند الشامیین میں' اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کی ہے

ناپسند ہے وہ حقائق امور کے احاطے اور علم و معرفت کے حصول کا دعویٰ کرتا ہے' حالانکہ تمام حقائق کا احاطہ اور مخلوق پر زبردستی کی برتری ربوبیت کے اوصاف ہیں' عبدیت کی صفت نہیں ہیں۔ انسان غضب اور شہوت میں سباع اور بہائم کے ساتھ اشتراک کے باوجود قوت تمیز رکھتا ہے اس لیے اس میں ایک وصف مزید ہے جسے شیطانیت کہہ سکتے ہیں' شیطان سَرتاپا شر ہے وہ اپنی تمییز کو شر کی صورتوں میں استعمال کرتا ہے' اور اپنی اغراض حاصل کرنے کے لیے مکر و فریب کا سہارا لیتا ہے' اور خیر کے محل میں شر کا بیج بوتا ہے' یہ شیاطین کے اوصاف ہیں' اور وہ لوگ بھی ان اوصاف میں شیاطین کے شریک ہیں جن میں ربانیت' شیطانیت' سبعیت اور بہیمیت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان چاروں اوصاف کا مرکز قلب ہے' گویا انسان کی کھال میں بیک وقت خنزیر' کتا' شیطان اور حکیم جمع ہیں۔ خنزیر شہوت کی علامت ہے۔ یہ ناپاک اور بدباطن جانور اپنے رنگ یا اپنی شکل و صورت کی بنا پر برا نہیں ہے بلکہ اپنی حرص و ہوس کی وجہ سے مذموم ہے' یہی حال کتے کا ہے جو غضب کی مجسم شکل ہے درندوں اور کتوں سے اس لیے نفرت نہیں کی جاتی کہ وہ درندے یا کتے ہیں' بلکہ ان سے نفرت کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سبعیت کی غایت یعنی درندگی' اور عداوت پائی جاتی ہے' اسی طرح انسان کے باطن میں درندوں کی درندگی' عداوت اور غضب اور خنزیر کی حرص اور طمع پائی جاتی ہے۔ درندہ غضب کو تحریک دے کر ظلم پر' اور خنزیر حرص کو ہوا دے کر فواحش کے ارتکاب پر اکساتا ہے۔ اور شیطان ان دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رکھتا ہے' کبھی حرص کو غضب کے خلاف اکساتا ہے' اور کبھی غضب کو حرص کی مخالفت میں بھڑکاتا ہے' نیز ان دونوں کی جبلی صفات کی تحسین کرتا ہے۔ عقل بمنزلہ حکیم کے ہے' اس کا کام یہ ہے کہ وہ شیطان کے مکر و فریب کو دفع کرے' اور اپنی گہری بصیرت اور واضح نور سے اس کی تلبیس کا قلع قمع کردے' اور خنزیر کی ہوس کو کتے کے غضب کے ذریعہ شکست دے' اس لیے کہ غضب سے شہوت ختم ہوتی ہے' اسی طرح خنزیر کو کتے پر مسلط کرکے اس کی درندگی کا خاتمہ کرے اور کتے کو اپنی حکمت و تدبیر سے پابہ زنجیر اور مطیع رکھے' اگر اس نے ایسا کیا تو جسم کی مملکت میں عادلانہ نظام باقی رہے گا' اور تمام اعضاء اپنے اپنے محور پر گردش کریں گے' اگر حکیم اپنی کوشش میں ناکام رہا' نہ شیطان سے ٹکر لے سکا' اور نہ خنزیر اور کتے کو مقہور کرسکا تو یہ تینوں خود اس پر غالب آجائیں گی اور اسے اپنی سخت زنجیروں میں اسی طرح جکڑلیں گی کہ کوشش کے باوجود آزاد نہ ہوسکے گا' بلکہ تاعمر ان کی خدمت گزار اور مطیع رہے گا' اکثر لوگ اسی قید کی زندگی گزار رہے ہیں' ان کی تمام تر جدوجہد شکم و فرج کی شہوت ہے' حیرت اس وقت ہوتی ہے جب یہی لوگ بُت پرستوں کو اپنی ملامت کا ہدف بناتے ہیں اور ان کی بُت پرستی کا مذاق اڑاتے ہیں' اگر ان کی آنکھوں سے غفلت کے دبیز پردے اٹھائے جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ خود غیراللہ کی اطاعت میں مصروف ہیں' کبھی وہ خنزیر کے سامنے سربسجود ہیں' اور کبھی کتے کے سامنے رکوع اور قیام کی حالت میں ہیں' ان کی خواہشات کی تکمیل ان کا ایمان ہے' اور ان کے چشم و ابرو کے اشاروں کا منتظر رہنا ان کا عمل۔ ایسے لوگوں کے سامنے اگر ان حقائق کو مجسم کردیا جائے تو وہ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں کہ بُت پرستوں میں اور ان میں کیا فرق ہے' بُت پرست بے جان پتھروں کے سامنے سر جھکا کر شیطان کو خوش رکھتے ہیں اور وہ لوگ ان ناپاک اور گندے جانوروں کی عبادت کرکے شیطان کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں یہ شیطان ہی تو ہے جو خنزیر اور کتے کو برا نگیختہ کرتا ہے اور انہیں انسان سے خدمت لینے پر اکساتا ہے' حقیقت یہ ہے کہ خنزیر اور کتے کے چشم و ابرو کے اشاروں پر ناچنے والے شیطان کے دام فریب میں گرفتار ہیں۔

ہر بندۂ خدا کو چاہیے کہ وہ اپنی حرکات و سکنات' اپنے نطق و سکوت اور قیام و قعود کا نگراں رہے' اور بصیرت کی آنکھیں کھلی رکھے' اگر اس نے انصاف کے ساتھ اپنے احوال پر نظر ڈالی تو اسے معلوم ہوگا کہ وہ اپنا دن خدائے برحق کی اطاعت میں گزارتا ہے' یا نفس کی پرستش میں؟ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ان نفس پرستوں نے مالک کو مملوک' آقا کو غلام' اور غالب کو مغلوب بنادیا ہے' غلبہ اور سیادت کا حق عقل کو تھا' خنزیر' کتے اور شیطان نے اس کا حق چھین لیا' اور اسے مغلوب و مقہور کردیا' عقل سیادت سے محروم ہوجاتی ہے تو ان تینوں اوصاف کی اطاعت رنگ لاتی ہے' اور قلب پر وہ صفات محیط ہوجاتی ہیں جن کا انجام ہلاکت اور رسوائی کے علاوہ کچھ نہیں ہے' شہوت کے خنزیر کی اطاعت سے بے حیائی' خباثت' اِسراف' بخل' ریاء' ہتک' بے ہودگی' حرص' ہوس' خوشامد' حسد' کینہ' اور شماتت وغیرہ

اوصاف پیدا ہوتے ہیں، غضب کے کتے کی اطاعت کے نتیجے میں تہور، تعلی، خود ستائی، کبر، خود پسندی، استہزاء، اور تحقیر، ارادۂ شر، اور خواہش ظلم جیسی صفات پیدا ہوتی ہیں، غضب اور شہوت کے "معبودوں" کی اطاعت دراصل شیطان کی اطاعت ہے، جس سے مذکورہ بالا رذائل کے علاوہ مکر و فریب، حیلہ جوئی، دغابازی، تلبیس، خیانت، دنائت، اور فحش کلامی جیسے اوصاف کو بھی تحریک ملتی ہے۔ اگر صورت حال اس کے برعکس ہو، اور شر کے یہ تمام سرچشمے اور محرکات ربانی صفت کی حکمت عملی سے زیر ہو جائیں تو قلب میں ربانی اوصاف علم، حکمت، یقین، حقائق اشیاء کا احاطہ، امور کی معرفت، علم اور بصیرت کی قوت کے ذریعہ دوسروں پر غلبہ، کمال علم کی بنا پر مخلوق پر برتری کا استحقاق جیسے ربانی اوصاف قلب کا احاطہ کرلیتے ہیں، شہوت اور غضب کی اطاعت کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ شہوت کے خنزیر کو اس کی حدود میں قید رکھنے سے عفت، قناعت، طمانینت، زہد، ورع، تقویٰ، انبساط، حیاء، حسن صورت، خوش خلقی اور غضب کے کتے کو پابہ زنجیر رکھنے سے شجاعت، کرم، عظمت، ضبط نفس، صبر، حلم، عفو، ثبات قدمی، اور شرافت جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں، قلب آئینے کی طرح ہے، غضب شہوت اور شیطان کی اطاعت اس آئینے کی آب و تاب پر اثر انداز ہوتی ہے، اور آدمی اپنے چہرہ کا عکس صاف نہیں دیکھ پاتا، اوصافِ حمیدہ سے آئینۂ قلب کی تب و تاب میں اضافہ ہوتا ہے، اور چمک دمک بڑھتی ہے، یہاں تک کہ اس میں حق جلوہ گر ہو جاتا ہے، اور امر مطلوب کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے، اس حدیث شریف میں ایسے ہی صاف شفاف اور روشن دل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

اذا اراد اللہ لعبد خیرا جعل لہ واعظا من قلبہ (دیلمی۔ ام سلمہ)

اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کے سلسلے میں خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک ناصح پیدا کردیتا ہے۔

ایک حدیث میں یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں واعظ ناصح کا وجود ہوتا ہے اس دل کی حفاظت کے لیے باری تعالیٰ کی طرف سے ایک نگہبان مقرر رہتا ہے۔ (۱) ایسا ہی دل ذکر الٰہی کا مستقر ہوتا ہے، اور اس ذکر سے تسکین پاتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (پ ۱۳ ر ۱۰ آیت ۲۸)

خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے۔

اخلاق مذمومہ کا اثر آئینہ دل پر ایسا ہوتا ہے جیسے دُھواں آئینہ کی صاف و شفاف سطح کو بے آب اور بد رونق کردیتا ہے، دل کا آئینہ گناہوں کی تاریکی سے تاریک ہو جاتا ہے، یہ تاریکی ایک طرح کا حجاب ہے، جو بندہ اور باری تعالیٰ کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، اسی پردے کا نام طبع (مہر) اور رین (زنگ) ہے، قرآن کریم میں ایسے ہی دلوں کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۱۴)

ہرگز ایسا نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال (بد) کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔

اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (پ ۹ ر ۳ آیت ۱۰۰)

اگر ہم چاہتے تو ان کو ان کے جرائم کے سبب ہلاک کر ڈالتے اور ہم ان کے دلوں پر بند لگائے ہوئے ہیں اس سے وہ سنتے نہیں ہیں۔

دوسری آیت میں نہ سننے کو قلوب پر مہر لگ جانے سے تعبیر کیا ہے، ایک جگہ سننے کو تقویٰ کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا (پ ۷ ر ۴ آیت ۱۰۸)

اور اللہ سے ڈرو اور سنو۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (پ ۳ ر ۷ آیت ۲۸۲)

---

(۱) اس روایت کی کوئی اصل مجھے نہیں ملی

اور خدا سے ڈرو اور اللہ تعالیٰ تم کو تعلیم فرماتا ہے۔

جب گناہ زیادہ ہوتے ہیں تو دل پر مہر لگ جاتی ہے' وہ ادراک حق' اور اصلاح حال کی ہر صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے' آخرت کا معاملہ اس کے نزدیک اہم نہیں رہتا' دنیاوی شان و شوکت اس کے لیے سب کچھ ہو جاتی ہے' وہ دنیاوی مال و دولت کا حریص ہو جاتا ہے' اور اپنی تمام تر توانائی اس کے حصول میں صرف کر دیتا ہے' آخرت کی باتیں اس کے کانوں کے قریب سے دل و دماغ میں اثر انداز ہوئے بغیر اس طرح گزر جاتی ہیں جس طرح ہوا گزر جاتی ہے' غلطیوں کے تدارک اور گناہوں سے توبہ کی ہر توفیق سلب کر لی جاتی ہے' ایسے لوگوں کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے:

قَدْ يَئِسُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ (پ ۲۸ ر ۸ آیت ۱۳)

وہ آخرت (کے ثواب سے) ایسے ناامید ہو گئے ہیں جیسے کفار جو قبروں میں (مدفون) ہیں ناامید ہیں۔

قرآن کریم اور حدیث شریف میں قلب کی جس سیاہی کا ذکر آیا ہے اس سے یہی حالت مراد ہے' میمون ابن مہران کہتے ہیں کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کی دل کی سطح پر ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے اگر وہ اس گناہ سے باز آجائے اور رب کریم کے حضور صدق دل کے ساتھ توبہ کر لے تو یہ نقطہ مٹ جاتا ہے' اور دل اپنی سابقہ حالت پر آجاتا ہے' اور اگر اس گناہ کا اعادہ کرے یا دوسرے گناہوں کا مرتکب ہو تو اس نقطہ کی سیاہی اور حجم دونوں میں اضافہ ہو جاتا ہے' یہاں تک کہ یہ سیاہ نقطہ پورے دل کا احاطہ کر لیتا ہے یہی سیاہی ران (زنگ) ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ أَجْرَدُ فِيهِ سِرَاجٌ يَزْهَرُ وَقَلْبُ الْكَافِرِ أَسْوَدُ مَنْكُوسٌ (احمد' طبرانی۔ ابوسعید)

مؤمن کا دل صاف ہوتا ہے اس میں چراغ روشن ہوتا ہے' اور کافر کا دل سیاہ اور اوندھا ہوتا ہے۔

باری تعالیٰ کی اطاعت' اور شہوات نفس کی مخالفت قلب کے لیے صیقل کا کام دیتی ہے' اور گناہ اسے اندھیری رات کی طرح سیاہ کر دیتے ہیں' گناہ کے بعد نیک عمل کرنے سے قلب تاریک تو نہیں رہتا لیکن اس کے نور میں کمی آجاتی ہے' جیسے آئینہ کو گرم سانس لگایا جائے پھر صاف کیا جائے پھر گرم سانس سے اس کی سطح آلودہ کی جائے پھر صاف کی جائے تو اس کی چمک دمک میں کچھ نہ کچھ کمی باقی ضرور رہ جائے گی' اور اس آلودگی کے اثرات پورے طریقے پر نہیں مٹ سکیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلب کی چار قسمیں فرمائیں ہیں:

القلوب اربعة' قلب اجرد فيه سراج يزهر' فذالك قلب المؤمن' وقلب اسود منكوس فذالك قلب الكافر' وقلب اغلف مربوط على غلافه فذالك قلب المنافق' وقلب مصفح فيه ايمان ونفاق' فمثل الايمان فيه كمثل البقلة يمدها الماء الطيب' ومثل النفاق كمثل القرحة يمدها القيح والصديد فاى المادة غلبت عليه حكم له بها وفى روايةذهبت به (مسند احمد' طبرانی صغیر۔ ابو سعید الخدریؓ)

دل چار طرح کے ہوتے ہیں' ایک وہ دل ہے جو صاف ہو اس دل میں چراغ روشن رہتا ہے' یہ مؤمن کا دل ہے' ایک دل سیاہ اور الٹا ہوا ہوتا ہے یہ کافر کا دل ہے' ایک دل غلاف میں لپٹا ہوا ہوتا ہے' اور اس غلاف کا منہ بندھا ہوا ہوتا ہے یہ منافق کا دل ہے' ایک دل وہ ہے جس میں ایمان اور نفاق دونوں ہوں ایسے دل میں ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے سبزہ کہ اسے پاک پانی سے نشوونما ملتی ہے' اور نفاق کی مثال ایسی ہے جیسے زخم کہ اسے پیپ اور گندہ مواد بڑھاتا ہے اب جو مادہ بھی غالب آجائے دل پر اسی کا حکم لگے گا ایک روایت میں ہے کہ دل کو وہی مادہ لے جائے گا۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں:
اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (پ ۹ ر ۱۴ آیت ۲۰۱)

یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ قلب کی جلا اور بصیرت و آگہی اللہ کے ذکر سے حاصل ہوئی ہے اور ذکر وہی لوگ کرتے ہیں جو تقویٰ کے وصف سے مزین ہوں، معلوم ہوا کہ تقویٰ ذکر کا دروازہ ہے، ذکر سے کشف ہوتا ہے، اور کشف فوزِ اکبر (سب سے بڑی کامیابی) یعنی لقاء رب کا وسیلہ ہے۔

علوم کے تعلق سے دل کی مثال

جاننا چاہئے کہ علم کا محل قلب ہے، یعنی وہ لطیفہ ہے جو تمام اعضاء کا نظام چلاتا ہے، تمام اعضاء اس لطیفے کے خدمت گزار اور فرمانبردار ہیں، حقائق معلومات کے تعلق سے قلب کی مثال ایسی ہے جیسے محسوس صورتوں کے تعلق سے آئینہ ہے۔ آئینے میں ہر محسوس چیز کی صورت کا عکس ابھر آتا ہے، اسی طرح ہر معلوم چیز کی حقیقت آئینۂ دل میں نقش ہوجاتی ہے، جس طرح آئینہ الگ چیز ہے، محسوسات کی صورتیں الگ چیزیں ہیں، اور ان صورتوں کا آئینے میں معکوس ہونا الگ امر ہے اسی طرح دل کے سلسلے میں بھی یہ فرق موجود ہے، اور آئینے کی طرح یہاں بھی تین چیزیں ہیں، دل، حقائق اشیاء، اور نفس حقائق کا دل میں آنا۔ عالم قلب ہے، اس میں حقائق اشیاء کی صورتیں حلول کرتی ہیں، معلوم حقائق اشیاء ہیں، اور علم ان اشیاء کی صورتوں کا آئینۂ قلب میں منعکس ہونے کا نام ہے۔ جس طرح مثلاً تلوار پکڑنے کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے، قابض (پکڑنے والے) ہاتھ کی، مقبوض (پکڑی جانے والی) تلوار کی، اور گرفت کی (یعنی ہاتھ اور تلوار کے ملنے کی) اس طرح معلوم کا دل میں پہنچنا علم کہلاتا ہے۔ بعض اوقات حقائق بھی موجود ہوتے ہیں، اور قلب کا بھی وجود ہوتا ہے، لیکن علم حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ علم حقیقت کے قلب تک پہنچنے کا نام ہے، جس طرح تلوار اور ہاتھ الگ الگ موجود ہوتے ہیں لیکن قبض (گرفت) نہیں پائی جاتی، اس لیے کہ گرفت میں ہاتھ کا تلوار تک پہنچنا ضروری ہے، البتہ گرفت اور علم میں اتنا فرق ہے کہ گرفت میں تلوار بعینہ ہاتھ میں آجاتی ہے، جب کہ حقیقت بعینہ دل میں نہیں آتی، ایک شخص آگ کا علم رکھتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خود آگ اس کے دل میں موجود ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ آگ کی وہ حقیقت دل میں موجود ہے جو اس کے ظاہری وجود کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے اسی لیے دل کو آئینے سے تشبیہ دی گئی ہے کیوں کہ کوئی چیز بعینہ اس میں نہیں سماتی، بلکہ اس کا عکس ابھرتا ہے جو اس کے حقیقی وجود کے مطابق ہوتا ہے۔

<u>قلب کی آئینے سے مشابہت</u>: یہ زیادہ بہتر ہے کہ دل کو آئینہ کے ساتھ تشبیہ دی جائے، ایک وجہ تو وہی ہے جو گذشتہ سطور میں بیان کی گئی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح بعض وجوہات سے آئینے میں شکل نہیں ابھرتی اسی طرح بعض حالات میں آئینۂ دل بھی حقائق اشیاء کے علم سے محروم رہتا ہے، آئینے میں کسی چیز کی شکل نہ ابھرنے کی پانچ وجوہات ہیں، ایک تو یہ کہ آئینہ ہی اچھا نہ ہو، مثلاً یہ کہ وہ لوہے کا ہو، یا اس کے جوہر میں نقص ہو، یا اس کی شکل صحیح نہ ہو، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں کسی وجہ سے کدورت آگئی ہو، یا زنگ لگ گیا ہو، اور اس کی تاب ختم ہو گئی ہو، تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ چیز جس کا آئینہ میں عکس پڑے آئین کی حدود سے دور ہو، مثلاً یہ کہ وہ آئینے کے پیچھے ہو، چوتھی وجہ یہ ہے کہ آئینے اور صورت کے درمیان کوئی حجاب آجائے، پانچویں وجہ یہ ہے کہ جس چیز کی صورت آئینے میں دیکھنی ہے اس کی جہت معلوم نہ ہو کہ آئینے کو اس کی سمت میں رکھ دیا جائے اور وہ صورت منعکس ہوجائے، یہی حال آئینہ

قلب کا ہے' اس میں تمام امور حق منکشف ہوسکتے ہیں لیکن بہت سے قلوب میں یہ علوم نہیں آپاتے' اس کے بھی پانچ اسباب ہیں' ایک یہ کہ خود قلب ناقص ہو' جیسے بچے کا قلب اس کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ اس میں معلومات منکشف ہوں' دوسرے یہ کہ قلب معاصی کی کدورت' اور شہوات کے خبث سے آلودہ ہوجائے' اور صفائی جاتی رہے' چمک ختم ہوجائے' تاریک قلب میں حق بات ظاہر نہیں ہوتی' حدیث شریف میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' فرمایا:

من قارف ذنبا فارقه عقل لا يعود اليه ابدا (۱)

جو شخص گناہ کرتا ہے اس کی عقل جدا ہوجاتی ہے اور کبھی واپس نہیں آتی۔

یعنی مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں گناہوں کی وہ کدورت اور خباثت پیدا ہوجائے گی جو کبھی زائل نہ ہوگی' اور جس کا کبھی تدارک نہ ہوسکے گا' یہ صحیح ہے کہ گناہ کے بعد نیکی کرنے سے اس کا اثر ختم ہوجاتا ہی لیکن کیا دل اپنی اسی حالت پر واپس آجاتا ہے جس پر وہ گناہ سے پہلے تھا' ہرگز نہیں' حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ شخص نیکی ہی نیکی کرتا کسی گناہ کا ارتکاب نہ کرتا تو اس کے دل کو نور زیادہ ہوتا' نور کا زیادہ ہونا بلاشبہ ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہے' چنانچہ زنگ آلود آئینہ صیقل کیا جاتا ہے اور اس کی چمک لوٹ آتی ہے لیکن کیا صیقل کیا ہوا آئینہ صفائی اور چمک دمک میں اس آئینہ کا مقابلہ کرسکتا ہے جس پر کبھی زنگ ہی نہ لگا ہو۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور شہوات کے تقاضوں سے انحراف دل میں جلا پیدا کرتا ہے' اور اسے گناہوں کی کدورتوں سے پاک کرتا ہے' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (پ ۲۱ ر ۳ آیت ۶۹)

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے (قرب و ثواب) کے راستے ضرور دکھلائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

من عمل بما علم ورثه الله علم مالم يعلم (ابو نعیم فی الحلیہ۔ انس)

جو شخص علم کے بموجب عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ان چیزوں کا علم عطا فرماتے ہیں جو اسے معلوم نہ ہوں۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ اس کا دل حقیقت مطلوبہ کی جہت سے منحرف ہو' مثلاً ایک شخص نیک ہے' اور حق تعالیٰ کے احکام پر عمل پیرا ہے' اس کا دل اپنی نیکی اور اطاعت کی بنا پر صاف بھی ہے لیکن اس میں حق منکشف نہیں ہوتا کیوں کہ وہ طالب حق نہیں ہے' وہ اپنی تمام تر ہمتیں بدنی طاعات اسباب معیشت کے جمع و حصول میں صرف کرتا ہے' باری تعالیٰ کی ربوبیت' اور تجلی الٰہی حقائق میں غور و فکر کرنا اس کا شیوہ نہیں ہے' ایسے شخص کے دل میں حق کا جلوہ ظاہر نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف وہی امور منکشف ہوتے ہیں جن میں وہ عام طور پر غور و فکر کرتا ہے' مثلاً اگر وہ اعمال کی آفتوں' اور نفس کے عیوب میں تأمل کرتا ہے تو اس پر یہی آفات اور عیوب منکشف ہوجاتے ہیں' معیشت کے مصالح میں غور کرتا ہے تو اس پر یہی مصالح ظاہر ہوجاتی ہیں' غور کیجئے جب تنہا اعمال' اور بدنی طاعات کی قید جلوۂ حق کے ظہور سے مانع ہے تو نفس کی شہوات و لذات' اور دنیوی علائق و روابط کشف حقیقت کی راہ میں رکاوٹ کیوں نہ ہوں گے۔ چوتھا سبب حجاب ہے' یہ حجاب انکشاف حق کے لیے مانع بن جاتا ہے' مثلاً بعض اوقات شہوات پر قابو رکھنے والا مطیع و عبادت گذار بندہ حقائق میں غور و فکر کرنے کے باوجود ادراک حقیقت سے محروم رہ جاتا ہے' اور یہ محرومی کسی ایسے اعتقاد کے باعث ہوتی ہے جو آباء و اجداد کی تقلید کے طور پر بچپن سے ذہن میں راسخ رہا ہے' یہ اعتقاد ہر اس امر کے لیے مانع بن جاتا ہے جو اس کے خلاف ہو یہ وہ حجاب ہے جس کے باعث بہت سے متکلمین' اور مذہبی عصبیت رکھنے والے اہل علم' بلکہ بہت سے وہ صلحاء جن کی فکر کا محور زمین و آسمان کے ملکوت رہتے ہیں امر حق کے ادراک سے محروم رہ جاتے ہیں' کیونکہ تقلیدی اعتقادات ان کے دل و دماغ میں اس طرح راسخ ہوجاتے ہیں کہ مخالف

---

(۱) مجھے اس روایت کی کوئی اصل نہیں ملی

اعتقادات قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی خواہ وہ مخالف اعتقادات حق ہی کیوں نہ ہوں' اسی طرح یہ تقلیدی اعتقادات ان کے حق میں ادراک حق سے مانع اور حجاب بن جاتے ہیں۔ پانچواں سبب یہ ہے کہ وہ جہت ہی معلوم نہ ہو جہاں مطلوب حاصل ہو سکتا ہے۔ طالب علم کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ مطلوب کے مناسب معلومات کے علم کے بغیر کسی مجہول کا علم حاصل کر سکے' پھر مناسب معلومات کا علم ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ انہیں اس خاص ترتیب پر رکھنا بھی ضروری ہے جو علماء کے یہاں معتبر سمجھی جاتی ہے' غیر فطری مطلوبہ علوم کا شکار اور دوسرے معلومات کے "جال" ہی کے ذریعہ ممکن ہے ہر علم کے لیے ضروری ہے کہ اس سے پہلے دو علم ہوں' اور ان میں مخصوص ترتیب اور علاقہ قائم ہو جس کے نتیجے میں تیسرا علم وجود میں آئے جس طرح بچہ نر اور مادہ کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے' پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دونوں علم ایک دوسرے کے مناسب ہوں اور فطری طور پر ایک دوسرے سے قربت رکھتے ہوں' چنانچہ اگر کوئی شخص گھوڑی اور اونٹ کے ملاپ سے گھوڑے کا بچہ حاصل کرنا چاہے تو اسے مایوس ہونا پڑے گا' اس کے لیے گھوڑی اور گھوڑے کا ملنا ضروری ہے' اونٹ پھر اونٹ ہے انسان بھی یہ ضرورت پوری نہیں کر سکتا' اس طرح ہر علم کے دو مخصوص اصول ہیں اور ان کے ازدواج (ملاپ) کا ایک مخصوص طریقہ ہے' اس طریقہ پر عمل پیرا ہونے کے بعد ہی مطلوبہ علم حاصل کیا جاسکتا ہے ان اصولوں سے' اور ان کے طریق ازدواج سے ناواقفیت ہی علم کی راہ میں مانع بنتی ہے' چنانچہ آئینے کی مثال میں ہم نے بیان کیا ہے کہ اگر اس چیز کی جہت کا علم نہ ہو جس کا عکس مطلوب ہے تو آئینہ میں اس کی شکل نظر نہیں آئے گی' اور مقصد پورا نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک شخص آئینے میں اپنی گدی دیکھنا چاہتا ہے' لیکن اس نے آئینہ چہرہ کے سامنے رکھا ہے' ظاہر ہے اس طرح گدی نظر نہیں آسکتی جو مطلوب ہے' غیر مطلوب یعنی چہرہ نظر آسکتا ہے اسی طرح آئینہ اگر گدی کے پیچھے کرلیتا تب بھی گدی نظر نہ آتی بلکہ آئینہ ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتا' گدی دیکھنے کے لیے ایک اور آئینہ کی ضرورت ہے' اور اس دوسرے آئینے کو نگاہوں کے سامنے اس طرح رکھنے کی ضرورت ہے کہ دوسرا آئینہ بھی اس میں نظر آئے' اس صورت میں یہ شخص اپنی گدی دیکھ سکتا ہے' کیونکہ اس گدی کا عکس پہلے آئینے میں پڑے گا اور اس عکس کا عکس دوسرے آئینے میں نظر آئے گا' یہی مشکلات علوم میں پیش آتی ہیں بلکہ بعض اوقات ان سے کہیں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے' روئے زمین پر ایسے افراد کا وجود نہیں جو ان تمام مشکلات کا مقابلہ کر سکیں یہی وجہ ہے کہ بہت سے حقائق اور بہت سی معلومات تشنۂ ادراک رہ جاتی ہیں۔ یہ چند اسباب ہیں جو معرفت حقائق کی راہ میں قلوب کے لیے رکاوٹ بن جاتے ہیں' ورنہ ہر دل فطری طور پر اس کی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ حقائق کی معرفت حاصل کر سکے کیونکہ یہ ایک امر ربانی ہے' اور عالم کے تمام جواہر سے ممتاز ہے' اس کے فضل و شرف کا اندازہ باری تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتا ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ (پ ۲۲ ر ۶ آیت ۷۲)

ہم نے یہ امانت آسمان و زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی' سو انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔

اس آیت میں انسان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ ہے جس کے باعث وہ آسمان' زمین' اور پہاڑ جیسی بلند' وسیع اور مضبوط مخلوقات سے ممتاز ہوا' اور باری تعالیٰ کی امانت کا بار سنبھالنے کا اہل قرار پایا۔ یہ توحید اور معرفت کی امانت تھی' ہر شخص فطری طور پر اس امانت کا بار سنبھالنے کی صلاحیت رکھتا ہے' لیکن مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر ان کی ہمتیں جواب دیتی ہیں' اور وہ یہ بوجھ اٹھا نہیں پاتے' چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

كل مولود يولد على الفطرة فابواه يهودانه وينصرانه ويمجسانه (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے' پھر اس کے والدین اسے یہودی نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں کہ "اگر شیاطین بنی آدم کے دلوں کے ارد گرد نہ گھومتے تو وہ آسمانی ملکوت کا مشاہدہ کرلیا کرتے" ایسے ہی بعض اسباب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو قلب اور ملکوت کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ سے کسی شخص نے اللہ کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کہاں ہے آسمان میں یا زمین میں؟ فرمایا اللہ اپنے مؤمن بندوں کے دلوں میں ہے' حدیث میں ہے:

لم یسعنی ارضی ولا سمائی ووسعنی قلب المؤمن اللین الوادع (۱)

میری گنجائش نہ زمین میں ہے نہ آسمان میں' میری گنجائش مؤمن کے نرم اور پُر سکون دل میں ہے۔
حدیث شریف میں ہے:

قیل یا رسول اللہ من خیر الناس' فقال کل مؤمن مخموم القلب' فقیل وما مخموم القلب' فقال: هو التقی النقی الذی لا غش فیہ' ولا بغی ولا غدر ولا غل ولا حسد (ابن ماجہ۔ عبد اللہ ابن عمرؓ)

عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! بہترین آدمی کون ہے؟ فرمایا: ہر وہ مؤمن جو مَخمُومُ القلب ہو' عرض کیا گیا: مخمومُ القلب کسے کہتے ہیں؟ فرمایا کہ ایسا متقی اور صاف ستھرا ہو کہ نہ اس میں کھوٹے پن کا میل ہو نہ سرکشی ہو' نہ خیانت فریب اور حسد ہو۔

اسی لیے حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ میرے دل نے خدا کو جب بھی دیکھا تقویٰ کی وجہ سے حجاب اُٹھ گیا' اور جس شخص کے دل اور باری تعالیٰ کے درمیان سے حجاب اُٹھ جاتا ہے وہ ملک اور ملکوت کا مشاہدہ کرتا ہے' اور اس جنت کو دیکھتا ہے جس کے بعض حصہ کا عرض زمین و آسمان کے عرض کے برابر ہو' جہاں تک دوسری جنت کا تعلق ہے وہ آسمان و زمین کی وسعتوں میں نہ سمانے کے باوجود محدود اور متناہی ہیں لیکن قلب جس جنت کا مشاہدہ کرتا ہے وہ ملک اور ملکوت کی جنت ہوتی ہے جس کے طول و عرض کی کوئی حد کوئی انتہا نہیں' ہاں قلب میں ان کی جس قدر مقدار آتی ہے وہ البتہ متناہی اور محدود ہوتے ہیں' لیکن اگر انہیں علم الٰہی کے نقطۂ نظر سے دیکھو تو وہ ایسا عالم ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے' اگر عالم ملک اور عالم ملکوت کا بیک وقت نام لیا جائے تو اسے حضرت ربوبیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے' اس لیے کہ ربوبیت تمام موجودات کا احاطہ کئے ہوئے ہے' خدا کے علاوہ جو کچھ موجود ہے وہ اس کے افعال ہیں' یا اس کا ملک ہے یا بندے ہیں' انسان کے قلب پر ان موجودات میں سے جو کچھ وارد ہوتا ہے بعض لوگوں کے نزدیک وہی موجودات بعینہٖ جنت ہیں' مگر اہل حق کے نزدیک یہ بعینہٖ جنت نہیں ہے بلکہ جنت کے استحقاق کا سبب ہے' اور جنت میں اس کے ملک کی وسعت معلومات کی وسعت کے بقدر ہوگی' یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات اور افعال میں سے اسے جس قدر معلوم ہوگا اسی قدر اس کی جنت بھی وسیع ہوگی' اطاعات اور اعمال کا مقصد یہ ہے کہ دل کی سطح آئینہ کی طرح صاف شفاف ہوجائے اور اس میں کسی طرح کی آلودگی باقی نہ رہے' اور تزکیۂ قلب کا مقصد یہ ہے کہ اس میں ایمان کا نور اور معرفت کی چمک آجائے۔ ان دونوں آیتوں میں یہی نور ایمان اور ضیائے معرفت مراد ہے:

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (پ ۸ ر ۲ آیت ۲۵)

سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ رستے پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کردیتے ہیں۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (پ ۲۳ ر ۱۷ آیت ۲۲)

(۱) مجھے اس روایت کی کوئی اصل نہیں ملی' البتہ طبرانی میں ابوعتبہ کی حدیث کا کچھ حصہ اس طرح ہے۔ انیۃ ربکم قلوب عبادہ الصالحین واحبها الیہ الینها وارقها

سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے پروردگار کے (عطا کئے ہوئے) نور پر ہے۔

تجلّی اور ایمان کے مراتب : اس تجلّی اور ایمان کے تین مراتب ہیں' پہلا مرتبہ عوام کے ایمان کا ہے یہ خالص تقلیدی ایمان ہوتا ہے دوسرا مرتبہ متکلمین کے ایمان کا ہے' اس میں تقلید کے ساتھ حجت اور دلیل بھی ہوتی ہے یہ مرتبہ عوام کے ایمان سے قریب ہے' تیسرا مرتبہ عارفین کے ایمان کا ہے' یہ ایمان نور یقین سے دریافت ہوتا ہے۔ ان مراتب کی وضاحت کے لیے ہم ایک مثال بیان کرتے ہیں' اور وہ مثال یہ ہے کہ گھر میں زید کے وجود کی تصدیق تین طریقوں پر ہوسکتی ہے' ایک یہ کہ تمہیں اس کے وجود کی خبر کسی ایسے شخص سے ملے جس کی صداقت آزمودہ ہو'

اور اس کی طرف کذب بیانی کی نسبت نہ ہوتی ہو' اور نہ وہ اپنے کسی قول میں متہم قرار دیا جاتا ہو' ایسے شخص کی خبر سن کر تم مطمئن ہوجاتے ہو' اور یہ یقین کرلیتے ہو کہ زید واقعتہً گھر میں ہے' یہ مثال عوام کے ایمان کی ہے' یہ ایمان محض تقلید پر مبنی ہوتا ہے' عوام کا حال یہ ہے کہ جب بچہ سن شعور کو پہنچتا ہے تو باری تعالیٰ کے وجود' علم' قدرت وغیرہ صفات' انبیاء کی بعثت' اور ان کے لائے ہوئے احکام کے متعلق جو کچھ وہ اپنے والدین اور اساتذہ سے سنتے ہیں اسے کسی تردد کے بغیر قبول کرلیتے ہیں' اور یہ اعتقادات ان کے ذہن میں کچھ اس طرح راسخ ہوجاتے ہیں کہ ان کے خلاف کا تصور بھی دل میں نہیں گذرتا' کیونکہ وہ اپنی والدین اور اساتذہ کی صداقت کے متعلق حسن ظن رکھتے ہیں اس لیے انہیں ان کی خبروں پر یقین کرنے میں کوئی تأمّل نہیں ہوتا۔ اس طرح کا ایمان اُخروی نجات کا باعث ضرور ہے' لیکن ایسے مؤمنین اصحاب یمین کے ادنیٰ درجے میں رہتے ہیں ان کا شمار مقربین میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ تقرّب کے لیے ضروری ہے کہ دل کشف و بصیرت اور یقین کے نور سے روشن ہو' اور یہ بات تقلیدی ایمان میں نہیں پائی جاتی' علاوہ ازیں ان اعتقادات میں غلطی کا امکان بھی ہے جو محض سن کر ذہن نشین کرلیے جاتے ہیں' چنانچہ یہود و نصاریٰ نے اپنے والدین سے وہ عقائد وراثت میں حاصل کئے جن کے باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے' کیونکہ وہ عقائد اصلاً غلط تھے' مسلمانوں کے اعتقادات حق ہیں اس لیے نہیں کہ وہ ان کی حقانیت پر مطلع ہیں بلکہ اس لیے کہ ان کے دلوں میں حق بات ہی ڈالی گئی ہے۔

گھر میں زید کی موجودگی کا علم حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کی آواز خود اپنے کانوں سے سنے' زید گھر کے اندر ہو' اور خود باہر دیوار کی آڑ میں ہو' دوسرے کے بتلانے سے زید کے وجود کی جس قدر تصدیق ہوتی آواز سننے سے وہ کچھ زیادہ ہی ہوگی' اس لیے کہ آواز شکل اور صورت پر دلالت کرتی ہے اور دل میں یہ بات آجاتی ہے کہ یہ آواز فلاں شخص کی ہے' یہ ایمان اگرچہ حجت اور دلیل سے مخلوط ہے' لیکن اس میں بھی خطا کا امکان موجود ہے' اس لیے کہ آوازیں بعض اوقات ایک دوسرے سے مشابہ ہوتی ہیں' اور بعض اوقات ایک آدمی بتکلف دوسرے کی آواز کی نقل کرلیتا ہے' اور سننے والا دونوں کی آوازوں میں کوئی فرق نہیں کرپاتا' اور خالی الذہن ہونے کی وجہ سے دھوکا کھاجاتا ہے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود گھر کے اندر جاکر زید کو دیکھ لے' یہ حقیقی معرفت اور یقینی مشاہدہ ہے۔ یہ معرفت مقربین و صدیقین کی معرفت سے مشابہت رکھتی ہے' کیونکہ وہ مشاہدے کے بعد ایمان لاتے ہیں' اس طرح ان کے ایمان میں عوام کا اور متکلمین کا ایمان تو ہوتا ہی ہے مشاہدے کی زیادتی سے یہ ایمان اتنا حقیقی ہوجاتا ہے کہ اس میں کسی غلطی کا احتمال باقی نہیں رہتا۔ تاہم تمام مقربین اور صدیقین کی معرفت یکساں نہیں ہوتی' بلکہ ان میں درجات کا تفاوت ہوتا ہے' اس تفاوت کی وضاحت کے لیے پھر زید ہی کی مثال لیجئے' ایک شخص زید کو گھر کے صحن میں قریب جاکر اچھی طرح روشنی میں دیکھتا ہے' دوسرا شخص کمرے کے اندر دیکھتا ہے' یا دور سے اور شام کے وقت دیکھتا ہے جب کہ روشنی ختم ہوجاتی ہے پہلے شخص کا مشاہدہ زیادہ کامل ہے' اگرچہ دوسرے کا ادراک بھی صحیح ہے' لیکن وہ زید کی شکل صورت کے مخفی علائم اور دقائق کا مشاہدہ نہیں کرتا۔ یہ تفاوت امور الٰہی اور علوم کی مقدار کے ادراک میں بھی ہے' چنانچہ ایک شخص گھر میں زید' عمر' بکر کو دیکھتا ہے اور دوسرا شخص محض زید کو دیکھتا ہے' پہلے شخص کی معلومات دوسرے شخص کے مقابلے میں یقیناً زیادہ ہیں۔

عُلوم کی مختلف قسمیں اور قلبؔ کی حالت

جاننا چاہئے کہ قلب میں فطرتاً معلومات کے حقائق قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد موجود ہے جیسا کہ ہم اس اجمال کی تفصیل گذشتہ بیان میں کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ قلب جن علوم کا محل بنتا ہے ان کی دو قسمیں ہیں عقلی اور شرعی۔ عقلی علوم کی بھی دو قسمیں ہیں۔ بدیہی اور اکتسابی۔ اکتسابی کی پھر دو قسمیں ہیں دنیوی اور اُخروی عقلی علوم سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ نفس عقل کے تقاضے پورے کریں' ان میں تقلید اور سماع کو کوئی دخل نہ ہو' عقلی بدیہی وہ علوم کہلاتے ہیں جن کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں سے اور کس طرح حاصل ہوئے۔ مثلاً اس حقیقت کا علم کہ ایک شخص بیک وقت دو جگہوں پر نہیں پایا جاسکتا۔ نیز کوئی چیز بیک وقت حادث اور قدیم' یا معدوم اور موجود نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ حقائق ہیں کہ انسان نو عمری ہی سے ان کا علم رکھتا ہے' لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے یہ علم کس وقت اور کہاں سے حاصل کیا ہے' یعنی وہ اس علم کے قریبی سبب سے واقف نہیں ہوتا۔ ورنہ جہاں تک سبب بعید کا سوال ہے ہر مؤمن اسے جانتا ہے کہ اللہ نے اسے پیدا کیا اور اسے ہدایت سے نوازا۔ عقلی اکتسابی سے وہ علوم مراد ہیں جو تعلیم و تعلّم اور استدلال سے حاصل ہوں۔ یہ دونوں ہی قسمیں عقل کہلاتی ہیں' چنانچہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے تین شعر ہیں۔

رأیت العقل عقلین ۔۔۔ فمطبوع و مسموع
ولا ینفع مسموع ۔۔۔ اذا لم یک مطبوع
کما لا تنفع الشمس ۔۔۔ وضوء العین ممنوع

(مجھے معلوم ہوا ہے کہ عقل کی دو قسمیں ہیں ایک طبعی اور دوسری سمعی' اگر طبعی عقل نہ ہو تو سمعی سے کوئی فائدہ نہیں۔ جس طرح آنکھوں کی روشنی نہ ہونے کی صورت میں سورج کی روشنی کوئی نفع نہیں دیتی۔)

طبعی عقل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں مراد ہے' جس کے مخاطب حضرت علیؓ تھے' فرمایا:۔

ماخلق اللّٰہ خلقا اکرم علیہ من العقل (حکیم ترمذی فی نوادر الاصول)

اللہ تعالیٰ نے عقل سے زیادہ افضل و اشرف چیز کوئی دوسری پیدا نہیں کی۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا:۔

اذا تقرب الناس الی اللّٰہ تعالیٰ بانواع البر فتقرب انت بعقلک۔ (ابو نعیم)

جب لوگ نیک اعمال کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کریں تو تو اپنی عقل کے ذریعہ اس کی قربت حاصل کر۔

اس میں عقل کی دوسری قسم مراد ہے۔ کیونکہ فطری اور غریزی عقل سے اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنا ممکن نہیں ہے' اور نہ یہ بدیہی علوم کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے۔ بلکہ اس کے لیے اکتسابی علوم کی ضرورت ہے' لیکن عقل کے ذریعہ علوم حاصل کرنے پر حضرت علیؓ جیسا ہی شخص قادر ہو سکتا ہے۔ گویا قلب کی حیثیت آنکھ کی ہے' اور فطری عقل کو اس میں وہ مقام حاصل ہے جو آنکھ میں قوت بینائی کو حاصل ہے۔ اور قوت بینائی ایک ایسا لطیفہ ہے جو اندھے میں نہیں پایا جاتا صرف بینا میں موجود رہتا ہے' اگرچہ وہ اپنی آنکھیں بند کر لے یا رات تاریک ہو جائے' اس عقل کے ذریعہ حاصل ہونے والا علم قلب کے لیے ایسا ہے جیسا آنکھ کے لیے قوت ادراک یعنی اشیاء کی رؤیت اور ان کا مشاہدہ۔ بچپن سے سنِ شعور تک ان علوم کے مخفی رہنے کی مثال یہ ہے کہ جب تک آفتاب طلوع نہیں ہوتا' اور دکھائی دی جانے والی چیزوں پر اس کا نور نہیں پھیلتا اس وقت تک آنکھ دیکھنے کے قابل نہیں ہوتی۔ وہ قلم جس سے اللہ تعالیٰ صفحۂ دل پر علوم نقش فرماتا ہے آفتاب کی ٹکیہ کی طرح ہے۔ لڑکپن میں علم حاصل نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس وقت تک اس کی لوحِ دل اس قابل نہیں ہوتی کہ اس پر نقوش ثبت کیے جاسکیں۔ قلم سے ہماری مراد بعینہٖ وہ قلم نہیں ہے جس سے ہم لکھنے کا کام لیتے ہیں' بلکہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں علوم کے نقش کا کوئی سبب بنایا ہے جسے قلم سے تعبیر کرتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:۔

اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ۔ (پ ۳۰ ر ۲۱ آیت ۴-۵)

جس نے قلم سے تعلیم دی' انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔

جس طرح اللہ کا کوئی وصف بندوں کے وصف سے مشابہت نہیں رکھتا' اسی طرح اس کا قلم بھی مخلوق کے قلم جیسا نہیں ہے' نہ اس کا قلم لکڑی کا ہے اور نہ بانس کا' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نہ عرض ہیں نہ جوہر ہیں۔ ظاہری بینائی۔ اور باطنی بصیرت میں مندرجہ بالا وجوہ سے مشابہت ہو سکتی ہے' لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بصارت و بصیرت دونوں ہم رتبہ ہیں' اس لیے کہ باطنی بصیرت عین نفس ہے' اور نفس لطیفۂ مدرکہ کہلاتا ہے' اس کی حیثیت ایسی ہے جیسے سوار کی' بدن گھوڑے کی طرح ہے' اگر سوار اندھا ہو تو نقصان کا زیادہ اندیشہ ہے' گھوڑے کا اندھا پن اس کے مقابلے میں کم نقصان پہنچائے گا' بلکہ یہ دونوں ضرر اتنے متفاوت اور جُداگانہ ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ ہم نے ظاہری بصارت اور باطنی بصیرت میں یک گونہ مشابہت بیان کی ہے' قرآن کریم کی اس آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے' جس میں دل کے ادراک کو بینائی اور رؤیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى۔ (پ ۲۷ ر ۵ آیت ۱۱)

قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں کوئی غلطی نہیں کی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں ارشاد فرمایا:۔

وَكَذٰلِكَ نُرِىْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (پ ۷' ر ۱۵ آیت ۷۵)

اور ہم نے ایسے ہی طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات دکھلائیں۔

یہاں بھی ادراک کو رؤیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مگر ظاہری آنکھ کی رؤیت مراد نہیں ہے' کیونکہ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی کیا خصوصیت ہے' سب ہی لوگ آسمان و زمین کے ملکوت۔ اگر یہ ظاہری آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہوتے۔ دیکھ لیتے۔ اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے' جس میں ادراک کی ضد یعنی عدم ادراک کو نابینائی قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ۔ (پ ۱۷ ر ۱۳ آیت ۴۶)

بات یہ ہے کہ (نہ سمجھنے والوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا:۔

وَمَنْ كَانَ فِىْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۔ (پ ۱۵ ر ۸ آیت ۷۲)

جو شخص دنیا میں (راہ نجات) دیکھنے سے اندھا رہے گا سو وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا اور زیادہ راہ گم کردہ ہو گا۔

یہ عقل کا بیان تھا۔ دینی علوم وہ ہے جو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سے بطور تقلید پہنچے ہوں' یہ علوم کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سیکھنے سے اور سننے کے بعد ان کے معانی سمجھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ دینی علوم ہی پر قلب کی سلامتی' اور صحت موقوف ہے۔ عقلی علوم اس مقصد کے لیے ناکافی ہیں' اگرچہ ان کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں' یہ ایسا ہی ہے جیسے عقل بدن کی صحت کے لیے کافی نہیں ہے' اس کے لیے دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے خواص' اور ان کے طریق استعمال سے واقف ہونا ضروری ہے' اور یہ واقفیت اَطِبّاء کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے' محض عقل سے رہنمائی حاصل نہیں کی جا سکتی البتہ خواص اور طریق استعمال سے متعلق استاذ کے ارشادات کا سمجھنا عقل پر موقوف ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ سماع عقل سے مستغنی ہو

سکتا ہے' اور نہ عقل ہی سماع سے بے نیاز ہو سکتی ہے عقل کو بالائے طاق رکھ کر تقلید کی دعوت دینے والا جاہل مطلق ہے' اور قرآن و سنت سے بے نیاز رہ کر عقل پر بھروسا کرنے والا فریب خوردہ ہے' خدا نہ کرے تم ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو' تمہیں تو سماع و عقل دونوں کا جامع ہونا چاہئے۔ اس لیے کہ عقلی علوم غذا اور شرعی علوم دواء کی حیثیت رکھتے ہیں' مریض کو اگر دوا نہ دی جائے صرف غذائیں دی جائیں تو اس کی بیماری کم ہونے کی بجائے بڑھے گی' اسی طرح قلوب کے امراض کا علاج بھی ان دواؤں کے بغیر ممکن نہیں ہے جو شریعت نے تجویز کی ہیں' یعنی وہ اعمال و عبادات جو حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے باری تعالیٰ کے احکام کے بموجب قلوب کی اصلاح کے لیے ترتیب دیں۔ جو شخص اپنے مرض کا علاج شرعی عبادات کی بجائے عقلی علوم سے کرے گا اس کا مرض سنگین اور مہلک ہو جائے گا' جس طرح اس مریض کا مرض ترقی کر جاتا ہے جو دوا کی بجائے غذا استعمال کرے۔

شرعی و عقلی علوم میں تعارض نہیں ہے: کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عقلی اور شرعی علوم میں اس حد تک تعارض ہے کہ ان دونوں کے درمیان جمع کرنا ممکن ہی نہیں ہے' یہ ایک احمقانہ خیال ہے' اور صاحب خیال کے ذہنی افلاس پر دلالت کرتا ہے' اللہ پناہ میں رکھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بعض شرعی علوم کو بعض دوسرے شرعی علوم کے منافی تصور کرتے ہیں اور اپنی کم علمی کے باعث ان دونوں کو جمع نہ کرنے کے سلسلے میں اپنے عجز کو دین کا نقص تصور کرتے ہیں' اور پریشان ہو کر دین کے دائرے سے نکل کر دوسری پناہ گاہیں تلاش کرتے ہیں' ان بیچاروں کو یہ معلوم نہیں کہ یہ تناقض اور تفاوت دین کا نقص نہیں ہیں بلکہ تمہارے علمی افلاس' اور ذہن و فکر کے عجز کا قصور ہے۔ ایسے لوگ اس اندھے کی طرح ہیں جو کسی کے گھر میں جائے' اور اتفاقاً اس کا پاؤں برتنوں پر پڑ جائے تو وہ گھر والوں کو ملامت کرنے بیٹھ جائے کہ عجیب احمق لوگ ہیں' راستے میں برتن رکھ دیتے ہیں' اس سے کہا جائے گا کہ برتن تو اپنی جگہ رکھے ہوئے ہیں' تم ہی غلط راستے پر چل رہے ہو' بہتر تھا کہ کسی بینا کی راہنمائی حاصل کر لیتے' بے وقوف تم خود ہو کہ ٹھوکر کھا کر گرنے کو اپنے اندھے پن پر محمول نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو مجرم ٹھہراتے ہو۔ بہر حال دینی اور عقلی علوم میں یہ علاقہ ہے۔

عقلی علوم کی دو مزید قسمیں: اب عقلی علوم کی دوسری دو قسمیں۔ دنیوی اور اُخروی۔ کا حال سنئے' طب' حساب' ہندسہ' نجوم' تمام صنعتیں اور پیشے دنیوی علوم سے تعلق رکھتے ہیں' قلب کے احوال' اعمال کی آفات' اور باری تعالیٰ کی صفات و افعال کا علم اُخروی علوم کے دائرے میں آتا ہے' کتاب العلم میں ہم اس موضوع پر گفتگو کر چکے ہیں۔ یہ دونوں یعنی دنیوی اور اُخروی علوم ایک دوسرے کے منافی ہیں' اس اعتبار سے کہ جو شخص دنیوی علوم میں تعمق اور گہرائی حاصل کر لیتا ہے عموماً وہ اخروی علوم کی طرف پوری توجہ نہیں دے پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دنیا و آخرت کو ترازو کے دو پلڑے مغرب و مشرق' اور ایک شوہر کی دو بیویاں قرار دیا ہے کہ اگر ایک کو خوش کیا جائے تو دوسری ناراض ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ طب' حساب' فلسفہ اور ہندسہ وغیرہ علوم دنیا میں مہارت تامہ رکھتے ہیں وہ عموماً اخروی علوم سے جاہل رہ جاتے ہیں' اور جنہیں علوم آخرت کے دقائق پر عبور ہوتا ہے وہ اکثر دنیاوی علوم سے واقفیت نہیں رکھتے' کیونکہ قوت عقل بیک وقت دونوں علوم سے وفا نہیں کر پاتی' ایک کا کمال دوسرے کے زوال کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

ان اکثر اهل الجنة البله (بزار۔ انس)

اکثر اہل جنت بھولے بھالے ہوں گے۔

یعنی وہ لوگ ہوں گے جنہیں دنیاوی امور کا شعور نہیں ہوتا۔ حضرت حسن بصریؒ نے ایک مرتبہ لوگوں کو بتلایا کہ ہم نے ایسے لوگوں سے ملاقات کی ہے' اگر تم انہیں دیکھو تو مجنوں کہو' اور وہ تمہیں دیکھیں تو شیطان کہیں۔ اس لیے اگر دین سے متعلق کوئی ایسی عجیب و غریب بات معلوم ہو جس سے علماء ظاہر انکار کرتے ہوں تو یہ خیال نہ کرے کہ وہ ایسے امور کے منکر ہیں' بلکہ یہ سمجھے کہ مشرق کی راہ چلنے والے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ مغرب میں پہنچ جائے' یہی حال دنیا و آخرت کا ہے کہ دنیا کا مسافر آخرت کی منزل پر نہیں اُتر سکتا اور

آخرت کا راہ رو دنیا سے قریب نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ۔ (پ ۱۱ ر ۶ آیت ۷)

جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں اور جو لوگ ہماری آیتوں سے بالکل غافل ہیں۔

ایک جگہ فرمایا:۔

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ (پ ۲۱ ر ۴ آیت ۷)

یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔

نیز فرمایا:۔

فَأَعْرِضْ عَمَّنْ تَوَلَّى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ۔ (پ ۲۷ ر ۶ آیت ۲۹۔ ۳۰)

تو ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے اور بجز دنیوی زندگی کے اس کا کوئی اُخروی مقصود نہ ہو ان لوگوں کے فہم کی رسائی بس یہی ہے۔

دین و دنیا کے امور میں کمال صرف ان لوگوں کو حاصل ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے معاش و معاد کی تدابیر کا علم عطا فرمایا۔ یہ لوگ انبیاء کرام کے علاوہ دوسرے نہیں ہو سکتے' روح القدس کے ذریعہ ان کی تائید ہوتی ہے' اور قوت الہی سے انہیں مدد ملتی ہے جس کے دائرۂ اختیار میں ہر چیز ہے' عام لوگوں کے قلب کا حال یہ ہے کہ اگر وہ دنیاوی امور میں منہمک ہوں گے تو آخرت کے امور میں کمال سے محروم رہ جائیں گے' اور آخرت میں مشغول ہوں گے تو دنیاوی امور ان کی دسترس سے باہر ہو جائیں گے۔

تعلّم اور الہام کا فرق

علمائے کرام اور صوفیائے عظام کے اختلاف کی حقیقت

غیر بدیہی علوم کا دل میں آنا مختلف طریقوں پر ہوتا ہے' کبھی یہ علوم دل پر اس طرح ہجوم کرتے ہیں گویا کسی نے بے خبری میں ڈال دیئے ہوں' اور کبھی استدلال اور تعلّم کے ذریعہ حاصل کئے جاتے ہیں۔ اول الذکر علوم کو الہام اور ثانی الذکر کو اعتبار اور استبصار کہتے ہیں۔ پہلے علم کی دو قسمیں ہیں' ایک یہ کہ بندے کو اس ذریعہ علم کی اطلاع نہ ہو اسے الہام اور نفخ فی القلب کہتے ہیں' دوسری قسم یہ ہے کہ وہ سبب معلوم ہو جائے جس کے ذریعہ علم حاصل ہو رہا ہے' یعنی وہ فرشتہ نظر آ جائے جو دل میں القاء کرتا ہے' اسے وحی کہتے ہیں' پہلی قسم اولیاء اور اصفیاء کے ساتھ' اور دوسری قسم انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے' اور استدلال و تعلیم کے ذریعہ حاصل کیا جانے والا علم علماء کے ساتھ مخصوص ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آدمی کا دل اس کی صلاحیت رکھتا ہے کہ اس میں اشیاء کی حقیقتیں واضح ہو جائیں' جن دلوں میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی اس کے وہی پانچ اسباب ہوتے ہیں جن کا ذکر سابق میں کیا جا چکا ہے' یہ اسباب آئینۂ قلب اور لوح محفوظ کے

درمیان حجاب بن جاتے ہیں۔ لوح محفوظ میں وہ تمام امور لکھے ہوئے ہیں جن کا ازل میں فیصلہ ہو چکا ہے' اس لوح کے آئینے سے قلب کے آئینے میں حقائق کا جلوہ گر ہونا ایسا ہی ہے جیسے ایک آئینہ کا عکس دوسرے میں نظر آجاتا ہے۔ موانع کی بناء پر قلب کا ان حقائق سے محروم رہ جانا ایسا ہی ہے جیسے دو آئینوں کے درمیان حجاب آجائے نیز جس طرح ہاتھ وغیرہ سے حجاب ہٹا دیا جاتا ہے اسی طرح لوح محفوظ اور آئینۂ قلب کے درمیان واقع حجاب بھی باری تعالیٰ کی نسیم رحمت سے ہٹ جاتا ہے' اور وہ حقائق نظر آنے لگتے ہیں جو لوح میں محفوظ ہیں' یہ صورت کبھی خواب میں پیش آتی ہے' اور مستقبل کے احوال سامنے آجاتے ہیں' حجاب کا مکمل ارتفاع صرف موت ہی سے ہوتا ہے' موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تمام مخفی امور واضح ہو جاتے ہیں' اور بصیرت کے تمام حجابات دور ہو جاتے ہیں' بعض اوقات بیداری کی حالت میں حقائق نظر آتے ہیں' اور باری تعالیٰ کے لطف و کرم کے طفیل حجاب اُٹھ جاتا ہے' نتیجے میں غیب کے پردے سے علوم کے عجائبات کے انوار ظاہر ہوتے ہیں بعض اوقات بجلی کی چمک کی طرح چند لمحوں کے لیے۔ اور کبھی مسلسل اور مستقل۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ الہام اور اکتساب میں نہ علم کے اعتبار سے فرق ہے اور نہ محل علم کے اعتبار سے۔ اگر کوئی فرق ہے تو صرف اس قدر کہ الہام میں حجاب زائل ہو جاتا ہے' اور اکتساب میں حصول کے ذرائع استعمال کرنے پڑتے ہیں حجاب کا دور ہونا بندے کے اختیار میں نہیں ہے۔ اس طرح وحی اور الہام میں بھی صرف اس قدر فرق ہے کہ الہام میں القاء کرنے والا نظر نہیں آتا' اور وحی میں نظر آجاتا ہے۔ علم چاہے وحی سے حاصل ہو یا الہام سے ہر حال میں فرشتوں کے ذریعہ ہی حاصل ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ (پ ۲۵ر۶ آیت ۵۱)

اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرماوے مگر (تین طریقوں سے) یا تو الہام سے' یا حجاب کے باہر سے' یا کسی فرشتے کو بھیج دے کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے پیغام پہنچا دیتا ہے۔

یہاں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ صوفیائے کرام الہامی علوم کی طرف میلان رکھتے ہیں' تعلیمی امور کی طرف راغب نہیں ہوتے' یہی وجہ ہے کہ نہ وہ درس و تدریس میں وقت لگاتے ہیں' نہ مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں' اور نہ اقوال و دلائل سے بحث کرتے ہیں' بلکہ وہ یہ کہتے ہیں اولاً مجاہدہ کرنا چاہئے' مذموم صفات کا قلع قمع کرنا چاہئے' اور تمام علائق کا خاتمہ کر کے ہمہ تن باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے۔ جب یہ بات حاصل ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ خود اپنے بندے کے قلب کے نگراں' اور اس کے لیے انوارِ علم کے کفیل ہو جائیں گے۔ اور اس پر سایۂ رحمت ہو گا' قلب میں نور چمکے گا' شرح صدر حاصل ہو گا۔ اور قلب کے آئینے سے حجاب زائل ہو جائے گا' اس میں الٰہی امور کے حقائق کا عکس پڑنے لگے گا' بندے پر صرف اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے قلب کا تزکیہ کر کے قبول حق کی صلاحیت پیدا کرے' اور عزم کامل اور ارادۂ صادق کے ساتھ اپنی ہمت مجتمع رکھے' اور رحمت الٰہی کی تشنگی لئے ہمیشہ منتظر رہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیاء اللہ پر جو امور منکشف ہوتے ہیں' اور ان کے دلوں میں جو نور پھیلتا ہے اس کی وجہ تعلیم و تعلّم' اور مطالعہ و کتابت میں ان کی مشغولیت نہیں ہے' بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں زہد اختیار کرتے ہیں' علائق منقطع کر لیتے ہیں' اور دنیاوی امور سے اعراض کر کے بتمام ہمت و ارادۂ باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں' کیوں کہ جو اللہ کا ہو جاتا ہے' اللہ اسکا ہو جاتا ہے' صوفیاء کا ایک مقولہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بننے کے لیے اولاً'' تمام دنیاوی علائق سے بالکلیہ منقطع ہونا ضروری ہے' اس کے بعد اپنے قلب کو فارغ کرے اور اہل' اولاد' مال' وطن' علم اور جاہ و حکومت سے اپنی توجہ ہٹالے' اور دل کو ایسی حالت پر لے آئے جس میں کسی چیز کا وجود اور عدم دونوں برابر ہو جاتے ہیں' گوشہ نشین ہو جائے' ضروریاتِ فرائض و واجبات اور وظائف پر کفایت کر کے ماسوی اللہ سے اپنے دل کو خالی کر لے' یہاں تک کہ قرآن پاک کے معانی' اور احادیث کی کتابوں میں بھی غور و فکر کر کے اپنے قلب کی یکسوئی میں خلل نہ ڈالے' بلکہ یہ کوشش کرے

کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسری بات نہ آئے' جب خلوت و جلوت میں ہروقت زبان پر یہی کلمہ رہے اللہ' اللہ۔ لیکن یہ کلمہ حضورِ قلب کے ساتھ ادا ہو' اس اسم پاک کا ورد اتنی کثرت سے ہونا چاہئے کہ اگر زبان سے حرکت نہ بھی ہو تب بھی یہی معلوم ہو کہ زبان اس کا ورد کررہی ہے جب اس حالت پر پہنچ جائے تو زبان سے اس کلمے کا اثر مٹادے' اور قلب کے ذکر پر مواظبت کرے یہاں تک کہ قلب سے بھی حروف کی ساخت' اور لفظ کی مجموعی ہیئت او جھل ہو جائے اور معنیٰ ہروقت موجود رہیں گویا قلب اور معنیٰ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوں' بندے کو اس حد تک پہنچنے کا اختیار حاصل ہے' نیز اسے یہ بھی اختیار ہے کہ اس حالت کو دائمی بنانے کے لیے وہ غیر اللہ کے وسوسوں کو دفع کرسکتا ہے' البتہ اسے رحمتِ الٰہی کی جذب و کشش کا اختیار نہیں ہے' تاہم اس حالت سے اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ اس درجے پر پہنچنے کے بعد بندے کو باری تعالیٰ کی فتوحاتِ رحمت کا منتظر رہنا چاہئے کہ جس طرح اس نے انبیائے کرام اور اولیاء پر فتوحات فرمائیں اس پر بھی فرمائے گا۔ اس صورت میں اگر اس کا ارادہ سچا ہوا' ہمت صحیح ہوئی' حسنِ مواظبت پایا گیا' شہوات سے بچا رہا' اور دنیاوی علائق کی کوئی بات اس کے دل میں نہیں گزری تو قلب میں حق کے لوامع چمکنے لگیں گے' ابتدا میں بجلی کی طرح چند لمحوں کے لیے' دوبارہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ بعض اوقات تاخیر بھی ہوگی' تاخیر سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے' رفتہ رفتہ وہ لوامع قلب میں ٹھہرنے لگیں گے' کبھی ٹھہرنے کی مدت اتنی کم ہوگی کہ تشنگی کا احساس ہوگا' اور کبھی یہ مدت زیادہ ہوگی' کبھی قلب پر لوامع پے بہ پے چمکیں گے اس سلسلے میں اولیاء اللہ کے اتنے مختلف اور متفاوت درجات ہیں کہ تصوّر نہیں کیا جاسکتا' جس طرح مخلوق کے تفاوت اور ان کے اخلاق کے تفاوت کا تصوّر کرنا مشکل ہے۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ نکلا کہ قلب کا جِلا اور تصفیہ بندے کی ذمہ داری ہے' استعداد اور انتظار بھی اسی کے فرائض میں ہے۔ علماء ظاہر بھی اس طریقے کے منکر نہیں ہیں' کیوں کہ اکثر انبیاء اور اولیاء اللہ کے یہی احوال ہیں۔ لیکن وہ اس طریقے کو مشکل سمجھتے ہیں' ان کے خیال میں اس طریقے پر عمل پیرا ہونے کے بعد نتائج و ثمرات کا دیر تک انتظار کرنا پڑتا ہے' اس طریقے میں جو شرائط لگائی گئی ہیں ان کی پابندی آسان نہیں ہے' اول تو تمام دنیاوی علائق سے اس طرح بے نیاز ہونا مشکل ہے' اگر مجاہدے سے ایسا ہو بھی جائے تو اس کی بقا دُشوار ہے' اس لیے کہ معمولی سے وسوسے قلب کا سکون درہم برہم کردیتے ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

قلب المؤمن اشد قلبا من القدر فی غلیانها۔ (احمد' حاکم۔ مقداد ابن اسودؓ)

مؤمن کا دل ہانڈی کے اُبال سے بھی زیادہ اُبلتا رہتا ہے۔

آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:۔

قلب المؤمن بین اصبعین من اصابع الرحمٰن (عبداللہ ابن عمرؓ)

مؤمن کا دل ہانڈی کے اُبال سے بھی زیادہ اُبلتا رہتا ہے۔

اس مجاہدے کے دوران کبھی مزاج فاسد ہو جاتا ہے' عقل خبط ہو جاتی ہے' صحت گر جاتی ہے اور طرح طرح کے امراض بدن کا احاطہ کرلیتے ہیں' اگر پہلے کا علم حاصل کرکے نفس کی ریاضت اور تہذیب نہیں کی جاتی تو دل میں طرح طرح کے خیالاتِ فاسدہ جمع ہو جاتے ہیں' اور نفس انہیں دور کئے بغیر زندگی بھر ان فاسد خیالات میں الجھا رہتا ہے' عمر گزر جاتی ہے' اور کامیابی دروازے پر دستک نہیں دیتی۔ بہت سے صوفیوں نے یہ راستہ اپنایا' اور آگے چل کر کسی ایک خیال میں اس طرح الجھے کہ بیس برس گزر گئے اور ایک قدم بھی آگے کی طرف نہ اٹھا سکے' اس وقت خیال آیا کہ اگر پہلے سے علم حاصل کرلیتے تو یہ بیس برس ضائع نہ جاتے' اس خیال کا فساد پہلے ہی روز منکشف ہو جاتا۔ معلوم ہوا کہ تعلیم کی راہ سے سلوک کی وادی میں قدم رکھنا معتبر بھی ہے اور مقصود سے قریب تر بھی ہے۔ علماء ظاہر کا خیال یہ ہے کہ صوفیوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص فقہ نہ سیکھے اور یہ کہے کہ آنحضرتؐ نے فقہ کا

علم حاصل نہیں کیا تھا آپ وحی اور الہام کے ذریعہ فقیہہ بنے تھے' میں بھی ریاضت پر مداومت اور مجاہدے پر ثبات کی وجہ سے ایسا ہی ہو جاؤں گا' اور مجھے بھی ان ذرائع سے فقہ کا علم حاصل ہو جائے گا۔ اس طرح کے فاسد خیالات میں مبتلا شخص بلاشبہ اپنے نفس پر ظلم کر رہا ہے' اور اپنی عمر کے قیمتی لمحات ضائع کرنے میں مصروف ہے' یہ صوفی اس شخص کی طرح ہے جو نہ کھیتی کرے' اور نہ کسی کام کو ہاتھ لگائے اور توقع یہ رکھے کہ کہیں سے خزانہ ہاتھ آجائے' ایسا ہونا ممکن ہے ضروری تو نہیں کامیابی کے امکانات حد درجہ کم ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ صوفی کو اولاً علم حاصل کرنا چاہئے اور علماء کے اقوال کے معانی سمجھنے چاہئیں' اس کے بعد ان علوم کا منتظر رہنا چاہئے جن سے علماء ظاہر بے بہرہ ہیں' عجب نہیں کہ مجاہدہ و ریاضت سے یہ علوم منکشف ہو جائیں۔

محسوس مثالوں کے ذریعہ دونوں مقامات کا فرق

قلب کے عجائبات کا ادراک حواس کے دائرۂ اختیار سے خارج ہے' خود قلب بھی حواس کے ذریعہ ادراک کی جانے والی چیز نہیں ہے' نیز جو چیز حواس کے ذریعہ معلوم نہیں ہوتی' ضعیف عقلیں اس کے سمجھنے سے قاصر رہتی ہیں' اور جب تک اسکی کوئی ایسی مثال نہ بیان کی جائے جس کا تعلق عالم محسوس سے ہو اس وقت تک وہ چیز اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی' ایسے ہی ضعیفُ العقل لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہم مذکورہ بالا دونوں مقامات کی دو حسّی مثالیں بیان کرتے ہیں۔

<u>پہلی مثال</u> : فرض کیجئے کہ زمین میں ایک حوض کُھدا ہوا ہے' اس میں پانی پہنچانے کے دو طریقے ہیں ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کے چاروں طرف نالیاں بنادی جائیں اور کسی جگہ سے ان نالیوں میں پانی چھوڑ دیا جائے اور یہ پانی حوض میں جمع ہو جائے' دوسری صورت یہ ہے کہ زمین کا زیریں حصہ اتنا کھودا جائے کہ پانی خود بخود نکل آئے۔ دوسرے طریقے سے حاصل ہونے والا پانی صاف بھی زیادہ ہو گا' زیادہ دیر تک باقی بھی رہے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقدار میں بھی زیادہ ہو۔ اس مثال کی روشنی میں قلب کو حوض سمجھنا چاہئے علم کو پانی اور حواسِ خمسہ کو نالیاں تصوّر کرنا چاہئے۔ قلب تک علم کی رسائی حواسِ خمسہ کے ذریعہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس قدر مشاہدات ہوں قلب میں آجائیں' اور قلب علوم سے لبریز ہو جائے' دوسری صورت یہ ہے کہ خلوت اور عزلت کے ذریعہ ان نالیوں کو بند کر دیا جائے یعنی حواسِ خمسہ کو حصولِ علم میں استعمال نہ کیا جائے' اور قلب کے "حوض" کو گہرا کیا جائے یہاں تک کہ خود اس کے اندر سے علم کے چشمے پھُوٹ پڑیں' اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ قلب کی خوب تطہیر کی جائے' اور اس سے حجاب کے پردے اٹھا دئے جائیں۔

رہا یہ سوال کہ جب قلب میں علم کا وجود ہی نہیں ہے تو اس کے چشمے کس طرح جاری ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق عجائبات سے ہے' علم معاملہ کی مناسبت سے اس سوال کے جواب میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ حقائق اشیاء لوح محفوظ بلکہ ملائکہ مقربین کے قلوب میں نقش ہیں' جس طرح کسی مکان کی تعمیر سے پہلے انجینئر ایک نقشہ تیار کرتا ہے' اور اس نقشے کی روشنی میں مکان کی تعمیر کراتا ہے اسی طرح خالقِ ارض و سماء نے بھی دنیا کی ان تمام چیزوں کا نقشہ بنالیا ہے جو اَزل سے اَبد تک وجود میں آتی رہیں گی' یہ نقشہ لوح محفوظ میں محفوظ ہے' دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اسی کے مطابق ہو رہا ہے' اس نقشے کا کسی دل میں منعکس ہونا بعید نہیں ہے' چنانچہ جب کوئی چیز ایک بار عالم وجود میں آجاتی ہے تو اگرچہ وہ باقی نہ رہے لیکن حِس و خیال کے ذریعہ اس کی شکل و صورت کا تصور کر لیا جاتا ہے' مثلاً" اس ظاہری عالم کی طرف دیکھ کر کوئی شخص اپنی آنکھیں بند کر لے تو زمین و آسمان کی صورت حِس و خیال میں موجود ہو گی' اور ایسا محسوس ہو گا گویا وہ ابھی تک انہیں دیکھ رہا ہے' بالفرض اگر زمین و آسمان فنا ہو جائیں اور صرف دیکھنے والا باقی رہ جائے تب بھی وہ ان کی خیالی صورت سے محروم نہیں ہو گا۔ اس خیال کا اثر قلب پر مرتّب ہوتا ہے' اور اس میں اشیاء کے وہ حقائق آجاتے ہیں جو حِس و خیال میں موجود تھے' دل میں جو کچھ آتا ہے وہ اسی خیالی صورت کے مطابق ہوتا

ہے' اور خیالی صورت کسی چیز کی حقیقی اور ظاہری صورت سے مشابہ ہے' اور یہ ظاہر کی صورت لوح محفوظ میں موجود نقشے کے مطابق ہے۔

وجود کی قسمیں : اس سے معلوم ہوا کہ موجوداتِ عالم کے چار درجے ہیں' ایک وہ وجود ہے جو لوح محفوظ میں ہے' یہ وجود جسمانی وجود سے مقدم ہوتا ہے' دوسرا وجودِ حقیقی ہے' یعنی وہ وجود جو دنیا میں ہوتا ہے' تیسرا وجودِ خیالی ہے' اس سے مراد وہ وجود ہے جس کی صورتِ حقیقی وجود کے بعد فکر و خیال میں آتی ہے' چوتھا وجودِ عقلی ہے' یعنی وہ صورت جو خیالی وجود کے بعد قلب میں آتی ہے' ان چاروں وجودوں میں سے بعض روحانی ہیں' اور بعض جسمانی' روحانی موجودات میں بھی تفاوت ہے' بعض میں روحانیت زیادہ ہے' اور بعض میں کم۔ یہ سب امور اللہ تعالیٰ کی حکمت کے عجائب ہیں' دیکھئے اللہ تعالیٰ نے آنکھ کا حلقہ کتنا مختصر بنایا ہے' مگر وہ اپنے حجم کی تنگی کے باوجود زمین و آسمان اور دوسری چیزوں کی وسعتیں سمیٹ لیتی ہے' یہ قاعدہ ہے کہ جب تک کسی کے پاس کوئی چیز نہیں پہنچتی اس وقت تک اسے خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ اگر باری تعالیٰ نے عالم کی موجودات کی مثالیں اور صورتیں تمہارے دل میں نہ بنادی ہوتیں تو تمہیں کسی چیز کا علم بھی نہ ہوتا۔ یہ رب عظیم کی قدرت کاملہ کا ادنیٰ نمونہ ہے کہ اس نے آنکھوں اور دلوں میں عجائبات کے اتنے وسیع خزانے ودیعت فرمادیئے ہیں۔ اور عبرت کے لیے بعض دلوں کو بصیرت سے اور بعض آنکھوں کو بصارت سے محروم فرمادیا ہے' یہاں تک کہ اکثر لوگوں کے دل اتنے بے بہرہ ہیں کہ نہ انہیں اپنے نفسوں کے عیوب کی خبر ہے اور نہ عجائبات کی اطلاع ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم پھر اصل مقصود کی طرف رجوع کرتے ہیں' بات یہ چل رہی تھی کہ دل میں کسی شئی کا وجود حواس کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے اور لوح محفوظ سے بھی' جس طرح آنکھوں میں آفتاب کی صورت کبھی اس کی طرف دیکھ کر آتی ہے' اور کبھی پانی میں اس کا عکس دیکھ کر' یہ عکس اصل آفتاب کے مشابہ ہی ہوتا ہے' اسی طرح جب دل اور لوح محفوظ کے درمیان سے حجابات اٹھ جاتے ہیں تو اشیاء کے حقائق منعکس ہوجاتے ہیں۔ اور ان کا علم اس میں آجاتا ہے' اس صورت میں دل کو اپنے حواس سے اخذ و استفادے کی ضرورت باقی نہیں رہتی' قلب میں علم کو اس طریقے پر آنا ایسا ہی ہے جیسے زمین کے اندر سے پانی کے چشمے اُبل پڑیں اور حوض بھر جائے۔ بعض اوقات دل ان خیالات کی طرف متوجہ رہتا ہے جو اسے محسوسات کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں' یہ خیالات لوح محفوظ سے مانع بن جاتے ہیں' چنانچہ جب نہر میں پانی جمع ہوجاتا ہے تو نیچے سے نہیں نکلتا۔

قلب کے دو دروازے : قلب کے دو دروازے ہیں' ایک دروازہ عالم ملکوت یعنی لوح محفوظ اور عالم ملائکہ کی طرف کھلتا ہے' اور ایک دروازہ حواسِ خمسہ کی جانب کھلتا ہے جو عالم الملک والشہادہ یعنی عالم ظاہر سے خبریں حاصل کرتے ہیں' ان دونوں عالموں میں یک گونہ تعلق ہے' جہاں تک حواسِ خمسہ کی جانب دروازہ کھلنے کا تعلق ہے وہ معلوم ہی ہے مگر عالمِ ملکوت یعنی لوح محفوظ کی طرف دروازہ کھلنا بھی غیر یقینی چیز نہیں ہے' خواب کی حالت پر نظر ڈالیے کہ آدمی کس طرح عجائبات کا مشاہدہ کرتا ہے' بعض لوگوں کو خواب میں مستقبل کے حالات اور ماضی کے واقعات بتلادیئے جاتے ہیں' حالانکہ خواب میں حواس کو دخل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ دروازہ صرف ان ہی لوگوں کے لیے کھلتا ہے جو ذکر خداوندی میں منفرد ہوں۔ یعنی اللہ کے ذکر میں اس طرح مستغرق ہوگئے ہوں کہ ماسوی اللہ سے انہیں کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

سبق المفردون' قیل ومن هم المفردون یا رسول اللہ' قال المتنزهون بذکر اللہ تعالیٰ' وضع الذکر عنهم اوزارهم فوردوا القیامۃ خفافا

مفرد لوگ آگے بڑھ گئے' عرض کیا گیا یا رسول اللہ! مفرد کون لوگ ہیں' فرمایا وہ لوگ جو اللہ کے ذکر کے باعث پاک و صاف ہوگئے' ذکر نے ان کے گناہوں کا بوجھ ہلکا کردیا اور وہ قیامت کے روز ہلکے پھلکے آئے۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی تعریف میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول ارشاد فرمایا کہ پھر میں اپنے چہرے کو ان کی طرف کر کے متوجہ ہوتا ہوں، تمہیں معلوم ہے کہ میں کس کی طرف اپنا چہرہ کر کے متوجہ ہوتا ہوں، اور کوئی جانتا ہے کہ میں ان کو کیا دینا چاہتا ہوں، سب سے پہلے ان کے لیے میری عطاء یہ ہوتی ہے کہ میں ان کے دلوں میں نور ڈال دیتا ہوں، پھر وہ میرے حال کی اس طرح خبر دینے لگتے ہیں جس طرح میں ان کا حال جانتا ہوں۔ ان خبروں کا مدخل وہی باطنی دروازہ ہے جس کا ابھی ذکر کیا گیا۔ انبیاء اور اولیاء کے علوم اور علماء اور حکماء کے علوم میں یہی ایک فرق ہے کہ علوم نبوت قلب کے اندر کھلنے والے اس دروازے سے آتے ہیں جس کا رُخ عالم ملکوت کی طرف ہے، اور علوم حکمت حواس کے ان دروازوں سے قلب میں داخل ہوتے ہیں جو عالم ظاہر کی طرف کھلے ہوئے ہیں۔ اس مثال سے دونوں عالموں کا فرق واضح ہو گیا ہے۔ جہاں تک عالم غیب و شہادت سے تعلق رکھنے والے عجائبات کا تعلق ہے وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا حصر نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری مثال : اس مثال کے ذریعہ ہم علماء اور اولیاء کے علوم کا فرق بیان کرنا چاہتے ہیں، علماء نفس علوم کے حصول کی جدوجہد کرتے ہیں، اور اسے اپنے دل کی طرف کھینچتے ہیں، اور اولیاء (صوفیاء) قلب کے تزکیہ و تطہیر اور جلاء و صیقل میں مصروف رہتے ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ کسی بادشاہ کے سامنے رومیوں اور چینیوں نے اپنے اپنے فن تعمیر و نقاشی کی بڑی تعریف کی، اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کا دعویٰ کیا، بادشاہ کا خیال گزرا کہ اسے دونوں ملکوں کے ماہرین فن کو اپنے اپنے فن کی نمائش کا موقع دینا چاہئے۔ طے یہ ہوا کہ ان دونوں کو ایک عمارت نقاشی کے لیے سپرد کی جائے، ایک حصہ پر چینی نقش بنائیں، اور دوسرے پر رومی، دونوں کے درمیان حجاب ہو تاکہ ایک فریق کو دوسرے فریق کے کام کی اطلاع نہ ہو سکے، دونوں فریقوں کو کام بتلا دیا گیا، رومی بے شمار عجیب و غریب رنگ لے کر آئے، جب کہ چینی رنگ لئے بغیر اندر گئے اور عمارت کے اس حصے کو صیقل کرنے لگے جو ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ جب رومیوں نے اپنے کام کی تکمیل کا اعلان کیا تو چینی بھی یہ کہہ کر باہر نکل آئے کہ ہمارا کام بھی ختم ہو چکا ہے، بادشاہ کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کیسی نقاشی تھی کہ جس میں نہ رنگ کی ضرورت پیش آئی نہ روغن کی، انہوں نے عرض کیا کہ بادشاہ سلامت پہلے پردہ اٹھانے کا حکم دیں، پردہ اٹھایا گیا تو رومیوں کے لگائے ہوئے تمام رنگ چینیوں کی طرف چمکنے لگے، بلکہ ان کی چمک کچھ زیادہ ہی ہو گئی کیوں کہ انہوں نے عمارت کو اتنا صیقل کیا تھا کہ دیواریں چمکدار اور صاف شفاف آئینے کی طرح نکھر گئیں تھیں۔ یہی حال اولیاء اللہ کا ہے کہ وہ چینیوں کی طرح اپنے قلوب کا اس قدر تزکیہ کرتے ہیں اور اتنا صیقل کرتے ہیں کہ ان میں حق چمکنے لگتا ہے، حکماء اور علماء کی توجہ اکتساب فن اور نقوش کی طرف رہتی ہے۔

حصول علم کی جو بھی صورت ہو، اگر قلب میں علم کا نور ہے تو اس کے لیے فنا نہیں ہے، علم موت سے ختم نہیں ہوتا۔ نہ صفائے قلب پر کوئی اثر پڑتا ہے، نہ اس میں کدورت آتی ہے چنانچہ حضرت حسن بصریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ مٹی ایمان کے محل (قلب) کو نہیں کھاتی۔ نفس علم قبول علم کی صلاحیت و استعداد اور صفائے قلب مؤمن کے لیے ضروری ہیں، اس کے بغیر اخروی سعادت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ سعادتیں بھی مختلف ہوتی ہیں، جس طرح ہر مال رکھنے والے کو مالدار کہہ دیا جاتا ہے، اسی طرح ہر صاحب سعادت کو سعید کہتے ہیں، ورنہ کیا ایک لاکھ درہم رکھنے والا ایک کروڑ درہم رکھنے والے کا ہم پلہ ہو سکتا ہے۔ یہی حال سعادتوں کا ہے، بعض سعادت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوتے ہیں، بعض اس سے کم پر، اور بعض ادنیٰ درجے پر۔ سعادت کے یہ درجات معرفت و ایمان کے تفاوت کی وجہ سے ہیں۔

---

(۱) مسلم میں یہ روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے، مگر اس میں "المتنزهون" کے بجائے "المستهترون" کا لفظ ہے۔ حاکم نے بھی اسی لفظ کے ساتھ روایت کی ہے۔ بوجھ ہلکا کرنے کا ذکر بیہقی میں ہے۔ الفاظ یہ ہیں۔ "يضع الذكر عنهم اثقالهم ويأتون يوم القيامة خفافا" طبرانی کی روایت بھی یہی ہے (۲) روایات سے اس زیادتی کا ثبوت نہیں ملتا

معرفت نور ہے' آخرت میں باری تعالیٰ کی زیارت و ملاقات اس نور کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِم (پ۲۸ر۲۰ آیت ۸)

ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا ہو گا۔

روایات میں ہے کہ لوگوں کو اس نور کی یکساں مقدار عطا نہیں ہو گی' بعض لوگوں کو پہاڑ کی مانند نور ملے گا' بعض کو اس سے کم اور ایک شخص کو اس کے پاؤں کے انگوٹھے کے بقدر نور عطا ہو گا' وہ نور کبھی چمکنے لگے گا' اور کبھی بجھ جائے گا' جب چمکے گا تو وہ شخص آگے کی طرف قدم بڑھائے گا' جب بجھ جائے گا تو اسی جگہ کھڑا رہے گا' پل صراط سے بھی لوگ اپنے نور کی روشنی میں گذریں گے۔ جس قدر زیادہ نور ہو گا اسی سرعت کے ساتھ ان کا گذر ہو گا' کوئی پلک جھپکتے ہی گذر جائے گا۔ کوئی بجلی کی طرح کوئی بادل کی طرح' کوئی شہاب کی طرح' اور کوئی تیز رفتار گھوڑے کی طرح گذر جائے گا' جس شخص کے صرف انگوٹھوں پر نور ہو گا وہ اپنے جسم کو گھسیٹتا چلے گا' ایک ہاتھ کو گھسیٹے گا تو دوسرا ہاتھ رہ جائے گا' اس کے چاروں طرف آگ ہو گی' اور وہ اس میں جھلستا ہوا پل عبور کرے گا اس روایت سے لوگوں کے ایمان کا تفاوت معلوم ہوتا ہے۔ اس کی روشنی میں وہ روایت دیکھنی چاہئے جس میں آیا ہے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ کے ایمان کا پیغمبروں کے علاوہ تمام اہل دنیا کے ایمان سے موازنہ کیا جائے تو حضرت ابوبکرؓ کا ایمان راجح ہو گا۔ محسوسات میں اس کی مثال یہ ہے کہ اگر آفتاب کی روشنی کا دنیا کے تمام چراغوں کے نور سے موازنہ کیا جائے تو آفتاب کو ترجیح حاصل رہے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کا ایمان چراغ کی روشنی کی طرح ہے' بعض کا شمع کی روشنی کی مانند ہے' صدیقین کے ایمان کی روشنی چاند ستاروں کے نور کی مثال ہے' اور انبیاء و مرسلین کا ایمان آفتاب کی طرح روشن ہے۔ نیز جس طرح سورج کی روشنی تمام اکناف عالم میں...... ان کی وسعت کے باوجود...... پھیل جاتی ہے اور چراغ گھر کے ایک مختصر حصے کو روشن رکھ سکتا ہے اسی طرح عارفین کے قلوب اتنے منشرح اور وسیع ہو جاتے ہیں کہ ملک کے اسرار' اور کائنات کے رموز اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ان میں سما جاتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے:۔

يقال يوم القيامة اخرجوا من النار من كان فى قلبه مثقال ذرة من ايمان ونصف مثقال وربع مثقال وشعيرة وذرة

قیامت کے روز کہا جائے گا کہ ان لوگوں کو دوزخ سے باہر نکالو جن کے دلوں میں ایک مثقال کے برابر' یا نصف مثقال کے برابر' یا چوتھائی مثقال کے برابر یا جو کے برابر یا ذرہ بھر ایمان ہو۔

اس روایت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کے درجات میں تفاوت ہے' وہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کی یہ مقداریں دخول نار سے مانع نہیں ہیں' نیز یہ بھی پتا چلتا ہے کہ جس شخص کے دل میں ایک مثقال سے زیادہ ایمان ہو گا وہ دوزخ میں نہیں جائے گا' کیوں کہ اگر وہ دوزخ میں جاتا تو اس کے لیے بھی یہی حکم ہوتا' اس روایت سے اس امر پر بھی تنبیہہ ہوتی ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو گا وہ اگرچہ دوزخ میں جائے گا لیکن اس میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک ہے:

ليس شئى خيرا من الف مثله الا الانسان المؤمن (طبرانی۔ سلمانؓ)

صاحب ایمان کے علاوہ کوئی چیز اپنی جیسی ہزار چیزوں سے افضل نہیں ہے۔

اس میں بتلایا گیا ہے کہ اللہ کی معرفت رکھنے والا' اور اس کا کامل یقین رکھنے والا قلب ہزار لوگوں کے قلب سے بہتر ہوتا ہے۔

---

(۱) یہ روایت طبرانی اور حاکم نے ابن مسعودؓ سے نقل کی ہے' حاکم نے اسے شیخین کی شرائط کے مطابق قرار دیا ہے۔ (۲) بخاری و مسلم بروایت ابوسعید الخدریؓ۔ مگر اس میں ربع مثقال کا ذکر نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (پ ۴ ر ۵ آیت ۱۳۹)

اور غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مؤمن رہے۔

اس میں اہل ایمان کو مسلمانوں پر برتری کی بشارت سنائی گئی ہے' مؤمن سے مراد یہاں عارف ہے مقلّد نہیں ہے' ایک جگہ ارشاد فرمایا:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (پ ۲۸ ر ۲ آیت ۱۱)

اللہ تعالیٰ تم میں ایمان والوں کے اور (ایمان والوں میں) ان لوگوں کے جن کو علم (دین) عطا ہوا (اُخروی) درجے بلند کرے گا۔

اس آیت میں ایمان لانے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے علم کے بغیر تصدیق کی' اسی لیے انہیں اہل علم سے الگ ذکر کیا گیا ہے' اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لفظ مؤمن مقلد کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے اگرچہ اس کی تصدیق کشف و بصیرت کے بغیر ہو' آیت کے دوسرے جزء (اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ) کی تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم کو مؤمن پر سات سو درجات کی فضیلت عطا کی ہے' اور ہر درجے میں زمین و آسمان کے برابر فاصلہ ہے' ایک روایت میں ہے:

اكثر اهل الجنة البله وعليون لذوى الالباب

اہلِ جنت کی اکثریت بھولے بھالے لوگوں پر مشتمل ہوگی اور علیین (جنت کے درجات) عقل والوں کے لیے ہیں۔

ایک حدیث میں عابد پر عالم کی فضیلت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

فضل العالم على العابد كفضلى على ادنى رجل من اصحابى (ترمذی ابو امامہؓ)

عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے میری فضیلت ادنیٰ صحابی پر۔

ایک روایت میں اس طرح تشبیہ دی گئی ہے:

كفضل القمر ليلة البدر على سائر الكواكب (حوالہ سابق)

جیسے چودھویں رات کے چاند کے فضیلت تمام ستاروں پر۔

ان تمام روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ جنت کے درجات کا یہ فرق ان کے قلوب و معارف کے تفاوت کی وجہ سے ہوگا۔ اسی لیے قیامت کے دن کو یومُ التغابن (گھاٹے کا دن) بھی کہا جاتا ہے' جو شخص اللہ کی رحمت سے محروم ہوگا اس کے گھاٹے اور نقصان میں کیا شبہ ہے' وہ لوگ بھی نقصان میں رہیں گے جن کے درجات کم ہوں گے' وہ اپنے سے اوپر درجے والوں کو دیکھ کر حسرت کریں گے' اور کہیں گے کہ کاش ہم نے بھی ایسے ہی عمل کیے ہوتے' یہ نقصان نہ اٹھانا پڑتا آخرت کے بڑے درجات اور بڑی فضیلتیں ہیں۔

طریقۂ تصوّف کی صحت پر شرعی دلائل

اہلِ تصوّف تعلیم اور معتاد طریقے کے مطابق معرفت کا اکتساب نہیں کرتے ان کا یہ طریقہ صحیح ہے یا نہیں؟ شرعی دلائل

یہ روایت آخر الفاظ کے اضافے کے بغیر پہلے بھی گذر چکی ہے' مجھے اس زیادتی کی کوئی اصل نہیں ملی۔

سے اس کی تائید ہوتی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب ہی ہماری اس گفتگو کا موضوع ہے۔
جس شخص کے دل میں بے خبری میں اور بطریق الہام کوئی امر منکشف ہوجائے وہ طریق صحت کی رو سے عارف کہلائے گا۔ جسے اس طرح کا کوئی الہام یا کشف نہ ہوا سے بھی اس پر ایمان لانا چاہئے کیونکہ معرفت انسان کا فطری تقاضا ہے' اس پر شرعی دلائل بھی موجود ہیں' اور تجربات و حکایات کے شواہد بھی۔

شرعی دلائل : چند شرعی دلائل یہ ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:
وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (پ۲۱ ر۳ آیت ۶۹)
اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے رستے ضرور دکھائیں گے۔
ہر وہ حکمت جس کا ظہور قلب سے عبادت پر مواظبت کی بنا پر' تعلم کے بغیر ہو وہ کشف و الہام کے طریقے پر ہوتا ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من عمل بما علم ورثه الله علم مالم يعلم ووفقه فيما يعمل حتى يستوجب الجنة ومن لم يعمل بما يعلم تاه فيما يعلم ولم يوفق فيما يعمل حتى يستوجب النار

جو شخص اپنے علم کے مطابق عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ان چیزوں کا علم عطا کردیتا ہے جنہیں وہ نہیں جانتا' اور اسے عمل خیر کی توفیق دیتا ہے یہاں تک کہ وہ سزاوار جنت ہوجائے' اور جو شخص اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا وہ اپنے علم میں حیران رہتا ہے' اور اسے عمل میں خیر کی توفیق نہیں ہوتی یہاں تک کہ دوزخ کا مستحق ہوجائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (پ۲۸ ر۱۷ آیت ۲)
اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔
یعنی اہل تقویٰ کو اشکالات اور شبہات سے نجات دیتا ہے' اور بغیر اکتساب کے علم اور بغیر تجربے کے ذہانت عطا فرماتا ہے۔
باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا (پ۹ ر۱۸ آیت ۲۹)
اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے وہ تم کو ایک فیصلے کی چیز دے گا۔
اس آیت میں فرقان سے مراد وہ نور ہے جس سے حق و باطل میں امتیاز کیا جاتا ہے' اور جس کے ذریعہ شکوک و شبہات کے اندھیروں سے نکلا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اکثر دعاؤں میں نور کا سوال کیا کرتے تھے۔ ایک دعا کے الفاظ یہ ہیں:
اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا وَزِدْنِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْ لِیْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَفِیْ قَبْرِیْ نُوْرًا وَفِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا (بخاری و مسلم۔ عبداللہ ابن عباس)
اے اللہ مجھے نور عطا فرما' میرا نور زیادہ کر' میرے قلب میں' میری قبر میں' میرے کانوں میں' میری

یہ روایت کتاب العلم میں گذر چکی ہے' لیکن وفقہ سے آخر تک کی زیادتی اس میں نہیں ہے

آنکھوں میں نور کر دے۔

یہاں تک کہ آپ بال، کھال گوشت، خون اور ہڈی میں بھی نور کی دعا فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ سے اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ کے حوالے سے شرح صدر کے معنیٰ پوچھے گئے' آپ نے فرمایا: یہاں شرح صدر سے مراد توسّع اور کشادگی ہے' اس لیے کہ جب نور دل میں ڈال دیا جاتا ہے تو اس کے لیے سینہ کشادہ و فراخ ہو جاتا ہے۔ آپ نے حضرت عبداللہ ابن عباس کے لیے یہ دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ[۲] اے اللہ اسے دین میں فقیہ بنا دے۔ اور تفسیر آیات کا علم عطا فرما۔

حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں چھپا کر دی ہو' اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو اپنی کتاب کی فہم عطا کر دیتے ہیں[۳]۔ فہم کتاب علم سے نہیں آتا۔ آیت کریمہ:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ (پ ۳ ر ۵ آیت ۲۶۹)

دین کا فہم جسے چاہے دے دیتے ہیں۔

میں بعض مفسّرین کے نزدیک حکمت سے مراد کتاب اللہ کا فہم ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے بارے میں فرمایا گیا:

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ (پ ۱۷ ر ۶ آیت ۷۹)

سو ہم نے اس کی سمجھ سلیمان کو دے دی۔

حضرت سلیمان علیہ الصّلوٰۃ والسلام کو جو باتیں از روئے کشف والہام معلوم ہوئیں انہیں فہم سے تعبیر کیا گیا ہے' حضرت ابو الدرداءؓ ارشاد فرماتے تھے کہ مؤمن وہ ہے جو اللہ کے نور کی مدد سے پردے کے پیچھے چھپی ہوئی چیز دیکھ لے۔ خدا کی قسم یہ بات سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے دلوں میں حق بات ڈال دیتا ہے' اور ان کی زبانوں پر جاری کر دیتا ہے' بعض اکابرین سلف فرماتے ہیں کہ مؤمن کا گمان کہانت ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله (ترمذی۔ ابو سعیدؓ)

مؤمن کی فراست سے ڈرو' اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

اس حقیقت کی طرف ان دونوں آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ (پ ۱۴ ر ۵ آیت ۷۵)

اس میں کئی نشانیاں ہیں اہل بصیرت کے لیے۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (پ ا ر ۱۴ آیت ۱۱۸)

ہم نے تو بہت سی دلیلیں صاف صاف بیان کر دی ہیں (مگر وہ) ان لوگوں کے لیے (نافع ہیں) جو یقین چاہتے ہیں۔

حضرت حسنؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

العلم علمان' فعلم باطن في القلب فذالك هو العلم النافع

علم کی دو قسمیں ہیں' ایک علم باطنی ہے جو دل میں ہوتا ہے یہی علم نفع دینے والا ہے۔

---

[۱] یہ روایت متدرک میں ابن مسعودؓ سے منقول ہے' اور احیاء العلوم کی کتاب العلم میں بھی گزر چکی ہے [۲] یہ روایت بخاری و مسلم میں ابن عباسؓ سے منقول ہے' علمہ التاویل کی زیادتی احمد' ابن حبان اور حاکم میں ہے۔ [۳] یہ روایت بھی کتاب العلم میں گزر چکی ہے

کسی عالم سے باطنی علم کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ایک سر ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب دلوں میں ڈال دیتا ہے' نہ اس کی خبر کسی فرشتے کو ہوتی ہے' اور نہ انسان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

ان من امتی محدثین و معلمین و مکلمین وان عمر منهم

میری امت میں محدثین' معلمین' اور متکلمین ہیں' عمر کا شمار بھی ان میں ہوتا ہے۔

باری تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ (پ ۱۷ ر ۱۴ آیت ۵۲)

اور ہم نے آپ سے قبل کوئی نبی کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا الخ۔

حضرت عبداللہ ابن عباس اس آیت میں "ولا محدث" کا اضافہ کرکے پڑھتے تھے' محدث ملہم کو کہتے ہیں اور ملہم وہ شخص ہے جس کے قلب میں اندرونی طور پر انکشافات ہوں' خارجی محسوسات کے راستے سے نہ ہوں' قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ یہ اعلان کیا ہے کہ تقویٰ ہدایت اور کشف کی کنجی ہے۔ فرمایا:

وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ (پ ۱۱ ر ۶ آیت ۶)

اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان سب میں ان لوگوں کے واسطے دلائل ہیں ڈر مانتے ہیں۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (پ ۴ ر ۵ آیت ۱۳۸)

یہ بیان (کافی ہے) تمام لوگوں کے لیے اور ہدایت اور نصیحت ہے خاص خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔

ان آیات میں فکر' بیان' ہدایت' اور عبرت و موعظت کو متقین کے ساتھ مخصوص فرمایا گیا ہے' ابویزید کہتے ہیں کہ وہ عالم نہیں ہے جو کسی کتاب سے کچھ یاد کرلے اور جب بھول جائے تو جاہل رہ جائے' بلکہ عالم وہ ہے جو اپنے رب سے جب چاہتا ہے درس و حفظ کے بغیر علم حاصل کرلیتا ہے' یہی علم ربانی ہے' اور اسی کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اشارہ کیا گیا ہے:

وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (پ ۱۵ ر ۲۱ آیت ۶۵)

اور ہم نے ان کو اپنے پاس سے علم سکھایا تھا۔

یوں تو تمام علوم باری تعالیٰ کی طرف سے ہیں' لیکن فرق یہ ہے کہ بعض لوگوں کو مخلوق کے واسطے سے تعلیم دی جاتی ہے۔ اسے علم لدنی نہیں کہتے' علم لدنی وہ علم کہلاتا ہے جو کسی خارجی معتاد سبب کے بغیر دل میں حاصل ہوجائے۔ اس طرح کے نقلی دلائل بے شمار ہیں' اگر ان سب کا احاطہ کیا جائے تو تنگ دامانی صفحات کا عذر پیش آجائے۔

<u>تجربات کی شہادت</u> : اس سلسلے میں تجربات بھی اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا صحابہ و تابعین اور بعد کے بہت سے بزرگوں کو اس کا تجربہ ہوا کہ بہت سے علوم باری تعالیٰ کی طرف سے ظاہری اسباب کے بغیر براہ راست دلوں میں القاء کئے جاتے ہیں' چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات کے وقت حضرت عائشہؓ سے فرمایا تھا کہ تیرے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں اس وقت آپ کی اہلیہ حمل سے تھیں' بعد میں لڑکی پیدا ہوئی' حضرت ابوبکرؓ نے پیدائش سے پہلے ہی یہ جان لیا تھا کہ لڑکی ہوگی۔ حضرت عمرؓ نے مدینہ منورہ میں خطبہ دیتے ہوئے باآواز بلند کہا: یاساریۃ الجبل الی الجبل (لشکر والو! پہاڑ کی طرف چلے جاؤ) یہ واقعہ ایک جنگ کے موقع پر پیش آیا' حضرت عمرؓ نے ازروئے کشف یہ بات معلوم کرلی تھی کہ دشمن مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔

یہ روایت کتاب العلم میں گذری ہے۔ بخاری بروایت ابوہریرہؓ مسلم بروایت عائشہؓ

اس لیے انہوں نے لشکر کو خبردار کیا اور اسے پہاڑ کی آڑ میں ہو جانے کا مشورہ دیا' اس آواز کا اتنے فاصلے پر پہنچنا' اور لشکر والوں کا اسے سُن لینا بھی عظیم کرامت ہے انس ابن مالک فرماتے ہیں کہ میں حضرت عثمانؓ کی خدمت میں جارہا تھا' راستے میں میری نظر ایک عورت پر پڑی' میں نے اسے دیکھا' اور اس کے حسن وجمال کا اچھی طرح مشاہدہ کیا' جب میں حضرت عثمانؓ کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بعض لوگ میرے پاس ایسے آتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے زنا کا اثر جھلکتا ہے' پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کیا تجھے معلوم نہیں کہ آنکھ کا زنا دیکھنا ہے' یا تو توبہ کر' ورنہ میں تجھے سزا دوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمالینے کے بعد بھی وحی کا سلسلہ جاری ہے' آپ نے فرمایا: نہیں' بلکہ یہ مؤمنانہ بصیرت اور سچّی فراست ہے۔ ابو سعید الخراز کہتے ہیں کہ میں مسجد حرام میں داخل ہوا' وہاں میری نظر ایک ایسے فقیر پر پڑی جس کے جسم پر دو خرقے تھے' میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ اور اس جیسے دوسرے لوگ بنی نوع انسان کے کاندھوں پر بوجھ کی حیثیت رکھتے ہیں' اس نے مجھے آواز دی' اور یہ آیت پڑھی:

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ (پ ۲ ر ۱۴ آیت ۲۳۵)

اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ تعالیٰ کو اطلاع ہے تمہارے دلوں کی بات کی سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو۔

یہ آیت سُن کر میں اپنے قصور پر نادم ہوا اور دل ہی دل میں اس گناہ کی معافی چاہی' اس شخص نے پھر مجھے مخاطب کیا' اور اس مرتبہ یہ آیت پڑھ کر غائب ہو گیا۔

هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ (پ ۱۱ ر ۲ آیت ۱۰۴)

وہ (ہی) اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔

زکریا ابن داؤد کہتے ہیں کہ ابو العباس ابن مسروق' ابو الفضل ہاشمی کے گھر گئے' وہ اس وقت بیمار تھے' بیچارے کثیر العیال ہونے کے ساتھ ساتھ گذر بسر کے ظاہری اسباب سے بھی محروم تھے' جب ابو العباس ان کے پاس سے اٹھنے لگے تو انہوں نے دل میں سوچا کہ خداوندا یہ شخص کہاں سے کھاتا ہوگا' اور اس کے بچے کس طرح زندگی گذارتے ہوں گے۔ ابو العباس کہتے ہیں کہ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ابو الفضل ہاشمی نے چیخ کر کہا کہ ابو العباس! خبردار! اس طرح کی بے ہودہ بات آئندہ مت سوچنا' اللہ تعالیٰ کے مخفی الطاف وعنایات بھی ہوتے ہیں۔ احمد نقیب بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں حضرت شبلیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ اے احمد اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو فتنے میں مبتلا کردیا ہے میں نے عرض کیا "حضرت! کیا بات ہے؟" فرمایا ابھی میں بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ تم بخیل ہو' احمد کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: نہیں! میں بخیل نہیں' اس کے بعد آپ کچھ دیر سوچتے رہے' پھر فرمایا: بلاشبہ تم بخیل ہو۔ میں نے اپنے دل میں طے کیا کہ جو کچھ آج مجھے ملے گا وہ میں اس فقیر کو دے دوں گا جو سب سے پہلے نظر آئے گا' ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شخص میرے پاس پچاس دینار لے کر آیا' اور کہنے لگا کہ یہ دینار تم اپنی ضرورت میں خرچ کرنا۔ میں وہ دینار لے کر کسی فقیر کی تلاش میں باہر نکلا' اتفاق سے پہلا فقیر مجھے ایک نائی کی دکان پر سر منڈاتے ہوئے نظر آیا' میں نے دینار کی تھیلی فقیر کی طرف بڑھائی' فقیر نے نائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ مال اسے دے دو' میں نے کہا جناب یہ پوری پچاس دینار ہیں' اس نے کہا پھر کیا بات ہے' ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم بخیل ہو' میں نے وہ تھیلی نائی کو دینی چاہی' نائی نے کہا کہ جب یہ فقیر ہمارے سامنے بیٹھے تھے تو ہم نے یہ عہد کرلیا تھا کہ ان سے اُجرت نہیں لیں گے' میں نے وہ دینار دجلہ کی نذر کردیئے' اور کہنے لگا کہ جو شخص تمہاری عزت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کرتا ہے۔ حمزہ بن عبداللہ علویؒ کہتے ہیں کہ میں ابو الخیر تینانی کے دولت کدے پر حاضر ہوا' اس وقت میرے دل میں یہ خیال تھا کہ میں صرف سلام ودعا کے بعد واپس آجاؤں گا' کھانا نہیں کھاؤں گا جب میں ملاقات کے بعد باہر آیا تھا میں نے دیکھا کہ ابو الخیر تینانی میرے پیچھے پیچھے کھانا لئے چلے آرہے ہیں' میں ٹھہر گیا' انہوں نے مجھ سے کہا! عزیز! لو اَب کھاؤ' میرے خیال میں تمہارا عہد میرے گھر نہ کھانے کا تھا' اور اب تم گھر سے باہر آچکے ہو۔

ابوالخیر تینانی کی کرامات بڑی مشہور تھیں۔ چنانچہ ابراہیم رقی اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ان سے ملاقات کے لیے گیا' مغرب کی نماز انہوں نے پڑھائی' مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ انہوں نے سورۂ فاتحہ بھی صحیح طریقے سے نہیں پڑھی تھی' میں نے دل میں سوچا کہ میرا مقصدِ سفر فوت ہو گیا' نماز کے بعد میں قضائے حاجت کے لیے باہر نکلا تو ایک شیر نے مجھ پر حملہ کرنا چاہا' میں اُلٹے پاؤں واپس آیا' اور میزبان سے عرض کیا کہ باہر شیر موجود ہے' اور میرے درپئے آزار ہے' انہوں نے وہیں سے شیر کو للکارا کہ ہم نے تجھ سے کہہ دیا تھا کہ ہمارے مہمانوں کو نہ ستایا کر' شیر نے ان کی آواز سنی تو سر پر پاؤں رکھ کر جنگل کی طرف بھاگا' اور میں نے اطمینان کے ساتھ اپنی ضرورت پوری کی' واپس آیا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے اپنے ظاہر کو سیدھا کیا اس لیے تم شیر سے ڈرتے ہو' ہم نے اپنے باطن کو سیدھا کیا ہے اس لیے شیر ہم سے ڈرتا ہے۔

اس طرح کے واقعات بے شمار ہیں جن سے بزرگانِ اُمّت' اور صلحائے دین کی مؤمنانہ فراست کا ثبوت ملتا ہے' لوگوں کے دلوں کا حال جاننا' ان کے خیالات سے آگاہ کر دینا' حضرت خضر علیہ السلام سے ملنا اور گفتگو کرنا یا غیبی ہواتف سننا اور مخفی اشارے سمجھنا۔ یہ سب وہ امور ہیں کہ ان کے بارے میں اَن گنت حکایات زبان زدِ عوام و خواص ہیں' لیکن اس شخص کے لیے یہ واقعات و حکایات کافی نہیں ہیں جس کا شیوہ ہی انکار ہو' جب تک خود اس کے نفس میں اس کا مشاہدہ نہ ہو گا وہ ہر بات کا انکار کرتا رہے گا۔

دو ناقابلِ انکار دلیلیں : ہمارے پاس دو دلیلیں ایسی ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک کا تعلق عجیب و غریب سچے خوابوں سے ہے ان خوابوں کے ذریعہ غیب کی بہت سی باتیں منکشف ہو جاتی ہیں' اگر نیند کی حالت میں احوال منکشف ہو سکتے ہیں تو بیداری کی حالت میں منکشف ہونا بھی محال نہیں ہے۔ اس لیے کہ جس طرح نیند کی حالت میں حواس ساکن ہو جاتے ہیں۔ اور ظاہری محسوسات میں مشغول نہیں رہتے' اسی طرح بعض اوقات بیداری کی حالت میں بھی آدمی کی توجہ سمٹ کر ایک نقطے پر مُرتکز ہو جاتی ہے' نہ وہ آواز سنتا ہے' نہ کوئی حرکت محسوس کرتا ہے' نہ کسی چیز کی طرف دیکھتا ہے' بلکہ اپنی خیال و فکر میں پوری طرح محو رہتا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقبل کے بارے میں بہت سی غیب کی خبریں بتلائیں جیسا کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے جب نبی غیب کی باتیں بتلا سکتا ہے تو غیر نبی کے لیے بھی اس کا امکان ہے' کیوں کہ نبی اس شخص کو کہتے ہیں جس کو حقائقِ امور مکاشفہ سے معلوم ہوں اور وہ خلق کی اصلاح میں مشغول ہو' یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ایسا ہو کہ جس پر حقائقِ امور تو منکشف ہوں لیکن وہ اصلاحِ خلق میں مشغول نہ ہو' یہ شخص نبی نہیں کہلاتا بلکہ ولی کہلاتا ہے۔

جو شخص انبیاء پر ایمان رکھتا ہے' اور سچے خوابوں کا اعتراف کرتا ہے اسے لامحالہ یہ اقرار بھی کرنا پڑے گا کہ قلب کے دو دروازے ہیں ایک خارجی محسوسات کی طرف کھلتا ہے' اور ایک عالمِ ملکوت کی طرف' یہ الہام' القاء اور وحی کا دروازہ ہے' اگر ان دونوں دروازوں کا اقرار کر لیا تو اب یہ ممکن نہیں کہ وہ علوم کو تعلّم اور تحصیلِ علم کے معتاد اسباب پر منحصر رکھے بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض علوم مجاہدہ و ریاضت کے نتیجے میں حاصل ہوں۔

خواب میں امور کا انکشاف کیوں ہوتا ہے؟ اور فرشتے انبیاء اور اولیاء کے سامنے مختلف صورتوں میں کیوں آتے ہیں؟ ان دونوں سوالوں کا جواب قلب کے عجائب اسرار سے ہے اور یہ علم مکاشفہ کا موضوع ہے' اس موضوع سے متعلق جو کچھ یہاں بیان کیا گیا وہ مجاہدہ کی ترغیب کے لیے بہت کافی ہے۔ ایک صاحبِ کشف بزرگ فرماتے ہیں کہ مجھ سے فرشتوں (کراماً کاتبین) نے کہا کہ آپ اپنے ذکرِ خفی اور مشاہدہ توحید کا کچھ حال لکھ کر ہمیں دے دیں' ہم آپ کے اعمال لکھتے نہیں ہیں۔ اگر آپ لکھ دیں تو ہم وہی صحیفہ لے کر آسمان پر چلے جائیں ہماری خواہش ہے کہ آپ اس عمل کی نشاندہی ضرور فرمائیں جس کے ذریعہ آپ باری تعالیٰ کا تقرّب حاصل کرتے ہیں' میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تم فرائض بھی نہیں لکھتے؟ انہوں نے جواب دیا: فرائض تو لکھتے ہیں۔ میں نے کہا: بس تمہارے لیے اسی قدر لکھنا کافی ہے معلوم ہوا کہ کراماً کاتبین بھی قلب کے اسرار سے واقف نہیں ہو پاتے انہیں صرف ظاہری اعمال کا علم رہتا ہے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے ایک ابدال سے مشاہدۂ یقین کے بارے میں سوال کیا تو انہوں

نے پہلے اپنی بائیں جانب دیکھ کر پوچھا! کیوں بھائی کیا کہتے ہو' اللہ تم پر رحم کرے' پھر دائیں جانب متوجہ ہوئے اور یہی الفاظ کہے' اس کے بعد مجھے ایسا عجیب و غریب جواب دیا جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ پھر میں نے ان سے دائیں اور بائیں طرف متوجہ ہونے کی وجہ معلوم کی' فرمایا کہ مجھے تمہارے سوال کا جواب معلوم نہیں تھا' اس لیے پہلے میں نے بائیں طرف کے فرشتے سے پوچھا اس نے لاعلمی ظاہر کی' دائیں جانب کے فرشتے سے دریافت کیا اس نے بھی لاعلمی میں جواب دیا پھر میں نے اپنے دل سے دریافت کیا' اس نے جو کچھ بتلایا وہ میں نے تمہارے گوش گذار کردیا ہے حدیث شریف "ان فی امتی محدثین وان عمر منھم" کے مصداق یہی لوگ ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

ایما عبد اطلعت علی قلبہ فرایت الغالب علیہ التمسک بذکری تولیت سیاستہ وکنت جلیسہ ومحادثہ وانیسہ

میں جس بندے کے دل پر اپنے ذکر کا تمسک غالب پاتا ہوں اس کی سیاست کا منتظم ہو جاتا ہوں اور اس کا ہم نشین' ہم کلام اور انیس بن جاتا ہوں۔

ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ قلب کی مثال ایک گنبد کی سی ہے جس کے چاروں طرف بند دروازے ہیں ان میں سے جو دروازہ کھل جاتا ہے وہ اس میں کام کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قلب کے دروازوں میں سے ایک دروازہ عالم ملکوت اور ملأ اعلیٰ کی طرف بھی کھلتا ہے' یہ دروازہ مجاہدہ' تقویٰ' اور دنیوی شہوتوں سے اعراض و انحراف کے بغیر وا نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی فوج کے افسروں کے نام ایک مکتوب میں یہ ہدایت کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے جو کچھ تم سے کہیں وہ یاد رکھا کرو' اس لیے کہ ان پر اُمورِ صادقہ منکشف ہوتے ہیں بعض علماء کہتے ہیں کہ حکماء کے منہ پر باری تعالیٰ کا ہاتھ ہے' ان کے منہ سے صرف وہ بات نکلتی ہے جسے اللہ نے حق قرار دے دیا ہو۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاشعین پر بعض اسرار منکشف فرمادیتے ہیں۔

وَسوسوں کے ذریعہ دل پر شیطان کا غلبہ

وسوسے کے معنیٰ اور غلبۂ شیطان کے اسباب

ابھی قلب کو ایک ایسے گنبد سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے بہت سے دروازے ہیں' اور ہر دروازے سے احوال کی آمد و رفت کا عمل جاری ہے اسی نوعیت کی بے شمار مثالیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ قلب ایک ہدف (وہ تختہ جس پر نشانے کی مشق کی جائے) ہے جس پر چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہوتی ہے یا وہ ایک آئینہ ہے جس میں طرح طرح کی صورتیں یکے بعد دیگرے منعکس ہوتی ہیں' اور کوئی لمحہ خالی نہیں جاتا' یا وہ ایک حوض ہے جس میں ان مختلف نالیوں سے پانی آجاتا ہے جو اس کے اِرد گرد بنائی گئی ہیں اور جن سے اس کا سلسلہ جوڑ دیا گیا ہے۔ قلب میں ان نوبہ نو آثار کا ظہور اور وُرود ظاہری حواس کے ذریعہ بھی ہوتا ہے اور باطنی حواس کے ذریعہ بھی۔ چنانچہ خیال' شہوت' غضب اور دوسرے اخلاق ان ہی مختلف آثار و کیفیات کے نام ہیں۔ دل میں تغیر کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے' چنانچہ کسی چیز کو حواس سے معلوم کیا جائے تو اس سے دل میں اثر پیدا ہوگا اسی طرح اگر غذا کی کثرت' اور مزاج کی قوت کی وجہ سے شہوت کو تحریک ہو تو اس سے بھی دل متاثر ہوگا' قلب کے خیالات بدلتے رہتے ہیں' دل ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہی دل کے تغیر کا مطلب ہے۔ افکار و اذکار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ان آثار کو خواطر کہتے ہیں' فکر و ذکر سے مراد وہ علوم ہیں جن کا قلب ادراک کرے' خواہ وہ نئے ہوں یا پہلے ہوں کہ ان کا تذکرہ ہو' خواطر کا نام خواطر اس لیے رکھا جاتا ہے کہ وہ دل پر طاری ہوتے ہیں جب کہ وہ ان سے غافل ہوتا ہے۔ انہی خواطر سے ارادوں کو تحریک ملتی ہے اس لیے

کہ نیت' عزم اور ارادہ کسی خیال کے دل میں گذرنے کے بعد ہی ہوتا ہے افعال کی ابتدا خواطر سے ہوتی ہے' خاطر سے رغبت کو' رغبت سے عزم کو' عزم سے نیت کو' اور نیت سے اعضاء کو تحریک ملتی ہے۔

خواطر کی دو قسمیں' الہام اور وسوسہ : پھر رغبت کو تحریک دینے والے خواطر کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ خاطر ہے' جس سے شر یعنی اس امر کی دعوت ملے جو عاقبت کے لیے مُضر ہو' اور دوسرا خاطر وہ ہے جو خیر یعنی اس امر کا داعی ہو جس سے آخرت میں نفع ہو' اس طرح یہ دو مختلف خاطر ہوئے اور ان دونوں کے نام بھی الگ الگ ہیں۔ محمودِ خاطر کا نام الہام اور مذمومِ خاطر کا نام وسوسہ ہے یہ بات آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ خواطر حوادث ہیں' اور حوادث کے لیے مُحدِث (بانی) کا ہونا ضروری ہے اور کیوں کہ حوادث مختلف ہوتے ہیں' ان کا اختلاف یہ بتلاتا ہے کہ حوادث کے اسباب بھی مختلف ہوں گے اسباب اور مسببات کی ترتیب میں سنت اللہ اسی طرح جاری و ساری ہے' جیسا سبب ہوتا ہے ویسا ہی اس کا مسبّب ہوتا ہے' چنانچہ اگر کسی کمرے میں آگ جلائی جائے اور اس کی روشنی سے کمرے کی دیواریں روشن اور دھوئیں سے چھت سیاہ ہو جائے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ چھت کی سیاہی کا سبب روشنی ہے' اسی طرح دل کے نور اور سیاہی کے اسباب بھی جداگانہ ہیں اس خاطر کے سبب کا نام فرشتہ ہے جو داعی خیر ہے' اور اس خاطر کے سبب کو شیطان کہتے ہیں جو شر کا داعی ہے۔ وہ لطافت و رقت جس سے قلب میں خیر کے الہام کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے توفیق کہلاتی ہے' اور جس سے شیطانی وسوسوں کے قبول کرنے پر مدد ملے اسے خذلان کہتے ہیں۔ معانی کے اختلاف سے الفاظ بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔

فرشتہ و شیطان : فرشتے سے مراد وہ مخلوق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خیر پھیلانے' علم کی روشنی عام کرنے' حق کا انکشاف کرنے' غیر کا وعدہ کرنے اور امر بالمعروف کرنے کے لیے پیدا کیا ہے' فرشتہ اپنے ان ہی کاموں کے لیے مسخّر ہے۔ اور شیطان سے مراد وہ مخلوق ہے جو مذکورہ بالا امور میں فرشتے کی ضد ہو' یعنی وہ شر کا وعدہ کرے' برائیوں کی دعوت دے' اور خیر پر آمادہ نظر آنے والے کو ڈرائے' اس سے معلوم ہوا کہ وسوسہ الہام کے مقابلے میں' شیطان فرشتے کے مقابلے میں اور خذلان توفیق کے مقابلے میں ہے' اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (پ ۲۷ ر ۲ آیت ۴۹)

اور ہم نے ہر چیز کو دو دو قسم بنائی۔

یعنی تمام موجودات ایک دوسرے کے مقابل اور جوڑے ہیں' سوائے خداوند قدوس کے وہ یکتا ہے' اس کا کوئی مقابل نہیں' وہ ایک ہے' برحق ہے' اور تمام جوڑوں کا خالق ہے۔

فرشتہ اور شیطان دونوں ہی قلب کو اپنی اپنی طرف کھینچنے میں مصروف رہتے ہیں' چنانچہ روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

في القلب لمتان' لمة من الملك ايعاد بالخير و تصديق بالحق' فمن وجد ذالك فليعلم انه من الله سبحانه و ليحمد الله و لمة من العدو وايعاد بالشر و تكذيب بالحق' و نهي عن الخير فمن وجد ذالك فليستعذ بالله من الشيطان الرجيم (ثم تلا هذه الآية) اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ

(ترمذی' نسائی۔ ابن مسعودؓ)

دل میں دو قربتیں ہیں ایک فرشتے کی قربت ہے' جس کا کام خیر کا وعدہ کرنا اور حق کی تصدیق کرنا ہے' جس کو یہ معلوم ہو تو اسے جان لینا چاہیے کہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے' اس پر خدا کا شکر ادا کرے' دوسری قربت

شیطان کی ہے' اس کا کام حق کو جھٹلانا اور خیر سے منع کرنا ہے' جس شخص کو یہ معلوم ہو تو اسے شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "اور شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور برائیوں کا حکم دیتا ہے۔"

حضرت حسن بصریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ دو ہم (قصد و ارادہ) دل کے ارد گرد پھرتے ہیں' ایک ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے' اور ایک دشمن کی طرف سے' اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو اپنے ہم کے وقت توقف کرے' اگر وہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو اسے جاری کرنا چاہئے (اس پر عمل کرنا چاہئے) اور دشمن کی طرف سے ہو تو اس کے خلاف جہاد کرنا چاہئے۔ حدیث شریف میں ان ہی دو قاصدوں کی کھینچا تانی کی طرف اشارہ ہے:۔

قلب المؤمن بین اصبعین من اصابع الرحمٰن

مؤمن کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔

اللہ تعالیٰ اس سے برتر و بلند ہے کہ اس کی کوئی انگلی گوشت' پوست' خون اور ہڈی سے بنی ہوئی ہو' بلکہ انگلی سے یہاں مراد یہ ہے کہ جس طرح آدمی انگلیوں کے ذریعہ جلدی جلدی کام کرتا ہے' اور تیزی کے ساتھ الٹ پلٹ کرتا ہے' حرکت دیتا ہے' اسی طرح باری تعالیٰ بھی فرشتے اور شیطان کو مسخر کرکے ان سے جلد جلد کام لیتا ہے' یہ دونوں قلوب کو اُلٹنے پلٹنے کے لیے مسخر ہیں جس طرح تمہاری انگلیاں جسموں کو اُلٹنے پلٹنے کے لیے مسخر ہیں۔ قلب اپنی فطرت کے لحاظ سے فرشتے اور شیطان دونوں ہی کے آثار مساوی طور پر قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے' کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح حاصل نہیں ہے۔ البتہ نفسانی خواہشات کی اتباع اور ان کی مخالفت سے کسی ایک جانب کو ترجیح ہوتی ہے' چنانچہ اگر انسان غضب اور شہوت کے تقاضوں پر عمل کرے گا تو ہوائے نفس کے واسطے سے شیطان غالب آجائے گا' اور دل اس کو گھونسلہ' یا اس کا ملجاء و ماویٰ ہو گا اس لیے کہ ہوائے نفس شیطانی چراگاہ ہے' اگر کسی نے خواہشات کے خلاف جہاد کیا' اور انہیں اپنے نفس پر مسلط نہ ہونے دیا اور ملائکہ کے اخلاق سے مشابہت اختیار کی تو اس کا قلب ملائکہ کا مستقر' اور ان کی منزل قرار پائے گا۔

جس دل میں شہوت' غضب' حرص' طمع' اور طول امل وغیرہ شیطانی صفات ہوں وہ دل ہر حالت میں شیطانی وسوسوں کی جولان گاہ ہو گا۔ حدیث شریف میں ہے:۔

ما منکم من احد الا و له شیطان' قالوا و انت یا رسول اللہ؟ قال و انا الا ان اللہ اعاننی علیه فاسلم فلا یا مر الا بخیر (مسلم۔ عبداللہ ابن مسعودؓ)

تم میں سے ہر شخص پر ایک شیطان (مقرر) ہے صحابہ نے عرض کیا: اور آپ پر بھی یا رسول اللہ؟ فرمایا: ہاں! مجھ پر بھی' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر میری مدد فرمائی وہ مسلمان ہو گیا وہ سوائے خیر کے مجھے کچھ نہیں کہتا۔)

شیطان شہوت کو اپنے تصرفات کا ذریعہ بناتا ہے' جس شخص کو اللہ تعالیٰ اس کی شہوت پر مدد دے اور وہ شہوت اس کی اس قدر مطیع ہو جائے کہ مناسب حدود کے سوا اس کا ظہور نہ ہو تو وہ شر کی داعی نہیں ہوتی' اور نہ شیطان ہی کا یہ بس چلتا ہے کہ وہ اس شہوت کو اپنے مقاصد میں استعمال کر سکے۔ شیطان کے لیے دلوں میں وسوسے ڈالنے کی گنجائش اسی وقت ہوتی ہے جب ان پر دنیا کا ذکر اور نفس کی خواہش غالب ہوتی ہے۔ اگر دل ذکر اللہ کی طرف پھر جائے تو شیطان کے لیے رختِ سفر باندھنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں رہتا۔ اور وسوسے پھیلانے کی گنجائش باقی نہیں رہتی' اس وقت فرشتہ آتا ہے' اور خیر کا امر کرتا ہے' فرشتوں اور شیطانوں کے دونوں لشکر ہمیشہ اسی طرح برسرپیکار رہتے ہیں' اور یہ کشمکش اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک دل ان میں

یہ روایت پہلے بھی کئی بار گذر چکی ہے

سے کسی ایک کا مطیع اور مفتوح نہیں ہو جاتا۔ اس صورت میں دل فاتح کا مسکن اور مستقر بن جاتا ہے' حریف کا گذر اگر ہوتا بھی ہے تو حملہ آور کی حیثیت سے ہوتا ہے' قابض اور فاتح کی حیثیت سے نہیں۔ افسوس! صد افسوس! اکثر دلوں کو شیاطین نے اپنی ریشہ دوانیوں کے لیے مسخر کر رکھا ہے' یہ مفتوح' مملوک اور مغلوب شیطانی وسوسوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں' انہوں نے دنیا کو آخرت پر ترجیح دے رکھی ہے' شیطانی لشکر کے غالب ہونے کی وجہ شہوات نفس کا اتباع ہے' اللہ تعالیٰ کی طرف ان کی واپسی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ شیطانی قوت اپنا قبضہ ہٹائے' اور نفسانی خواہشات سے دل خالی ہو' اور اللہ کے ذکر سے آباد و معمور ہو۔ اللہ کے ذکر سے فرشتے دل کی وادی میں اُترتے ہیں اور شیطان کو اپنے لاؤ لشکر سمیت راہ فرار اختیار کرنی پڑتی ہے۔ جابر ابن عبیدۃ العدوی کہتے ہیں کہ میں نے علاء ابن زیاد سے اپنے دل میں پیدا ہونے والے وسوسوں کی شکایت کی' فرمایا: اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گھر میں چور گھسیں' اگر اس گھر میں کچھ ہوا تو وہ چور لے ہی جائیں گے' اور کچھ نہ ہوا تو انہیں ناکام واپس جانا ہوگا۔ اس مثال کے ذریعہ ابن زیاد نے یہ بتلایا کہ ہوائے نفس سے خالی دل میں شیطان داخل نہیں ہوتا۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (پ ۱۵ر ۷ آیت ۶۵)

میرے خاص بندوں پر تیرا ذرا قابو نہ چلے گا۔

جو شخص ہوائے نفس کا تبع ہے وہ بندۂ خدا نہیں بلکہ بندۂ ہوا ہے' ایک جگہ ارشاد ہے:۔

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ (پ ۲۵ر ۱۹ آیت ۲۳)

سو کیا آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے۔

اس آیت میں صراحت کے ساتھ بتلا دیا گیا ہے کہ ہوائے نفس کے متبعین نے ہوائے ہوس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔

شیطان سے بچنے کا راستہ : حضرت عمرو بن العاص نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! شیطان میرے اور میری نماز کے درمیان حائل ہو جاتا ہے (یعنی جب میں تلاوت کرتا ہوں تو مجھے دوسری چیزوں میں الجھا دیتا ہے)۔ آپ نے ارشاد فرمایا:۔

ذالک شیطان یقال له خنزب' فاذا احسسته فتعوذ بالله منه واتفل عن یسارک ثلاثا (مسلم۔ ابن ابی العاصؓ)

وہ شیطان ہے اسے خنزب کہا جاتا ہے' جب تم اسے محسوس کرو تو اس سے اللہ کی پناہ مانگو اور اپنی بائیں جانب تین مرتبہ تھوک دو۔

عمرو بن العاص فرماتے ہیں کہ جب میں نے اس طریقے پر عمل کیا تو وہ شکایت دور ہو گئی۔ ایک حدیث میں ہے:

ان للوضوء شیطانا یقال له الولهان فاستعیذوا بالله منه (ترمذی۔ ابی ابن کعبؓ)

وضو کا ایک شیطان ہوتا ہے جسے ولہان کہتے ہیں اس شیطان سے اللہ کی پناہ مانگو۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ شیطان سے بچنے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کا ذکر اس ذکر سے شیطان کی روح فنا ہوتی ہے اور وہ تمام حربوں میں ناکام ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شیطان کے دفع ہونے کی ایک عقلی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ دل شیطانی وسوسوں سے اسی وقت خالی ہوگا جب اس میں کوئی دوسری چیز داخل ہوگی۔ کیوں کہ جب دل میں ایک بات آتی ہے تو پہلے سے موجود بات باقی نہیں رہتی چنانچہ دل کو کسی دوسری بات کی طرف متوجہ کرنے سے شیطانی وسوسہ ختم ہو جائے گا' لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نئی بات میں بھی وسوسہ پیدا ہو جائے۔ صرف ذکر الٰہی ہی ایک ایسی بات ہے کہ اس کی موجودگی میں شیطان کو دم مارنے کا یارا نہیں رہتا۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہر چیز کا علاج اس کی ضد سے کیا جاتا ہے شیطانی وسوسوں کی ضد استعاذہ' اور اپنی طاقت

وقوت سے برآءت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے' جیسا کہ ہم شیطان سے بچنے کے لیے کہتے ہیں:

اَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ

میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں گناہ سے بچنے کی طاقت اور عبادت کی قوت صرف اللہ برتر عظیم ہی کی طرف سے ہے۔

شیطان سے اپنے دفاع پر وہی لوگ قدرت رکھتے ہیں جو متقی ہیں' اور جن پر اللہ تعالیٰ کا ذکر غالب ہے' شیطان انھیں بھی اپنی عیّاری سے زیر کرنا چاہتا ہے' لیکن وہ ذکر الٰہی کی قوت کی مدد سے اسے شکست دے دیتے ہیں' ارشاد ربّانی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰۤئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ (پ ۹ ر ۱۴ آیت ۲۰۱)

یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکایک ان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ کی تفسیر میں مجاہد نے فرمایا ہے کہ شیطان دل پر چھایا ہوا ہے جب صاحب دل اللہ کا نام لیتا ہے تو وہ دبک جاتا ہے' اور سکڑ کر بیٹھ جاتا ہے' اور جب غافل ہوتا ہے تو بدستور پھیلا رہتا ہے' اللہ کے ذکر اور شیطان کے وسوسے میں اس قدر تضاد ہے جس قدر اُجالے اور اندھیرے میں ہے' یا دن اور رات میں ہے کہ ان میں سے ایک آجائے تو دوسرا اپنے وجود سے محروم ہوجاتا ہے۔ آیت کریمہ میں اسی تضاد کی طرف اشارہ ہے:

اِسْتَحْوَذَ عَلَیْھِمُ الشَّیْطٰنُ فَاَنْسٰھُمْ ذِکْرَ اللّٰہِ (پ ۲۸ ر ۳ آیت ۱۹)

ان پر شیطان نے پورا تسلّط کرلیا ہے' سو اس نے ان کو خدا کی یاد بھلا دی ہے۔

حضرت انسؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان الشیطان واضع خرطومه علی قلب ابن آدم فان هو ذکر الله تعالی قنس وان نسی الله تعالی التقم قلبه (ابن ابی الدنیا' ابو یعلی' ابن عدی)

شیطان اپنی دُم بنی آدم کے دل پر رکھے ہوئے ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو ہٹ جاتا ہے اور اللہ کو بھول جاتا ہے تو اس کے دل کو نگل لیتا ہے۔

ابن وضاح سے روایت ہے کہ جب آدمی چالیس برس کا ہوجاتا ہے' اور اپنے گناہوں سے توبہ واستغفار نہیں کرتا تو شیطان اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس حسین صورت کے قربان جاؤں جسے فلاح نصیب نہیں ہوگی۔ جس طرح شہوتیں انسان کے گوشت اور خون میں خلط ملط ہیں اسی طرح شیطان بھی اس کی رگوں میں خون کے ساتھ ساتھ دوڑنے میں مصروف ہے' اور دل کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے' چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان الشیطان یجری من بنی آدم مجری الدم فضیقوا مجاریه بالجوع

شیطان انسان کے جسم میں خون کیساتھ ساتھ گردش کرتا ہے' اسکے پھرنے کی جگہوں کو بھوک سے تنگ کردو۔

بھوک کے ذریعہ راستے مسدود کرنے کی ہدایت اس لیے دی گئی کہ بھوک سے شہوت ختم ہوتی ہے اور شیطان شہوات کے ساتھ ہی جسموں میں داخل ہوکر خون رواں کے ساتھ گردش کرنے لگتا ہے' خاص طور پر دل کے چاروں طرف' کیوں کہ شہوات کا مرکز دل ہی ہوتا ہے۔ اس کا چاروں طرف سے حملہ کرنے کا ثبوت اس آیت سے ملتا ہے جس میں باری تعالیٰ نے اسی کی زبانی حکایت

---

(۱) اس روایت کی اصل نہیں ملی (۲) یہ حدیث اس سے پہلے بھی گزر چکی ہے۔

کی ہے' شیطان کہتا ہے:

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ (پ ۸ ر ۹ آیت ۱۷)

میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کے لیے آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھوں گا پھران پر حملہ کروں گا ان کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی' اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور ان کی بائیں جانب سے بھی۔

حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

ان الشیطان قعد لابن آدم بطرق فقعد له بطریق الاسلام' فقال: اتسلم؟ وتترک دینک ودین آباءک' فعصاہ واسلم' ثم قعدله بطریق الھجرۃ فقال: اتھاجر؟ اتدع ارضک وسماءک؟ فعصاہ وھاجر ثم قعدله بطریق الجھاد' فقال اتجاھد وھو تلف النفس والمال فتقاتل فتقتل فتنکح نساءک ویقسم مالک فعصاہ وجاھد وقال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فمن فعل ذالک فمات کان حقا علی اللّٰہ ان یدخله الجنة (نسائی۔ سبرۃ بن ابی فاکہ)

شیطان آدمی کی کئی راہوں پر بیٹھا اسلام کے راستے میں بیٹھا اور (گذرنے والے سے) پوچھنے لگا کہ کیا تو مسلمان ہوجائے گا' اور اپنے اور اپنے آباء و اجداد کا دین چھوڑ دے گا؟ اس شخص نے شیطان کی بات نہیں مانی اور مسلمان ہوگیا' پھر وہ اس کے ہجرت کے راستے میں جابیٹھا اور اسے روک کر پوچھنے لگا کہ کیا تو ہجرت کررہا ہے' کیا تو اپنی زمین اور اپنا آسمان خیرباد کہہ رہا ہے' مہاجر نے شیطان کی بات پر کان نہیں دھرے اور ہجرت کی پھر وہ اس کے جہاد کی راہ میں بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ کیا تو جہاد کرے گا' جہاد میں جان اور مال دونوں ہی کا ضیاع ہے' تو جنگ کرے گا قتل کردیا جائے گا' تیرے بعد لوگ تیری بیویوں سے نکاح کریں گے اور تیرا مال تقسیم کیا جائے گا' مگر مجاہد نے اس کا کہنا نہیں مانا اور جہاد کیا' اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے ایسا کیا اور مرگیا اللہ تعالیٰ اسے جنت میں ضرور داخل کریں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بموجب وسوسے یہی خواطر ہیں جو شیطان کے بہکانے سے آدمی کے دل میں گذرتے ہیں کہ جہاد میں مارا گیا تو میری بیویاں دوسروں کے نکاح میں آجائیں گی' میرا مال تقسیم ہوجائے گا یا ہجرت کروں گا تو مجھ سے میرا پیارا وطن چھوٹ جائے گا یا اسلام لاؤں گا تو اپنے دین اور آباء و اجداد کے دین کو چھوڑنا پڑے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ خواطر سب کو معلوم ہیں' وسوسے سے بھی ہر شخص واقف ہے' اور یہ بات بھی علم میں آچکی ہے کہ ان خواطر اور وساوس کا سبب شیطان ہے جہاں تک ان خواطر اور وساوس کا تعلق ہے کوئی شخص ان سے خالی نہیں ہوسکتا جیسا کہ حدیث میں ہے مامن احد الا وله شیطان (ہر شخص کے لیے ایک شیطان ہے) اگر کوئی فرق ہے تو صرف اس قدر کہ بعض لوگ شیطان کی مخالفت کرتے ہیں' اور بعض لوگ اس کی اتباع کرتے ہیں۔

شیطان کیا ہے؟ : یہاں کچھ لوگ شیطان کی ماہیت کا سوال اٹھاسکتے ہیں کہ آیا وہ جسم لطیف رکھتا ہے یا اس کا کوئی جسم ہی نہیں ہے نیز اگر وہ جسم ہے تو انسان کے جسم میں کس طرح گھس جاتا ہے' اور اس کی رگوں میں کیسے دوڑتا ہے؟ شیطان کی ماہیت اور کیفیت کا تعلق علم معاملہ سے نہیں ہے' اس طرح کے سوالات اٹھانے والے شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے بدن میں سانپ گھس جائے تو وہ اسے نکالنے کی فکر کی بجائے اس کی شکل' رنگ' لمبائی اور چوڑائی کے قصے لے کر بیٹھ جائے' یہ جہالت محض ہے' شیطان تمہارا دشمن ہے' اس کی دشمنی کھلی کتاب کی طرح واضح ہے تمہیں اس کے خلاف مصروف جہاد ہونا چاہئے وہ

تمہارے جسموں میں، دلوں میں رگوں میں چھپا بیٹھا ہے تمہیں اسے نکالنے کی فکر کرنی چاہیے' اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں شیطان کی عداوت کا ذکر متعدد بار کیا ہے۔ فرمایا:

اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا اِنَّمَا یَدْعُوْ حِزْبَہٗ لِیَکُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (پ ۲۲ ر ۱۳ آیت ۶)

بے شک یہ شیطان تمہارا دشمن ہے' سو تم اس کو (اپنا) دشمن سمجھتے رہو' وہ تو اپنے گروہ کو محض اس لیے (باطل کی طرف) بلاتا ہے تاکہ وہ لوگ دوزخیوں میں سے ہو جائیں۔

اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ یٰبَنِیْ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (پ ۲۳ ر ۳ آیت ۶۰)

اے اولاد آدم! کیا میں نے تم کو تاکید نہیں کردی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔

انسان کو چاہئے کو وہ اپنے آپ کو اس دشمن سے بچائے' یہ نہ پوچھے کہ وہ دشمن کہاں کا رہنے والا ہے؟ اس کا نسب کیا ہے؟ اس کا رنگ کیسا ہے؟ پوچھنا ہی ہے تو یہ پوچھے کہ دشمن کس طرح حملہ کرتا ہے' اس کے پاس کون کون سے ہتھیار ہیں' اور وہ اپنے دشمن کو زیر کرنے کے لیے کن تدابیر پر عمل کرتا ہے؟ یہ پہلے بتلایا جاچکا ہے کہ دشمن کے ہتھیار نفس کی خواہشات ہیں' وہ ان ہی خواہشات کے زور پر جسم کی مملکت میں اندر تک چلا جاتا ہے' اور وساوس کی تدبیروں سے کمزور ایمان والوں کو شکست دے دیتا ہے' شیطان کے حملوں سے بچنے کی تدبیر بھی بیان کردی گئی ہے اور اس ہتھیار کا ذکر بھی کردیا گیا ہے جسے دیکھ کر شیطان کی ہمت جواب دے دیتی ہے' اور وہ میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے' عوام تو پھر عوام ہیں' ہم علماء کو بھی اس سے زیادہ جاننے کی اجازت نہیں دیں گے' شیطان کی ذات و صفات کی معرفت اور ملائکہ کی حقیقت کا علم عارفین کا کام ہے' یہ لوگ علم مکاشفہ میں مستغرق رہتے ہیں۔

<u>خواطر کی قسمیں</u> : خواطر کی تین قسمیں ہیں۔ اول وہ جو یقینی طور پر خیر کے داعی ہوں' ان خواطر کو کسی تردد کے بغیر الہام کہا جاسکتا ہے' دوم وہ جو یقینی طور پر شر کی دعوت دیتے ہیں' ان خواطر کو شیطانی وسوسہ کہنے میں کسی شبہ کی ضرورت نہیں ہے' سوم وہ جو الہام اور وسوسہ کے درمیان ہوں یعنی ان کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ نہ کہا جاسکتا ہو کہ یہ فرشتے کی طرف سے ہیں یا شیطان کی طرف سے' اس لیے کہ شیطان کے فریب کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ شر کو خیر بنا کر پیش کرتا ہے' اس میں امتیاز کرنا بڑا مشکل ہے اکثر لوگ اس فریب کا شکار ہو کر ہلاک ہو جاتے ہیں' مثلاً وہ عالم کو نصیحت کے پیرائے میں کہتا ہے کہ "لوگوں کو دیکھو' جہالت انہیں موت کی طرف دھکیل رہی ہے' اور غفلت ہلاکت سے قریب کررہی ہے' وہ دوزخ کے کنارے تک پہنچ چکے ہیں' قریب ہے کہ خدا کی قہر کی آگ انہیں اپنی لپیٹ میں لے لے' کیا تمہیں اللہ کے ان بندوں پر رحم نہیں آتا کہ انہیں اپنی قیمتی نصائح اور عالمانہ مواعظ کے ذریعہ ہلاکتوں سے نجات دلاؤ' اللہ تعالیٰ نے تمہیں بصیرت' فراست' اور دردمندی جیسے اوصاف سے نوازا ہے' تمہاری زبان میں کشش ہے' تمہارا لہجہ مقبول ہے' تمہارے الفاظ میں ایمان کی روشنی ہے' تم کیوں اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی ناقدری کررہے ہو' ایسا نہ ہو کہ تمہیں اس ناقدری کی سزا ملے اور تم باری تعالیٰ کی ناراضگی مول لو' ہوسکتا ہے کہ تم سزا کے طور پر اشاعت علم' اور دعوت الی اللہ کی صلاحیت سے محروم کردیئے جاؤ"۔ یہ اور اس طرح کی دوسری تلقین وہ اتنی بار کرتا ہے کہ عالم کا دل متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا بالآخر وہ وعظ گوئی کے میدان میں قدم رکھتا ہے' اور اپنی خلوت سے نکل کر لوگوں کے مجمع میں آجاتا ہے' اب شیطان اسے یہ فریب دیتا ہے کہ کوئی بات اس وقت تک اچھی طرح دلوں پر اثر انداز نہیں ہوتی جب تک کہنے والا خوش وضع خوش لباس' اور خوش گلو نہ ہو' مقرر بیچارہ اس فریب میں بھی آجاتا ہے رفتہ رفتہ وہ اسے اس مقام تک لے آتا ہے جہاں سے

ریا، تکبر، خود پسندی، جاہ و منصب کی طلب پیدا ہوتی ہے، اور اپنے علاوہ ہر آدمی حقیر نظر آتا ہے، غور کیجئے، اس شیطان نے خیر کے پردے میں شر کے کتنے سامان پیدا کیے بظاہر یہ تمام باتیں عالم کی خیر خواہی پر مشتمل تھیں، لیکن درپردہ وہ اسے ہلاکت کی طرف گھسیٹ رہا تھا، واعظ بیچارہ اپنے لفظوں کے گھر لٹاتا پھرتا ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ میرا مقصد نیک ہے حالانکہ دل جاہ اور مقبولیت کے لیے مصروف جدوجہد ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کی کوششیں بار آور ہوں گی، اور اسے آخرت میں کوئی بلند مرتبہ نصیب ہوگا، حالانکہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے متعلق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان اللہ لیوید ھذا الدین بقوم لا خلاق لھم ان اللہ لیوید ھذا الدین بالرجل الفاجر

اللہ تعالیٰ اس دین کی ایسے لوگوں سے تائید کرائے گا۔ جن کا دین میں کچھ حصہ نہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس دین کی فاجر شخص سے تائید کرائے گا۔

روایات میں ہے کہ ابلیس ملعون حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے کسی شخص کی صورت بنا کر آیا، اور ان سے کہنے لگا کہ لا الٰہ الا اللہ کہو، حضرت عیسیٰ نے جواب دیا کہ اگرچہ یہ کلمۂ حق ہے، لیکن میں تیرے کہنے سے نہیں کہوں گا، آپ کے انکار کی وجہ یہی تھی کہ اس کا خیر بھی تلبیسات سے خالی نہیں ہوتا، اور شیطان کی تلبیسات خیر اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ بھی نہیں کیا جاسکتا، ان تلبیسات کے سبب وہ تمام علماء، عُبّاد، زُہّاد، فقراء اور اغنیاء ہلاک ہوجاتے ہیں جو کھلا شر کسی حالت میں پسند نہیں کرتے، اور نہ وہ گناہوں کے اِرتکاب پر راضی ہوتے ہیں ہم شیطان کی فریب کاریوں کے کچھ نمونے چوتھی جلد کی کتاب الغرور میں پیش کریں گے، اور اگر ہمیں زمانے نے مہلت دی، اور عمر نے وفا کی تو ہم خاص طور پر اسی موضوع پر "تلبیس ابلیس" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں، ہر جگہ، ہر ملک اور ہر قوم میں ہر شخص اس کی تلبیس کا شکار ہے، خاص طور پر عقائد اور فقہی مذاہب کے سلسلے میں اس نے تلبیس کی انتہا کردی، اب خیر اور نیکی صرف رسمی چیز بن کر رہ گئی انسان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ہر خیال اور ہر ارادے پر توقف کرے، اس کے اچھے بُرے پہلوؤں کا جائزہ لے۔ اور یہ دیکھے کہ وہ ارادہ یا خیال شیطانی واہمہ ہے، یا ملکوتی اِلہام، اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ تامل کرے، اور غور و فکر کی تمام تر صلاحیت استعمال کرے، کیونکہ یہ بات علم کی کثرت، بصیرت کی گہرائی، اور تقویٰ کے بغیر معلوم نہیں ہوتی جیسا کہ ارشاد باری ہے:

اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَاھُمْ مُّبْصِرُوْنَ (پ ۹ ر ۱۴ آیت ۲۰۱)

جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

یعنی وہ ان حالات میں اپنے دلوں کو ٹٹولتے ہیں اور باطن کا نور انہیں جہل کے اندھیروں سے نکال دیتا ہے، کشف و بصیرت کی مدد سے تمام عُقدے کھل جاتے ہیں تقویٰ سے محروم شخص اپنی نفسانی خواہشات کے دباؤ میں شیطانی فریب کو "خیر" سمجھ کر قبول کرلیتا ہے، اور غیر شعوری طور پر تباہی کے راستے پر چل پڑتا ہے، اسی طرح کے لوگوں کے متعلق قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَبَدَا لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مَالَمْ یَکُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ (پ ۲۴ ر ۲ آیت ۴۷)

اور خدا کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آوے گا جس کا ان کا گمان بھی نہ تھا۔

یعنی جن اعمال کو وہ حسنات (نیکیاں) سمجھتے تھے وہ سیات (برائیاں) ہوں گی۔

شیطانی فریب کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے: علم معاملہ میں سب سے اہم اور غامض بات یہ ہے کہ نفس کے فریبوں

یہ دونوں روایتیں پہلے بھی گذر چکی ہیں۔

اور شیطان کی مکاّریوں کی اطلاع رکھے' اور یہ ہر شخص پر فرض ہے' لیکن لوگ اس فرض کی ادائیگی سے غافل ہیں' اور ایسے علوم کی تحصیل میں مصروف ہیں جن سے وسوسوں کو تحریک ملے اور شیطان کو اپنا تسلّط باقی رکھنے کا موقع فراہم ہو' وہ ان علوم میں لگ کر شیطان کی عداوت اور اس سے بچنے کا طریقہ بھول جائیں۔ وسوسوں کی کثرت سے نجات کی صرف یہی صورت ہے کہ خواطر کے دروازے بند کردئے جائیں' خواطر کے دروازے ظاہر میں حواسِ خمسہ' اور باطن میں شہوات اور دنیاوی علائق ہیں تنگ و تاریک گھر میں گوشہ نشینی اختیار کرنے سے حواسِ خمسہ کی گذرگاہیں مسدود ہوتی ہیں' اور اہل و مال سے دوری شہوت اور دنیا کی محبت کم کرتی ہے۔ اس صورت میں صرف تخیّلات کے دروازے کھلے رہیں گے ان دروازوں پر ذکر الٰہی کا پہرہ مقرّر کیا جاسکتا ہے' بعض اوقات وہ پہرہ دار کی آنکھ بچا کر دل کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوجاتا ہے' اور اگر ایسا ہو تو اس "چور" کے خلاف سخت مجاہدے کی ضرورت ہے' اور یہ مجاہدہ کبھی ختم نہیں ہوتا' بلکہ زندگی کے آخری سانس تک جاری رہتا ہے' اس لیے کہ زندہ شخص کبھی شیطان سے بچ کر نہیں رہ سکتا' وہ ہر لمحہ تاک میں رہتا ہے' اور موقع پاتے ہی حملہ کردیتا ہے' اس دشمن کے خلاف ہر وقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے بعض اوقات انسان اپنے دشمن کو زیر کرلیتا ہے' اور مجاہدے سے اس کے شر کا قلع قمع کردیتا ہے' لیکن یہ شکست دائمی نہیں ہوتی' وقتی ہوتی ہے' موقع ملتے ہی وہ پھر حملہ کردیتا ہے' جب تک جسم میں خون رواں دواں ہے شیطان کے خلاف جہاد کا جاری رہنا ضروری ہے قلب کے "شہرپناہ" کے دروازے زندگی بھر شیطان کے لیے کھلے رہتے ہیں کبھی بند نہیں ہوتے' اور یہ شہوت' غضب' حسد' طمع' اور حرص وغیرہ قلب کے دروازے ہیں عنقریب ان کا بیان آئے گا۔ جب "شہر" کا دروازہ کھلا ہوا ہو' اور دشمن چوکنا ہو تو اس کا دفاع صرف مجاہدے اور نگرانی ہی کے ذریعہ ممکن ہے' ایک شخص نے حضرت حسن بصریؒ سے دریافت کیا کہ اے ابو سعید! شیطان سوتا بھی ہے؟ فرمایا: اگر وہ سوجایا کرے تو ہمیں آرام کے چند لمحے میسّر نہ آجائیں' بہرحال بندہ مؤمن شیطان سے بچ کر تو نہیں گذر سکتا' البتہ اسے شکست دے کر' یا اس کی قوّت کمزور کرکے اپنا دفاع ضرور کرسکتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ان المؤمن ینضی شیطانہ کما ینضی احدکم بعیرہ فی سفرہ (احمد۔ ابو ہریرہؓ)

بندہ مؤمن شیطان کو اتنا لاغر و کمزور کردیتا ہے جتنا تم اپنے اونٹ کو سفر میں (بوجھ لاد لاد کر) لاغر کردیتے ہو۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ مؤمن کا شیطان کمزور ہوتا ہے قیس بن الحجّاج کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے شیطان نے کہا کہ جب میں تمہارے اندر داخل ہوا تھا تو اونٹ کی طرح تھا' اور اب چڑیا جیسا ہوں۔ میں نے اس سے اس کی وجہ پوچھی اس نے کہا تم ذکر اللہ کی آنچ سے میرا جسم پگھلاتے رہتے ہو۔ بہرحال اہلِ تقویٰ کے لیے شیطانی دروازے بند کرنا' اور ان کی نگرانی کرنا' یعنی ان ظاہری دروازوں پر پابندی لگانا اور ان واضح طریقوں کا سدِّباب کرنا جو معاصی کی طرف داعی ہوں مشکل نہیں ہے' البتہ شیطان کے غامض طریقوں سے وہ بھی دھوکا کھا جاتے ہیں' اور ان سے اپنی حفاظت یا دفاع نہیں کرپاتے جیسا کہ ہم نے علماء اور واعظین کے متعلق بیان کیا کہ شیطان انہیں خیر کے دروازے سے بہلا پھسلا کر شر کی طرف لے آتا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ قلب کی طرف کھلنے والے شیطانی دروازے بہت زیادہ ہیں جب کہ ملائکہ کا دروازہ ایک ہی ہے' یہ ایک ملکوتی دروازہ بے شمار شیطانی دروازوں میں مشتبہ ہوجاتا ہے ان دروازوں کے سلسلے میں آدمی کی مثال اس مسافر کی سی ہوتی ہے جو اندھیری رات میں کسی جنگل کا سفر اختیار کرے' اور کسی جگہ پہنچ کر ٹھہر جائے جہاں سے بے شمار دشوار گذار راستے نکلتے ہیں اور وہ حیران پریشان کھڑا رہ جاتا ہے کہ کس راستے سے آگے بڑھے جو اسے منزل تک پہنچائے۔ ان بے شمار اور غیر واضح راستوں میں سے صحیح راستے کا انتخاب دو طرح کیا جاسکتا ہے' ایک عقل و بصیرت سے' اور دوسرا سورج کی روشنی سے زیرِ بحث موضوع میں متقی قلب بصیرت و عقل اور کتاب و سنت کے علم کی کثرت روشن سورج کے قائم مقام ہے جس طرح سورج کی روشنی سے منزل کی طرف جانے والا راستہ ملتا ہے اسی طرح کتاب و سنت کے علم کی روشنی منزل کی طرف رہنمائی کرتی ہے' ورنہ شیطان کے راستے بے

شمار ہیں' اور ان سے بچ کر نکلنا دشوار ہے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ہمارے سامنے ایک خط کھینچا اور فرمایا ھٰذا سبیل اللّٰہ (یہ اللہ کا راستہ ہے) اس کے بعد آپ نے اس خط کے دائیں اور بائیں جانب متعدد خطوط کھینچے' اور فرمایا یہ سب بھی راستے ہیں مگر ان میں سے ہر راستے پر ایک شیطان موجود ہے جو لوگوں کو اس پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِی مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ (پ ٨ ر ٦ آیت ١٥٣)

اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو۔

آپ نے ان مختلف خطوط کو سُبل فرمایا جو خطِ مستقیم کے اِردگرد کھینچے گئے تھے اس حدیث سے بھی شیطانی راستوں کی کثرت کا علم ہوتا ہے' ان ہی میں سے ایک راستہ وہ ہے جس پر چلنے کی دعوت دے کر وہ علماء' صلحاء' نفسانی شہوات پر قابو یافتہ' اور گناہوں کی زندگی سے دور لوگوں کے فریب دیتا ہے' اب ہم اس کے ایک اور راستے کا تذکرہ کرتے ہیں جس پر آدمی خواہ مخواہ چلنے لگتا ہے' یہ واقعہ حدیث شریف میں موجود ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے ایک راہب کا ذکر فرمایا کہ اس کے شہر میں شیطان نے کسی لڑکی کا گلا دبایا اور لڑکی کے گھر والوں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اس کا علاج فلاں راہب کے پاس ہے' وہ لوگ لڑکی کو لے کر راہب کے پاس پہنچے' اس نے لاکھ انکار کیا' مگر وہ نہ مانے' راہب کو علاج کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ اب شیطان نے راہب کے دل میں زنا کا وسوسہ ڈالنا' اور اسے اس نازیبا حرکت پر اکسانا شروع کیا' یہاں تک کہ وہ زنا کر بیٹھا' لڑکی حاملہ ہوگئی' شیطان نے راہب کو رسوائی کے خوف سے ڈرایا' اور اس کے دل میں یہ بات ڈالی کہ اگر لڑکی کو قتل کر دیا جائے تو یہ راز چھپ سکتا ہے اور اس کے گھر والوں کو موت کا یقین دلا کر آسانی سے مطمئن کیا جاسکتا ہے' اس نے ایسا ہی کیا' شیطان نے اپنی کاروائی جاری رکھی لڑکی کے گھر والوں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ راہب نے تمہاری لڑکی کو حاملہ کرنے کے بعد رسوائی کے خوف سے قتل کر دیا' وہ لوگ راہب کے پاس آئے' اور اس سے لڑکی کے متعلق پوچھا' راہب نے وہی جواب دیا جو شیطان نے اس کے دل میں اِلقاء کیا تھا کہ لڑکی بیمار تھی مرگئی' لیکن گھر والوں نے یقین نہیں کیا' اور راہب کو قصاص کے لیے گرفتار کرنا چاہا۔ اس شیطان نے راہب کو بتلایا کہ یہ تمام "کارنامے" میرے تھے میں نے ہی لڑکی کا گلا گھونٹا تھا' میں نے ہی لڑکی کے ماں باپ کو تیرے پاس آنے پر آمادہ کیا تھا' میں نے ہی تجھے اس کے ساتھ زنا پر اور پھر اسے قتل کر دینے پر اکسایا تھا اب میں ہی تجھے ان سے نجات دلا سکتا ہوں' اگر تو نجات چاہتا ہے تو میری اطاعت کر' راہب نے کہا کس طرح؟ شیطان نے کہا کہ مجھے دو سجدے کر' راہب بدبخت نے شیطان کو سجدے کئے' اور وہ یہ کہتا ہوا چل دیا کہ میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا' میں تجھے کیا جانوں؟ اسی طرح کے لوگوں کے متعلق باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

کَمَثَلِ الشَّیْطَانِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اکْفُرْ فَلَمَّا کَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْءٌ مِّنْکَ (پ ٢٨ ر ٥ آیت ١٦)

شیطان کی سی مثال ہے کہ (اوّل تو) انسان سے کہتا ہے کہ تو کافر ہو جا پھر جب وہ کافر ہو جاتا ہے تو اس وقت صاف کہہ دیتا ہے کہ میرا تجھ سے واسطہ نہیں ہے۔

غور کیجئے' شیطان نے اپنے حیلوں سے راہب کو ان کبیرہ گناہوں کے ارتکاب پر مجبور کر دیا محض اس کا حکم مان کر' حالانکہ اگر وہ علاج کے شیطانی وسوسے پر عمل نہ کرتا تو نہ زنا جیسے فعل بد کا مرتکب ہوتا اور نہ قتل کی ضرورت پیش آتی۔ بظاہر علاج کی تدبیر بہت اچھی تھی' کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اس میں شر ہو سکتا ہے' بہر حال شیطان کی حکمت عملی یہی ہے کہ وہ شر کے

نسائی' حاکم۔

لیے خیر کی راہ تلاش کرتا ہے' اور شر کے راستے پر ڈال کر ایک شر سے دوسرے شر کی طرف کھینچتا رہتا ہے' نجات کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں' اور آدمی نہ چاہنے کے باوجود اسی راستے پر قدم بڑھانے پر مجبور ہو جاتا ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہی ہے:۔

من حام حول الحمی یوشک ان یقع فیہ (بخاری و مسلم۔ نعمان بن بشیرؓ)

جو شخص چراگاہ کے ارد گرد پھرے گا کیا عجب ہے کہ اس میں چلا جائے۔

ہم ابتدائی امور کے ضائع جانے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

دل میں داخل ہونے کے شیطانی راستے

قلب کی مثال ایک قلعے کی سی ہے' اور شیطان اس دشمن کی طرح ہے جو قلعے میں داخل ہونا چاہتا ہے تاکہ اس پر قبضہ کر سکے اور اسے اپنی ملکیت بنا سکے' دشمن سے قلعہ کی حفاظت کی صرف ایک صورت یہی ہے کہ ان دروازوں اور گزرگاہوں کی حفاظت کی جائے جن سے قلعہ میں داخلہ ممکن ہے' جو شخص دروازوں ہی سے واقف نہیں وہ ان کی حفاظت کیا کر سکے گا؟ اور دشمن کو اندر آنے سے کیسے روک سکے گا؟ اس سے معلوم ہوا کہ قلب کو شیطانی وسوسوں سے بچانا واجب ہے' بلکہ ہر عاقل بالغ شخص پر فرض عین ہے' اور وہ چیز بھی واجب ہے جو فرض عین تک پہنچنے کا ذریعہ ہو' کیونکہ شیطان کو اس کے داخلے کے راستوں سے واقف ہوئے بغیر دل سے دور نہیں رکھا جا سکتا اس لیے ان راستوں کی معرفت بھی ضروری ہے' اور وہ راستے جتنی دروازے یا گزرگاہیں نہیں ہیں بلکہ بندے کے اوصاف ہیں' ان ہی اوصاف کو اپنے داخلے کا وسیلہ بناتا ہے' یہ اوصاف بہت زیادہ ہیں' ہم صرف چند ابواب کی طرف اشارہ کریں گے جن پر شیطانی لشکروں کی کثرت رہتی ہے۔

<u>غضب اور شہوت</u> : قلب کے دو بڑے دروازے ہیں غضب اور شہوت غصہ سے عقل زائل ہو جاتی ہے' اور جب عقل کا لشکر کمزور پڑتا ہے تو شیطان کا لشکر حملہ کر دیتا ہے' اور جب انسان غضب کا شکار ہوتا ہے تو شیطان اس سے اس طرح کھیلتا ہے جس طرح بچہ گیند سے کھیلتا ہے۔ روایت ہے کہ ابلیس حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملا' اور کہنے لگا: اے موسیٰ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا ہے اور آپ کو اپنے آپ سے ہم کلام ہونے کا شرف عطا کیا ہے' میں بھی اللہ کی مخلوق ہوں' مجھ سے ایک گناہ سرزد ہو گیا ہے' میں توبہ کرنا چاہتا ہوں' آپ اللہ تعالیٰ سے میری سفارش کر دیجئے کہ وہ میری توبہ قبول کر لیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے سفارش کا وعدہ کیا' حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر تشریف لے گئے' اور باری تعالیٰ سے گفتگو کی' گفتگو کے بعد واپس نیچے اُترنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! امانت ادا کرو۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا: اے اللہ! تیرا بندہ ابلیس اپنے گناہ پر نادم ہے' اور توبہ کر رہا ہے' آپ اس کی توبہ قبول فرمالیں۔ وحی آئی کہ اے موسیٰ! تمہاری درخواست قبول کر لی گئی ہے' ابلیس سے کہو کہ وہ اظہارِ ندامت کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کرے' حضرت موسیٰ نے ابلیس کو اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچا دیا' ابلیس غصے سے بھڑک اُٹھا' اور تکبر سے کہنے لگا کہ میں نے زندہ آدم کو سجدہ نہیں کیا تھا اب مُردہ آدم کو کیا سجدہ کروں گا؟ تاہم آپ نے میری سفارش کی' اس کا شکریہ' آپ کا مجھ پر حق ہے' میں اسی حق کی ادائیگی کے لیے آپ کو یہ بات بتلاتا ہوں کہ مجھے تین موقعوں پر یاد رکھئے میں نقصان نہ پہنچا سکوں گا' ایک غصہ کے وقت' اس لیے کہ میری روح آپ کے دل میں' اور میری آنکھ آپ کی آنکھ میں ہے' میں جسم کی رگ رگ میں خون کی طرح گردش کرتا ہوں' اس لیے غصہ کے وقت میرا دھیان ضرور کر لیا کیجئے' انسان جب غصہ کرتا ہے تو میں اس کی ناک میں پھونک دیتا ہوں' پھر اسے خبر نہیں رہتی کہ وہ کیا کر رہا ہے' دوسرے جنگ کے موقع پر کیونکہ جب آدمی محاذِ جنگ پر دشمن کے مقابلے میں صف آراء ہونا چاہتا ہے تو میں اسے اس کے گھر بار' اور بیوی بچوں کی یاد دلا دیتا ہوں'

تاکہ وہ جنگ کا تصور دل سے نکال دے اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے' تیسرے نامحرم عورت سے ملنے کے وقت' کسی نامحرم عورت کے پاس خلوت میں ہرگز نہ بیٹھئے' میں تنہا مرد اور عورت کے درمیان دلوں کا پیغامبر بن جاتا ہوں' اور ایک کے وسوسے دوسرے کے دل میں ڈالتا رہتا ہوں' اور اس وقت تک یہ حرکت کرتا رہتا ہوں جب تک وہ دونوں فتنے میں مبتلا نہیں ہو جاتے۔

حرص و حسد : ابلیس نے تین مواقع کے ذریعہ تین صفات کے طرف اشارہ کیا ہے' غضب' شہوت اور حرص' اس لیے کہ جنگ سے فرار دنیاوی مال و دولت کی حرص ہی کی وجہ سے تو ہے' مردود آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنا حسد کے باعث ہے' یہ بھی شیطان کا ایک بڑا مدخل ہے' کسی بزرگ نے شیطان سے کہا کہ مجھے انسان پر اپنے غلبے کا مشاہدہ کرا' اس نے کہا کہ میں انسان کو غضب اور شہوت کی حالت میں پکڑتا ہوں اور قابو پالیتا ہوں ایک راہب کے سامنے ابلیس مجسم ہو کر آیا تو راہب نے اس سے پوچھا کہ بنی آدم کی کونسی عادت یا وصف تیرے لیے زیادہ معین و مددگار ہوتا ہے؟ اس نے کہا: غصے کی شدت! چنانچہ جب انسان غصے کی شدت سے کھول اٹھتا ہے تو ہم اسے اس طرح الٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہیں جس طرح بچے گیند کو اپنے پاؤں سے اِدھر اُدھر لڑھکا دیتے ہیں' یہ بھی شیطان ہی کا قول ہے کہ بنی آدم مجھ پر کس طرح قابو پاسکتا ہے جب وہ خوش ہوتا ہے تو میں اس کے دل میں رہتا ہوں اور جب وہ غصہ میں ہوتا ہے تو میں اُڑ کر اس کے سر میں پہنچ جاتا ہوں۔ حرص بھی شیطان کا بڑا دروازہ ہے' حرص انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے' پھر نہ وہ کوئی اچھی بات سنتا ہے' اور نہ اچھائی کا راستہ دیکھتا ہے' حدیث شریف میں ہے:

حبک الشئ یعمی و یصم (ابو داؤد۔ ابو الدرداءؓ)

کسی چیز سے تیری محبت (تجھے) اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔

نورِ بصیرت ہی سے انسان شیطانی مداخل سے واقف ہو سکتا ہے' جب حرص کی تاریکی بصیرت کے نور پر غالب آجاتی ہے تو پھر کوئی راہ نہیں سوجھتی' شیطان اس موقعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے اور ہر اس چیز کی خواہش اور حرص اس کے دل میں ڈال دیتا ہے جو اس کے لیے مضر اور مہلک ہو' روایت ہے کہ جب سیلاب آیا' اور حضرت نوح اپنی قوم کے اہل ایمان اور ہر ہر جوڑے کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے تو انہوں نے ایک اجنبی بوڑھے کو بھی کشتی میں بیٹھا ہوا دیکھا' آپ نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا کہ میں آپ کے رفیقوں کے دل لینے آیا ہوں' ان کے بدن آپ کے ساتھ رہیں گے اور دل میرے ساتھ ہوں گے' حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: او دشمن خدا یہاں سے نکل' تیرے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے' اس نے کہا: پانچ باتیں ہیں جن سے میں لوگوں کو ہلاک کرتا ہوں' ان میں سے تین میں بتلا دوں گا دو نہیں بتلاؤں گا' وحی آئی کہ اے نوح! ان تین باتوں کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے جو وہ بتلانا چاہتا ہے اس سے دو باتیں معلوم کرو جنہیں وہ چھپا رہا ہے' آپ نے اس سے پوچھا وہ دو باتیں کون سی ہیں' اس نے کہا: حسد اور حرص' یہ دو باتیں مجھے کبھی دھوکا نہیں دیں گی اور لوگوں کو ہلاک کرنے میں کبھی خطا نہیں کریں گی' یہ حسد ہی تو ہے جس کی وجہ سے مجھ پر لعنت کی گئی اور مجھے "مردود شیطان کا لقب دیا گیا' اور حرص یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے ایک درخت کے علاوہ تمام جنت مباح ہوئی تھی' میں نے ان کے دل میں اس درخت کی حرص پیدا کی' اور انہیں جنت سے نکلوایا۔

شکم سیری : پیٹ بھر کھانا بھی خواہ وہ حلال اور صاف ستھرا ہی کیوں نہ ہو شیطان کے داخل ہونے کا بڑا راستہ ہے' اس لیے کہ شکم سیری سے شہوتوں کو تقویت ملتی ہے' اور شہوتیں شیطان کے ہتھیار ہیں' روایت ہے کہ ابلیس حضرت یحییٰ ابن زکریا علیہما السلام کے سامنے آیا' اس کے پاس پھندے تھے' آپ نے اس سے پوچھا کہ یہ پھندے کیسے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ یہ شہوتوں کے پھندے ہیں' میں ابن آدم کو ان پھندوں میں پھنسا لیتا ہوں' آپ نے پوچھا کہ ان میں کوئی پھندہ میرے لیے بھی ہے' اس نے کہا: ہاں! جب آپ پیٹ بھر کھا لیتے ہیں تو میں آپ پر نماز اور ذکر دشوار کر دیتا ہوں آپ نے فرمایا: اس کے علاوہ بھی کچھ ہے' اس نے جواب دیا نہیں: فرمایا: خدا کی قسم آج کے بعد سے کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں کھاؤں گا' اس نے کہا: میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ مسلمان کو

کبھی خیر کی بات نہیں بتلائیں گے کہتے ہیں کہ زیادہ کمانے میں چھ خرابیاں ہیں ایک یہ کہ دل میں اللہ کا خوف باقی نہیں رہتا' دوسری یہ کہ مخلوق پر رحم نہیں آتا کیوں کہ شکم سیر وہ بھوکوں کو بھی اپنے ہی جیسا سمجھتا ہے اور بھوک کی اذیت محسوس نہیں کرتا' تیسری یہ کہ عبادت سے گراں باری ہوتی ہے چوتھی یہ کہ جب کوئی حکمت کی بات سنتا ہے تو دل میں سوز و گداز اور سمع و قبول کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی پانچویں یہ کہ جب وہ خود حکمت و موعظت کی باتیں کرتا ہے تو لوگوں کے دلوں میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا چھٹی یہ کہ اس سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

ظاہری زیب و زینت : ظاہری زیبائش کا اچھا لگنا بھی شیطانی دروازہ ہے یہ زیبائش لباس' ساماں اور مکان میں ہوتی ہے' چنانچہ جب شیطان کسی انسان کے دل میں ظاہری زیب و زینت کی ادنیٰ خواہش دیکھتا ہے تو وہ اسے خوب ہوا دیتا ہے' اسے اونچی اونچی بلڈنگوں کے خواب دکھلاتا ہے' اور اسے یہ باور کراتا رہتا ہے کہ مکان کی دیواریں اونچی ہوں' آراستہ پیراستہ ہوں لباس خوبصورت ہو' سواری قیمتی اور مزین ہو' جب دل میں یہ خواہشات اچھی طرح جاگزیں ہو جاتی ہیں تو وہ اپنی واپسی کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ یہ خواہشات اب کبھی اس کے دل سے جُدا نہیں ہو سکتیں' ایک خواہش سے دوسری خواہش جنم لیتی ہے' ایک چیز کے حصول کے بعد دوسری چیز کے حاصل کرنے کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے' یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے' حتیٰ کہ موت آجاتی ہے اور سب کچھ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہونا پڑتا ہے' نفسانی خواہشات کا شیطانی راستہ ایمان کے لیے بھی خطرناک ہے' بعض اوقات آتشِ شوق اپنے پجاری کو کفر کے راستوں پر چلنے پر مجبور کر دیتی ہے' اللہ تعالیٰ نفس کی خواہشوں سے ہماری حفاظت فرمائے۔

لوگوں سے طمع : طمع بھی شیطان کا اہم دروازہ ہے' جب دل پر طمع غالب ہوتی ہے تو شیطان مسلسل اسے اس بات پر اُکساتا رہتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے سامنے تصنع' تکلف اور ریاکاری کرے جن سے طمع رکھتا ہے' انتہا یہ ہوتی ہے کہ مطموع (جس سے طمع کی جائے) اس کا معبود بن جاتا ہے' اور طامع (طمع رکھنے والا) مسلسل اس کی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح مطموع کے دل میں اپنے لیے جگہ پیدا کرلے' خواہ اس کے لیے جھوٹ' فریب' ریا اور تلبیس ہی سے کام کیوں نہ لینا پڑے' ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ طامع' مطموع کی تعریف میں غلو کرتا ہے' اور اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے میں مُداہنت سے کام لیتا ہے' محض اس لیے کہ وہ ناراض نہ ہو جائے' حضرت صفوان ابن سلیم سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ شیطان عبداللہ ابن حنظلہ کے سامنے آیا' اور کہنے لگا اے حنظلہ کے بیٹے! میں تمہیں ایک نصیحت کرتا ہوں یاد رکھنا' ابن حنظلہ نے کہا مجھی تیری نصیحت کی ضرورت نہیں ہے' شیطان نے کہا کہ پہلے بات سُن لو' اگر اچھی ہوئی تو قبول کر لینا' بُری ہوئی تو رَد کر دینا' اے ابن حنظلہ! اللہ کے علاوہ کسی شخص سے ایسا سوال مت کر جس میں طمع پائی جاتی ہو' نیز غصہ کے وقت اپنے اوپر قابو رکھنا' اس لیے کہ بندہ اپنے قابو میں نہیں رہتا تو میں اس پر قابو پا لیتا ہوں۔

عجلت اور عدم استقلال : یہ دونوں وصف بھی شیطانی مدخل ہیں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

العجلة من الشیطان والاناة من اللہ (ترمذی۔ سہل بن سعدؓ)

جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے' اور توقف (ٹھہر ٹھہر کر کام کرنا) اللہ کی طرف سے ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (پ ۱۷ ر ۳ آیت ۳۷)

انسان جلدی (کے خمیر) سے بنا ہوا ہے۔

وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلاً (پ ۱۵ ر ۲ آیت ۱۱)

اور انسان (کچھ طبعاً ہی) جلد باز (ہوتا) ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ (پ ۱۶ ر ۱۵ آیت ۱۴)

اور قرآن (پڑھنے) میں قبل اس کے کہ آپ پر اس کی پوری وحی نازل ہوچکے عجلت نہ کیا کیجئے۔

عجلت سے منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کام علم اور تحقیق کے ساتھ ہونا چاہئے' اور تحقیق کے لیے تأمل ورمہلت کی ضرورت ہے جب کہ عجلت میں نہ تأمل ہوسکتا ہے' اور نہ مہلت کی گنجائش ہے۔ جلد بازی کے وقت انسان پر شیطان اپنا شر اس طرح مسلط کردیتا ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوتی' روایت ہے کہ جب حضرت عیسٰی علیہ السلام پیدا ہوئے تو تمام شیاطین اپنے آقا ابلیس کے پاس پہنچے' اور کہنے لگے کہ آج روئے زمین کے تمام بُت سر کے بل اوندھے نظر آئے' ابلیس نے کہا کہ یقیناً آج کوئی نئی بات پیش آئی ہے' تم یہاں ٹھہرو' میں زمین پر جاکر دیکھتا ہوں' ابلیس نے گھوم پھر کردیکھا کچھ نظر نہ آیا' ایک جگہ کچھ فرشتوں پر نظر پڑی' وہ ایک بچے کو گھیرے ہوئے تھے' ابلیس اپنی قوم کے پاس واپس گیا' اور انہیں بتلایا کہ آج رات ایک نبی پیدا ہوئے ہیں اب تک دنیا میں جتنے حمل ٹھہرے مجھے ان کی خبر رہی' اور میری ہی موجودگی میں وضع حمل ہوا' لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مجھے نہ اس عورت کے حمل کی اطلاع ہوئی' اور نہ وضع حمل کا پتا چلا' اب بتوں کی پرستش سے تو مایوس ہوجاؤ' تاہم بندگانِ خدا کو جلدی کے اوقات میں بہکایا کرو۔

<u>مال و دولت</u> : درہم و دینار' مال و متاع' زمین جائداد یہ سب چیزیں بھی شیطان کے لئے بڑے دروازے کی حیثیت رکھتی ہیں' ضرورت سے زائد مال رکھنے والے شخص کا دل شیطان کا مستقر ہے' اور رزق کی ضروری مقدار رکھنے والا شخص فارغ القلب ہے' اگر کسی شخص کے پاس سو دینار آجائیں تو اس طرح کی خواہشات اس کے دل میں پیدا ہوجاتی ہیں' ان میں سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسی طرح کے سو دینار اور مل جائیں' اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا' جب اس کے پاس کچھ نہیں تھا تو اس کے دل میں نہ خواہش تھی' نہ ہوس تھی' نہ احتیاج تھی' سو دینار کیا ملے وہ یہ سمجھ بیٹھا کہ میں مالدار بن گیا' حالانکہ وہ مزید نو سو کا محتاج ہوگیا' سو دینار ملنے سے یہ خیال آتا ہے کہ اگر نو سو ہوتے تو ایک مکان خرید لیتے' مکان کے بعد خانہ داری کے ساز و سامان کی ضرورت سامنے آتی ہے' لباس اور آرائش کے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں' اور یہ سلسلہ دراز ہوجاتا ہے' موجود کے لیے غیر موجود لازم بن جاتی ہے' ایک کی فکر ختم نہیں ہوتی کہ دوسرے کی فکر دامن پکڑ لیتی ہے' اور یہ سلسلہ جہنم پر منتہی ہوتا ہے ثابت البنانیؒ کہتے ہیں کہ جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا کی گئی تو ابلیس نے اپنے گروہ سے کہا کہ آج کوئی نیا واقعہ رونما ہوا ہے' جاؤ دیکھو کیا ہوا ہے؟ تمام شیاطین روئے زمین پر پھیل گئے' مگر انہیں کسی واقعے کا سُراغ نہ ملا' ناکام واپس آئے' ابلیس نے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو' میں جاکر دیکھتا ہوں' اس نے آکر اپنے چیلوں کو بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا فرمائی ہے' اب تم ان کے دوستوں اور رفیقوں کے پیچھے لگ جاؤ' شیاطین نے زمین کا رُخ کیا' اور ناکام واپس آئے' اور کہنے لگے کہ ہم نے ایسے لوگ آج تک نہیں دیکھے جب ہم ان سے کوئی غلطی کرادیتے ہیں تو وہ نماز کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں' اس سے ان کی خطائیں معاف کردی جاتی ہیں' ابلیس نے کہا' انتظار کرو' اور صبر سے کام لو' عنقریب یہ لوگ دنیا فتح کریں گے تب ہم اپنی تدبیر میں ضرور کامیاب ہوں گے۔

روایت ہے کہ ایک روز حضرت عیسٰی علیہ السلام پتھر پر سر رکھ کر لیٹے ہوئے تھے' شیطان ادھر سے گذرا تو اس نے کہا اے عیسٰی! آپ بھی دنیا کی طرف راغب ہیں؟ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے سر کے نیچے سے پتھر نکال کر شیطان کی طرف پھینک دیا اور فرمایا کہ یہ پتھر اور دنیا کی دوسری چیزیں تیرے ہی لیے ہیں' اس واقعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پتھر بھی دنیاوی متاع ہے' اور شیطان

یہ روایت ابن ابی الدنیا نے مکائد الشیطان میں بطریق ارسال نقل کی ہے۔

اس کے حوالے سے بھی اپنا کام کرسکتا ہے' مثلاً یہ کہ ایک شخص تہجد کے لیے بیدار ہوا اور سجدہ گاہ کے قریب ہی کوئی ایسا پتھر پڑا ہوا ہو جس پر تکیہ لگایا جاسکتا ہے' اس صورت میں شیطان اس کے دل میں یہ بات ضرور ڈالے گا کہ تھوڑی دیر کے لیے اس پتھر پر سر رکھ کر لیٹ جائے' یہ لیٹنا نیند کا پیش خیمہ ہوگا' اور نیند سے تہجد کی نماز فوت ہوگی' اگر یہ پتھر نہ ہوتا تو نہ تکیہ کا خیال آتا' نہ لیٹنے کی ضرورت ہوتی' نہ نیند آتی' اور نہ تہجد کی نماز فوت ہوتی' اس ایک پتھر سے اتنا نقصان ہوا' ان لوگوں کی حالت پر عبرت کی نظر ڈالو جن کے گھروں میں ریشم و کم خواب کے بستر آرام دہ تکیے اور راحت طلبی کے تمام لوازم موجود ہیں ایسا شخص عبادت الٰہی سے کیا خاک لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ اس کے دل میں تو ہروقت آرام کی خواہش رہے گی۔

فقر کا خوف اور بُخل : یہ دونوں رذیلے بھی شیطان کے دو بڑے مدخل ہیں بخل اور فقر کا خوف دونوں ہی ایسے رذیلے ہیں کہ آدمی کو راہِ خدا میں خرچ کرنے سے روکتے ہیں' اور ذخیرہ اندوزی' اور جمع و احتکار کی ترغیب دیتے ہیں' ایسے لوگوں کے لیے قرآن کریم میں دردناک عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (پ ۱۰ ر ۱۱ آیت ۳۴)

جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو آپ ان کو ایک بڑی درد ناک سزا کی خبر سنا دیجئے۔

خیثمہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ شیطان کا دعویٰ یہ ہے کہ آدمی مجھ پر کتنا ہی غلبہ کیوں نہ پالے لیکن تین باتیں ایسی ہیں جن میں وہ مجھ پر فوقیت حاصل نہیں کرسکتا' ایک یہ کہ کسی کا مال ناحق لینا دوسرے یہ کہ اس مال کو بلا موقع اور بغیر ضرورت خرچ کرنا' تیسرے یہ کہ جہاں خرچ کی ضرورت ہو وہاں خرچ نہ کرنا۔ سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ شیطان کے پاس فقر کا خوف دلانے سے زیادہ مؤثر حربہ کوئی دوسرا نہیں ہے' جب کوئی شخص فقر سے ڈرنے لگتا ہے تو اس میں باطل کی رغبت پیدا ہوجاتی ہے حق سے باز رہتا ہے خواہش نفس کو ترجیح دیتا ہے اور اپنے رب سے بدگمانی کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے' بخل سے حرص پیدا ہوتی ہے اور حرص آدمی کے پاؤں میں زنجیر بن جاتی ہے اسے بازاروں اور مال کمانے کی جگہوں سے ہلنے نہیں دیتی یہ بازار شیاطین کے گھونسلے اور ٹھکانے ہیں' ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ جب ابلیس دنیا میں آیا تو اس نے باری تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اے اللہ! تو نے مجھے مردود قرار دے کر زمین میں پھینک دیا ہے' میرے لیے ایک گھر بنا دے' فرمایا: حمام تیرا گھر ہے' عرض کیا: میرے اٹھنے بیٹھنے کی جگہ مقرر فرما' فرمایا: بازار اور چوراہے تیری مجلسیں ہیں۔ عرض کیا: غذا کی تعیین بھی کردے' فرمایا: وہ کھانا تیری غذا ہے جس پر میرا نام نہ لیا جائے' عرض کیا: کھانے کا علم ہوا' پانی بھی عطا ہو' فرمایا: نشہ آور چیزیں تیری مشروبات ہیں' عرض کیا کہ مجھے ایک اعلانچی بھی عنایت کر' حکم ہوا کہ یہ کام مزامیر سے لے' عرض کیا: پڑھنے اور لکھنے کے سلسلے میں کیا حکم ہے؟ فرمایا: (فرسودہ) شعر پڑھ' اور بدن گوند۔ عرض کیا: مجھے حدیث بھی عطا فرما' حکم ہوا کہ جھوٹ تیری حدیث ہے' عرض کیا کہ مجھے شکار پھانسنے کے لیے جال مرحمت کر' فرمایا: عورتیں تیرا جال ہیں۔

مذہبی عصبیت : مذہبی عصبیت سے یہاں مراد فقہ کے مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا باہمی تعصب ہے اس تعصب کی بنیاد حق پر نہیں ہے بلکہ نفس کی خواہشات پر ہے' لوگ اپنے مخالفین سے نفرت کرتے ہیں اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں' یہ ایک ایسی آفت ہے جو عابد و فاسق ہر شخص کو مبتلائے ہلاکت کردیتی ہے' لوگوں کو نکتہ چینی عیب جوئی کرنا سبھی صفات سے تعلق رکھنے والی ایک طبعی صفت ہے' جب شیطان اس مذموم صفت کو محمود بنا کر پیش کرتا ہے تو طبائع۔ جو پہلے ہی اس سے قریب ہوتی ہیں۔ یہ صفت اپنا لیتی ہیں' اور آدمی پوری تن دہی کے ساتھ اس مشغلے میں لگ جاتا ہے اور اس خیال سے خوش رہتا

ہے کہ میں کسی دینی جدوجہد میں مصروف ہوں' حالانکہ وہ شیطان کی اتباع میں لگا ہوا ہے' مذہبی اور گروہی اختلافات کا عالم یہ ہے کہ ایک شخص حضرت ابوبکر صدیقؓ کی محبت میں تعصب کا رنگ اختیار کیے ہوئے ہے مگر اس کی یہ محبت پاکیزہ نہیں ہے' بلکہ اس میں حرام' جھوٹ' عناد' اور فساد کی آمیزش ہے' ایسے شخص کو اگر حضرت ابوبکرؓ دیکھ لیں تو اپنا دوست سمجھنے کے بجائے دشمن قرار دیں' اس لیے کہ ان کا دوست تو وہ ہے جو ان کی راہ پر چلتا ہو' ان کی سیرت و کردار کو اپنے لیے نمونہ عمل بناتا ہو' اور زبان کو لغو کلام سے روکتا ہو' حضرت ابوبکرؓ کا اُسوہ یہ تھا کہ وہ اپنے منھ میں زبان بند رکھنے کے لیے کنکری ڈال لیا کرتے تھے' اس فضولی اور لغو گو کو کیا حق ہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اپنی محبت اور دوستی کا دعویٰ کرے دوسرا شخص حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کی محبت میں مبالغہ کی تمام حدود کو تجاوز کر گیا ہے حالانکہ وہ ان کے عمل و کردار سے ذرا بھی قریب نہیں ہے' حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے اپنے دورِ خلافت میں ایک درہم سے بھی کم قیمت کا لباس پہنا ہے' جب کہ ان کی محبت کا جھوٹا مدّعی فاسق ریشمی کپڑوں سے اپنی بدن کو سجائے پھر رہا ہے' اور وہ کپڑے حرام مال سے بنائے گئے ہیں' قیامت کے روز حضرت علیؓ اسے اپنے دوست نہیں دشمن تصوّر کریں گے' کیا کسی ایسے شخص کو اپنے دعویٰ دوستی میں سچا قرار دیا جاسکتا ہے جو اپنے دوست کے لختِ جگر کو اپنے گھر لے جائے اور اسے خوب مارے پیٹے' اس کے بال نوچے' اور بدن کو زخموں سے چھلنی کردے اور اس کے باوجود یہ دعویٰ کرتا رہے کہ میں اس بچے کے باپ کا مخلص دوست ہوں' مجھے اس سے بڑی محبت ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو خلفاءِ اربعہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور دین کی بیخ کنی میں مصروف ہیں حالانکہ دین ان کی عزیز ترین متاع تھی' وہ دین کو اپنی جان' مال' اہل اور عیال ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے' یہ شریعت کے مجرم شہوات کی قینچیوں سے شریعت کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں' صحابہ کرام کی محبت کا دم بھرتے ہیں اور حقیقت میں اللہ اور اس کے دوستوں کے مشترک دشمن شیطان لعین کی اتباع کرتے ہیں' یہ حقیقت قیامت کے روز واضح ہوگی جب انہیں ان کے "دوستوں" کے سامنے عذاب دیا جائے گا' قیامت کی بات تو رہنے دیجئے اگر ان مدّعیانِ محبت کو دنیا ہی میں یہ پتا چل جائے کہ صحابہ کرام ان کے متعلق کیا خیالات رکھتے ہیں اور انہیں کس طرح کے لوگ پسند ہیں تو وہ اپنا حال دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جائیں' اور آئندہ ان بزرگوں کے پاکیزہ نام اپنی گندی زبانوں پر لانے کی جرأت نہ کریں۔ شیطان لعین ان متعصبین کو یہ بھی باور کراتا رہتا ہے کہ اگر کوئی شخص حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی محبت میں مرجائے تو آگ اس کے قریب بھی نہیں آئے گی' دوسرے کو یقین دلاتا ہے کہ اگر تو حضرت عثمانؓ و علیؓ کی محبت میں جان دے دے تو بلا حساب جنت میں جائے گا' حالانکہ قیامت میں کسی کی محبت اور کسی کی قربت کام نہ آئے گی' اپنا عمل کام آئے گا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہؓ سے فرمایا تھا: اعملی فانی لا اغنی عنک من اللہ شیئاً (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

عمل کرو' اس لیے کہ میں تیری طرف سے خدا تعالیٰ کی کسی چیز کو نہیں بچا سکتا۔

یہ ہوائے نفسانی کی ایک مثال ہے جو ہم نے ذکر کی' یہی حکم ان لوگوں کا ہے جو ائمۂ مذاہب شافعیؒ' ابو حنیفہؒ' مالکؒ اور احمدؒ وغیرہ کے لیے تعصب رکھتے ہیں' اور اس تعصب میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ دوسرے ائمہ کی تحقیر لازم آتی ہے' ہر شخص اپنے امام کی حقانیت کا دعویٰ دار ہے' لیکن ان کی سیرت کا اتباع نہیں کرتا' قیامت کے روز یہ ائمہ اپنے ان جھوٹے دعویٰ داروں سے پوچھیں گے کہ ہمارا مذہب عمل تھا' قول نہیں تھا' قول بھی عمل کے لیے تھا' پھر کیا وجہ ہے کہ تم نے قول کو اہمیت دی' اور عمل سے اعراض کیا' تم نے ہمارے عمل ہماری سیرت اور کردار کی مخالفت کی' اور ہمارے مذہب کی تقلید کا جھوٹا دعویٰ کرتے رہے؟ یہ ایک زبردست شیطانی مدخل اور اس کی آمد کا بڑا راستہ ہے' بہت سے علماء اس راہ کے شیطان کے ہاتھوں ہلاکت تک پہنچے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں خدا کا خوف نہیں ہے' جو دنیا کی حرص اور رغبت رکھتے ہیں' ان کی دینی بصیرت کمزور ہے' اتباع میں اخلاص کے بجائے لوگوں کی عقیدت اور احترام حاصل کرنے کا جذبہ ہے' اور اسی لیے وہ مذہبی عصبیت کا شکار ہیں اور اس عصبیت کو اچھا سمجھتے ہیں' انہیں خبر نہیں کہ یہ عصبیت شیطانی عمل ہے' لیکن افسوس! یہ لوگ شیطان کی فریب کاریوں سے واقف نہیں ہیں' بلکہ اس کی

تدابیر کی عملی تنفیذ میں مصروف ہیں' عام لوگ علماء کی تقلید کرنے لگے ہیں' دین کے اصول بھلادئے گئے ہیں' اور فقہی جزئیات کے اختلاف کو اہمیت دی جانے لگی ہے یہ علماء خود بھی تباہ ہوئے اور دوسروں کو بھی برباد کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی اور ہماری توبہ قبول فرمائے۔ حضرت حسن بصریؒ نے شیطان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے معصیتوں کو سجا سنوار کر پیش کیا تو انہوں نے استغفار کے ذریعہ میری کمر توڑ دی' اس کے بعد میں نے ایسے گناہ آراستہ کئے جن سے وہ اللہ سے استغفار نہیں کرتے' یہ گناہ خواہشات نفسانی ہیں' شیطان نے سچ کہا ہے' لوگوں کو ان امور میں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ گناہ کی طرف جارہے ہیں اس لیے استغفار ہی کیا کریں گے۔

شیطان کا ایک بڑا حیلہ یہ ہے کہ انسان اپنے فرائض بھول کر ان اختلافات میں پڑجائے جو فقہی اور اعتقادی مسائل میں موجود ہیں' حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے میں مصروف تھے کہ شیطان آیا' اور اس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ لوگ مجلس سے اٹھ کر چلے جائیں' اور ذکر کا سلسلہ منقطع ہوجائے' لیکن وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا' ذاکرین نے اس کی ہر تدبیر ناکام کردی' مجبوراً قریب میں بیٹھے ہوئے کچھ ایسے لوگوں کو فساد پر آمادہ کیا جو دنیا کی باتوں میں مشغول تھے' وہ لوگ باتوں ہی باتوں میں ایک دوسرے سے لڑنے لگے' نوبت کشت وخون تک جاپہنچی' ذاکرین کے حلقے میں سے کچھ لوگوں نے اٹھ کر انہیں روکا' اور جھگڑا کرنے سے منع کیا' یہاں شیطان کا مقصد جھگڑا کرانا نہیں تھا' بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ذکر کا سلسلہ منقطع ہوجائے' اور یہ لوگ منتشر ہوجائیں۔

عوام اور فلسفیانہ مباحث : شیطان کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ عوام کو ان علوم پر اکساتا ہے جن پر انہیں تبحر ہوتا' اور ان امور میں فکر کی دعوت دیتا ہے جن کے وہ متحمل نہیں ہوتے' مثلاً باری تعالیٰ کی ذات وصفات کا علم' اور اسی طرح کے دیگر مسائل جن کے ادراک سے ان کی ضعیف اور محدود عقلیں قاصر رہتی ہیں' اس صورت میں نہ انہیں اپنی عقلوں کا قصور نظر آتا ہے اور نہ کم علمی پر نظر جاتی ہے' وہ اصل دین ہی میں شک کرنے لگتے ہیں' اور باری تعالیٰ کے متعلق اس طرح کے خیالات ان کے ذہنوں میں پیدا ہوجاتے ہیں جن سے دائرۂ اسلام سے نکل کر کفر اور بدعت کے دائرے میں چلے جاتے ہیں' انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا' اور ایمان کی متاع عزیز لٹ جاتی ہے بلکہ وہ اس محرومی پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے قلب میں جو کچھ واقع ہوا ہے وہی اصل معرفت اور بصیرت ہے' اور یہ معرفت ہمیں اپنی ذہانت اور زیادتی عقل سے حاصل ہوئی ہے' ان بیچاروں کو یہ معلوم نہیں کہ سب سے زیادہ بے وقوف وہ شخص ہے جو اپنی عقل پر زیادہ اعتماد کرے' اور سب سے زیادہ عقلمند وہ ہے جو اپنی عقل کو متہم سمجھے اور علماء سے پوچھتا رہے۔ حضرت عائشہؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتی ہیں:

ان الشیطان یاتی احدکم فیقول: من خلقک؟ فیقول اللہ تبارک وتعالیٰ فیقول فمن خلق اللہ؟ فاذا وجد احدکم ذالک فلیقل آمنت باللہ ورسولہ فان ذالک یذھب عنہ (احمد' بزار' ابو یعلی' بخاری' مسلم' ابوہریرہ)

شیطان تم میں سے کسی کے پاس آکر پوچھتا ہے تجھے کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: اللہ تبارک و تعالیٰ نے' وہ پوچھتا ہے: اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اگر تم میں سے کسی کو یہ حالت پیش آئے تو اسے کہنا چاہئے میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا۔ اس طرح کہنے سے وہ وسوسہ ختم ہوجائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہیں دی کہ ان وسوسوں کے علاج پر علمی بحث کی جائے' اس لیے کہ وسوسے عوام کو ہوتے ہیں علماء کو نہیں' عوام کو چاہئے کہ وہ ایمان واسلام کی تجدید کرتے ہوئے اپنی عبادات و معیشت میں مشغول رہیں' علم کو علماء کے لیے چھوڑدیں' عامی کے لیے زنا اور چوری اس سے بہتر ہے کہ علمی مباحث میں حصہ لے' اور اللہ اور اس کے دین کے متعلق بے بنیاد باتیں کرکے کفر تک جاپہنچے' علم صحیح میں رسوخ کے بغیر کچھ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی تیراکی نہ جاننے کے باوجود اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کی نذر کردے' ظاہر ہے اس کا انجام ہلاکت کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

عقائد اور مذاہب کے سلسلے میں شیطان کے فریب اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا' جو کچھ اس ضمن میں عرض کیا گیا ہے وہ ان فریب کاریوں کا ایک نمونہ ہے۔

بدگمانی : شیطانی فریب کا ایک دروازہ مسلمانوں کے ساتھ بدگمانی رکھنا ہے' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (پ ۲۶ ر ۱۴ آیت ۱۲)

اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچا کرو' کیونکہ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں۔

جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کے سلسلے میں بدگمانی کرے گا' وہ شیطان کے فریب کا شکار ضرور ہوگا' شیطان اس کی بدگمانی کو ہوا دے گا اور اسے ترغیب دے گا کہ وہ اس شخص کی غیبت کرے' یا اس کے حقوق ادا نہ کرے' یا اس کی تعظیم میں سستی کرے' اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھے اور اپنے آپ کو اس سے بہتر سمجھے یہ تمام صورتیں ہلاکت کی ہیں یہی وجہ ہے کہ شریعت نے تہمتوں سے بچنے کا حکم دیا ہے' سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

اتقوا مواضع التهم

تہمت کی جگہوں سے بچو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی تہمت سے احتراز فرماتے تھے' چنانچہ حضرت علی بن حسین اُمّ المؤمنین حضرت صفیہ بنت حی بن اخطب سے روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے' میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور (اتفاق سے) حائضہ ہوگئی جب شام ہوئی تو میں واپس چلی' آپ بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگے' راستہ میں دو انصاری مرد نظر آئے' انہوں نے سلام کیا اور ایک طرف کو ہوگئے' آپ نے انہیں آواز دی اور فرمایا کہ یہ صفیہ بنت حی ہیں۔ ان دونوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ہمیں تو آپ کے ساتھ خیر کا گمان ہے' آپ نے فرمایا: (تم صحیح کہتے ہو مگر) شیطان آدمی کی رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے مجھے یہ ڈر ہوا کہ وہ کہیں تمہیں بہکا نہ دے۔ غور کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے دین کی حفاظت اور آخرت کی بہتری کا کس قدر خیال تھا نیز اُمّت پر کس قدر شفقت فرمائی کہ انہیں تہمت سے بچنے کا طریقہ بتلایا' اور یہ بتلایا کہ اس عالم کو بھی اپنے احوال پر تساہل نہ کرنا چاہئے جو تقویٰ اور اتباعِ شریعت میں معروف ہو اسے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ لوگ مجھ سے بدگمانی نہیں کریں گے بلکہ اچھا ہی گمان رکھیں گے' آدمی کتنا ہی صاحبِ علم اور صاحبِ تقویٰ کیوں نہ ہو لوگ اسے ایک نظر سے نہیں دیکھتے کچھ لوگ اسے اچھا سمجھتے ہیں اور کچھ بُرا جانتے ہیں بلکہ بُرا سمجھنے والوں کی تعداد اچھا سمجھنے والوں سے زیادہ ہوتی ہے ایک شاعر کہتا ہے۔

ع وعين الرضا عن كل عيب كليلة ولكن عين السخط تبدي المساويا

(خوشی کی آنکھ ہر عیب کے لیے ایسی ہے جیسے رات (ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے) لیکن ناراضگی کی آنکھ سارے عیوب کھول کر رکھ دیتی ہے)

بدگمانی اور بُروں کی تہمت سے بچنا ضروری ہے بُرے لوگوں سے بدگمانی ہی کی توقع رکھنی چاہئے جب تم کسی شخص کو لوگوں سے بدگمانی اور ان کی عیب جوئی میں مصروف دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ باطن کے خبث میں مبتلا ہے بدگمانی اس کی خباثت کا عکس ہے' وہ ہر شخص کو اپنی ذات کے آئینے میں دیکھنا چاہتا ہے' مؤمن اپنے بھائی کے فعل کے لیے اعذار تلاش کر لیتا ہے' منافق کو عیب جوئی کے علاوہ کسی چیز کی توفیق نہیں ہوتی' مؤمن کا دل ہر شخص کی طرف سے صاف رہتا ہے۔

شیطان کے مداخل پر یہ ایک مختصر سی گفتگو تھی یہ مداخل اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے ہمارے خیال میں جو کچھ لکھا گیا اور جتنے مداخل کا تذکرہ ہوا اس پر باقی مداخل کو قیاس کیا جاسکتا ہے آدمی کے اندر جتنے بھی مذموم اوصاف ہیں ان میں سے ہر وصف شیطان کا ہتھیار اور اس کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔

شیطان سے بچنے کا راستہ : یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ شیطان کا علاج کیا ہے' کیا اس سے بچنے کے لیے اللہ کا ذکر کرنا' اور

---

(۱) مجھے اس کی اصل نہیں ملی۔ (۲) بخاری و مسلم۔

یہ کہنا کافی ہے "لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ" جاننا چاہئے کہ قلب کا علاج صرف اسی صورت سے ممکن ہے کہ ان تمام دروازوں کو بند کردیا جائے جن کے ذریعہ شیطان قلب کے اندر داخل ہو کر اسے آلودہ کرتا ہے' یعنی دل کو تمام مذموم صفات سے پاک و صاف کردیا جائے مذموم اوصاف سے قلب کی تطہیر ایک طویل موضوع ہے' احیاء العلوم کی تیسری جلد کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم ان مہلک صفات کا علاج بتلائیں لیکن کیونکہ ہر صفت ایک مستقل باب کی محتاج ہے جیسا کہ آئندہ صفحات میں آپ دیکھیں گے' اس لیے یہاں صرف اتنا بیان کئے دیتے ہیں کہ اگر قلب ان مذموم اوصاف کے اصول سے پاک ہوجائے تو پھر شیطان کو دل کے اندر قدم جمانے کا موقع نہیں ملتا' زیادہ سے زیادہ وہ اتنا کرسکتا ہے کہ آئے اور گذر جائے اللہ کا ذکر اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے اللہ کا ذکر دل پر اسی وقت اثر انداز ہوتا ہے جب وہ تقوٰی کے نور سے منوّر اور مذموم اوصاف کی آلودگی سے پاک ہو' اگر ایسا نہ ہو تو ذکر محض قلب کا وارد یا خیال سمجھا جائے گا' اسے دل پر اقتدار حاصل نہیں ہوتا' اس لیے تقوٰی سے خالی اور تزکیہ سے محروم دل کا ذکر شیطان کے اقتدار کے لیے رکاوٹ نہیں بنتا' وہ بہت آسانی کے ساتھ دل کی بساط پر اپنا قبضہ جمالیتا ہے' باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ (پ ۹ ر ۱۴ آیت ۲۰۱)

جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

اس آیت میں متقی کی تخصیص کی گئی ہے۔ شیطان کی مثال بھوکے کتے کی سی ہے' اگر تمہارے پاس روٹی یا گوشت وغیرہ نہ ہو تو تم اسے دھتکار کر دور کرسکتے ہو لیکن اگر تمہارے ہاتھ میں گوشت ہو اور وہ بھوکا بھی ہو تو دھتکارنے سے ہرگز نہ جائے گا' بلکہ گوشت پر ضرور پڑے گا' شیطان اس دل سے محض ایک ڈانٹ سن کر بھاگ جاتا ہے جہاں اس کی غذا کا سامان نہیں ہوتا لیکن جن دلوں میں اس کی غذا موجود ہوتی ہے وہ ان پر حملہ ضرور کرتا ہے زبان سے جھڑکنا اس کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ جس دل پر شہوت غالب ہوتی ہے وہ ذکر کی حقیقت کو اندر نہیں آنے دیتی اور اس طرح دل شیطان کا مستقر بن جاتا ہے متقین کے دلوں کو جو خواہشات نفس اور صفاتِ مذمومہ سے خالی ہوتے ہیں شیطان اس لیے نہیں کھٹکھٹاتا کہ ان میں شہوات موجود ہیں بلکہ وہ ذکر سے غافل دیکھ کر دستک دیتا ہے جب وہ دل ذکر کی طرف واپس آجاتے ہیں تو دُم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔ ذکر سے شیطان کے بھاگنے کی دلیل وہ آیات اور احادیث ہیں جن میں شیطانی وسوسوں کے وقت استعاذہ وغیرہ کی تلقین کی گئی ہے۔ مثلاً ایک آیت ہے:

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (پ ۱۴ ر ۱۹ آیت ۹۸)

تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مؤمن اور کافر کے شیطان ملے دونوں نے ایک دوسرے کی مزاج پرسی کی' کافر کا شیطان موٹا تازہ تھا اور اس کے جسم پر خوب چربی چڑھی ہوئی تھی جب کہ مؤمن کا شیطان نحیف ونزار اور پریشان حال و درماندہ تھا کافر کے شیطان نے مؤمن کے شیطان سے پوچھا کہ تو نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے' تو اتنا کمزور اور دُبلا کیوں ہے' اس نے جواب دیا کہ میں ایک شخص کے ساتھ رہتا ہوں جو کھانے کے لیے بیٹھتا ہے۔ تو اللہ کا نام لیتا ہے۔ میں بھوکا رہ جاتا ہوں پانی پیتا ہے تو اللہ کا نام لے کر پیتا ہے۔ میں پیاس کے مارے تڑپتا رہ جاتا ہوں لباس پہنتا ہے تو اللہ کا نام لے لیتا ہے۔ اس لیے میرا جسم بھی عریاں رہتا ہے جب وہ بالوں میں تیل لگاتا ہے تو اللہ کا نام لیتا ہے۔ اس لیے میرے بال خشک اور اُلجھے اُلجھے رہ جاتے ہیں کافر شیطان نے اظہار افسوس کے بعد کہا کہ میں ایک شخص پر مسلط ہوں جو تیرے ساتھی کی طرح یہ سب کچھ نہیں کرتا میں اس کے کھانے پینے پہننے میں برابر کا شریک رہتا ہوں۔ محمد ابن الواسع ہر روز صبح کی نماز کی بعد شیطان سے بچنے کے لیے یہ دعا کرتے:

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ سَلَّطْتَ عَلَیْنَا عَدُوًّا بَصِیْرًا بِالْعُیُوْبِ یَرَانَا ھُوَ وَقَبِیْلُہٗ مِنْ حَیْثُ لَا نَرَاھُمْ اَللّٰھُمَّ فَآیِسْہُ مِنَّا کَمَا آیَسْتَہٗ مِنْ رَحْمَتِکَ وَقَنِّطْہُ مِنَّا کَمَا قَنَّطْتَہٗ مِنْ

عَفْوِكَ وَبَاعِدْ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ رَحْمَتِكَ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

اے اللہ! تو نے ہم پر ایک ایسا دشمن مسلط کیا ہے جو ہمارے عیوب سے خوب واقف ہے' وہ اور اس کی جماعت ہمیں اس طرح دیکھتے ہیں کہ ہم انہیں نہیں دیکھ پاتے' اے اللہ! اسے ہم سے اس طرح مایوس کردے جس طرح تو نے اسے اپنی رحمت سے مایوس کردیا ہے' اسے ہم سے اس طرح ناامید کر جس طرح تو نے اپنے عفو سے ناامید کیا ہے اس کے اور ہمارے درمیان اس قدر بُعد کردے جتنا بعد تو نے اس کے اور اپنی رحمت کے درمیان کیا ہے' بلاشبہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

صاحب دعا (محمد ابن الواسع) فرماتے ہیں کہ ایک روز شیطان مسجد کے راستے پر ملا' اور کہنے لگا کہ آپ مجھے جانتے ہیں؟ میں نے کہا: نہیں! اس نے کہا: میں ابلیس ہوں! میں نے اس طرح سرِراہ ملنے کا مقصد دریافت کیا کہنے لگا کہ میری خواہش یہ ہے کہ آپ یہ دعا کسی دوسرے کو نہ سکھلائیں میں کبھی آپ سے مزاحمت نہیں کروں گا' میں نے جواب دیا کہ بخدا اگر کوئی شخص یہ دعا سیکھنا چاہئے گا تو میں اسے ہرگز منع نہیں کروں گا' تیرا جو دل چاہے کر۔ عبدالرحمن ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ شیطان اپنے ہاتھ میں آگ کا شعلہ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس وقت آتا جب آپ نماز پڑھ رہے ہوتے اور قرأت و استعاذے سے نہیں جاتا تھا' ایک روز حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے' اور عرض کیا آپ یہ دعا پڑھا کریں:

أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ مِنْ شَرِّ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَمِنْ فِتَنِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمِنْ طَوَارِقِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِلَّا طَارِقًا يَطْرُقُ بِخَيْرٍ يَا رَحْمٰنُ (۱)

میں پناہ چاہتا ہوں اللہ کے ان پورے کلمات کے واسطے سے جن سے کوئی نیک و بد تجاوز نہیں کرتا اس چیز کے شر سے جو زمین میں داخل ہوتی ہے اور اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور اوپر چڑھتی ہے اور شب و روز کے فتنوں سے' اور رات و دن کے حوادث سے' مگر اس حادثے (کے استثناء کے ساتھ) جو خیر کے ساتھ آئے' اے رحمٰن!۔

آپ نے یہ کلمات پڑھے تو ابلیس مردود کی شمع گل ہوگئی اور وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا' حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ایک جن آپ کو فریب دینا چاہتا ہے جب آپ بستر پر تشریف لے جائیں تو آیت الکرسی پڑھ لیا کریں۔

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لقد اتاني الشيطان' فنازعني ثم نازعني فاخذت بحلقه فوالذي بعثني بالحق ما ارسلته حتى وجدت برد ماء لسانه علي يدي' ولو لا دعوة اخي سليمان عليه السلام لاصبح طريحا في المسجد (نسائی۔ عائشہؓ)

میرے پاس شیطان آیا اور اس نے مجھ سے نزاع کیا' میں نے اس کا گلا پکڑ لیا' اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث فرمایا میں نے اس کا گلا اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کے لعاب کی ٹھنڈک اپنے ہاتھوں پر محسوس نہ کرلی اور اگر میرے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا نہ ہوتی تو وہ مسجد میں گر پڑتا۔

(۱) یہ روایت ابن ابی الدنیا نے مکائد الشیطان میں' اور مالک نے مؤطا میں یحیی ابن سعید سے مرسلاً نقل کی ہے ابن عبدالبر نے اسے ابن مسعود سے موصولاً نقل کی ہے۔ (۲) یہ روایت بھی ابن ابی الدنیا نے مکائد الشیطان میں بطریق ارسال نقل کی ہے۔

ایک روایت میں ہے:

ماسلک عمر فجا الاسلک الشیطان فجا غیر الذی سلکہ عمر

عمر جس راہ پر بھی چلے شیطان اس سے مختلف راہ پر چلا۔

اس کی وجہ یہی تھی کہ ان حضرات کے قلوب شیطان کی غذا سے پاک تھے یعنی ان میں شہوات کا گذر نہ تھا' اب اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ محض ذکر الٰہی سے شیطان دور ہو جائے جیسا کہ حضرت عمر سے دور ہو گیا تھا تو ایسا ہونا محال ہے' اس طرح کی توقع رکھنے والے کی مثال یہ ہو گی کہ کوئی شخص دوا پئے اور پرہیز نہ کرے بھلا اس صورت میں دوا کیا نفع دے گی جب کہ معدہ غلیظ کھانوں میں مشغول ہو' اسے ان کھانوں ہی کو ٹھکانے لگانے کی فرصت نہیں چہ جائیکہ وہ دوا کو جسم کے حصوں میں منتقل کرے اور اسے نافع بنائے ذکر دوا ہے اور تقویٰ پرہیز ہے' اس پرہیز کا حاصل یہ ہے کہ دل شہوات سے خالی ہو چنانچہ اگر ذکر الٰہی کسی غیر کے ذکر سے خالی قلب میں واقع ہو تو شیطان اس طرح دور بھاگے گا جس طرح خالی معدے میں دوا پڑتی ہے تو مرض راہ فرار اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ (پ ۲۶ ر ۱۷ آیت ۳۷)

اس میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہیم) دل ہو۔

ایک جگہ فرمایا:

کُتِبَ عَلَیۡہِ اَنَّہٗ مَنۡ تَوَلَّاہُ فَاَنَّہٗ یُضِلُّہٗ وَ یَہۡدِیۡہِ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیۡرِ (پ ۱۷ ر ۸ آیت ۴)

جس کی نسبت خدا کے یہاں سے یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ جو شخص اس سے تعلق رکھے گا وہ اس کو بے راہ کر دے گا اور اس کو عذاب دوزخ کا راستہ دکھلائے گا۔

جو شخص اپنے عمل سے شیطان کی اعانت کرے گا وہ اس کا دوست اور حلیف کہلائے گا اگرچہ وہ زبان سے اللہ کا ذکر ہی کیوں نہ کرتا ہو۔

<u>زبانی ذکر کافی نہیں ہے</u> : اگر تم یہ کہو کہ حدیث میں تو یہ ہے کہ ذکر شیطان کو دُور کرتا ہے' اس حدیث میں کہیں کوئی قید یا شرط مذکور نہیں ہے' یہ سب تخصیصات علماء کی ایجاد ہیں' حدیث سے ان کا علم نہیں ہوتا اس کا جواب یہ ہے محض زبانی ذکر کر کے مؤثر نہ ہونے کے لیے ہم خارج سے کوئی دلیل پیش کرنے کی بجائے تمہیں خود اپنے نفس پر نظر ڈالنے کی دعوت دیتے ہیں' خبر مشاہدے کے درجے میں نہیں ہے خود سمجھ میں آجائے گا کہ ہمارا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں سب جانتے ہیں کہ ذکر کا منتہیٰ اور عبادت کی غایت نماز ہے' جب تم نماز پڑھو تو اپنے دل کے حال پر نظر ڈال لیا کرو' شیطان اسے کہاں کہاں نہیں لئے پھرتا گلی کوچوں میں' بازاروں میں' تفریح گاہوں میں' اور اس کے اشہب خیال کو کہاں کہاں نہیں دوڑاتا' اسے کیا کیا بات یاد نہیں دلاتا' حد یہ ہے کہ جو بات ذہن سے بالکل محو ہو چکی ہوتی ہے وہ بھی یاد دلا دیتا ہے' شیطان تمہارے دل پر نماز کی حالت میں ضرور حملہ کرتا ہے' نماز ہی پر باقی اذکار اور عبادات کو قیاس کیا جا سکتا ہے نماز دلوں کی کسوٹی ہے' اس سے دلوں کے محاسن اور قبائح ظاہر ہو جاتے ہیں' ان دلوں کی نماز قبول نہیں ہوتی جو دنیاوی شہوات کے مرکز ہوتے ہیں۔ ایسی نماز سے شیطان کبھی دور نہیں ہو سکتا' بلکہ وسوسوں میں زیادتی ہی کا امکان غالب ہے' جس طرح پرہیز کے بغیر دوا فائدے کے بجائے نقصان زیادہ پہنچاتی ہے۔ اگر تم شیطان سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو تو پہلے تقویٰ کا پرہیز کرو' اس کے بعد ذکر کی دوا استعمال کرو' شیطان تم سے اسی طرح ڈرا سہا رہے گا جس طرح حضرت عمرؓ سے رہا کرتا تھا۔ وہب بن منبہؒ کہتے ہیں کہ اللہ سے ڈرو' اور شیطان کو ظاہر میں برُا مت کہو' باطن میں تم اس کے دوست ہو یعنی اس کی اطاعت کرنے والے ہو' ایک بزرگ نے فرمایا: تعجب ہے ان لوگوں پر جو محسن کی اس کے احسان کی معرفت کے باوجود نافرمانی کریں' اور ملعون کی اس کی سرکشی کے علم کے باوجود اطاعت کریں۔ جس طرح تم دعا کرتے ہو اور قبول نہیں ہوتی' حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ اسی طرح تمہارے ذکر سے شیطان دور نہیں ہوتا' کیوں کہ وہاں دعا کی شرائط مفقود تھیں' اور یہاں ذکر کی شرائط مفقود ہیں' حضرت ابراہیم ابن ادہم سے کسی نے یہی سوال کیا تھا کہ ہماری دعا قبول کیوں نہیں ہوتی جب کہ اللہ

تعالیٰ نے اس کا وعدہ کیا ہے' فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے دل مُردہ ہیں' انہوں نے سوال کیا کہ دلوں کو کس چیز نے مُردہ کیا ہے فرمایا تمہاری آٹھ خصلتوں نے' ایک یہ کہ تمہیں اللہ کے حق کی معرفت حاصل ہوئی لیکن تم نے یہ حق ادا نہیں کیا' دوسری یہ کہ تم نے قرآن پڑھا لیکن اس کی حدود پر عمل نہیں کیا' تیسری یہ کہ تم اللہ کے رسول کی محبت کا دم بھرتے ہو لیکن ان کی سنت پر عمل نہیں کرتے' چوتھی یہ کہ تم یہ کہتے ہو کہ ہمیں موت کا ڈر ہے لیکن موت کے لیے تم کوئی تیاری نہیں کرتے' پانچویں یہ کہ اللہ فرماتا ہے: إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا (پ ۲۲ ر ۱۳ آیت ۶)

یہ شیطان بے شک تمہارا دشمن ہے اسے اپنا دشمن ہی سمجھتے رہو۔

مگر تم نے معصیت کر کے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا' چھٹی یہ کہ تم دوزخ سے اپنے خوف اور ڈر کا اظہار کرتے ہو لیکن کام وہ کرتے ہو جس سے تمہارا دوزخ میں جانا یقینی ہو جائے۔ ساتویں یہ کہ تم جنت کے خواہش مند ہو لیکن وہ کام نہیں کرتے جو تمہیں جنت تک پہنچا دے' آٹھویں یہ کہ جب تم بستروں سے اٹھتے ہو تو اپنے عیوب پس پشت ڈال دیتے ہو اور لوگوں کی عیب جوئی میں لگ جاتے ہو' یہ تمام خصلتیں باری تعالیٰ کے غضب کا باعث ہیں' ان کی موجودگی میں دعا کی قبولیت کی توقع رکھنا فضول ہے۔

ہر گناہ کے لیے الگ شیطان ہے: رہی یہ بحث کہ مختلف معاصی کی دعوت دینے والا اور ان کے ارتکاب پر اُکسانے والا شیطان ایک ہے یا متعدد ہیں' اس بحث کا تعلق علم معاملہ سے نہیں ہے' نہ اس میں اُلجھنے کی ضرورت ہے اور نہ اس سے کسی فائدے کی توقع کی جاسکتی ہے' یہاں صرف یہ ضروری ہے کہ اپنے آپ کو شیطان سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے' خواہ وہ ایک ہو یا چند ہوں' اصل دشمن سے حفاظت ہے نہ کہ دشمنوں کی تعداد۔ تاہم اخبار و روایات اور نور بصیرت کی مدد سے جو کچھ ہم نے سمجھا وہ یہ ہے کہ ہر معصیت کے لیے ایک شیطان مخصوص ہے' اس کے ذمے صرف یہی کام ہے کہ وہ اس مخصوص گناہ کی طرف لوگوں کو بلاتا رہے یہ بات ہم نے کس طرح سمجھی اس کا ذکر تفصیل طلب ہے یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ سبب کے اختلاف سے مسبّب کے اختلاف پر دلالت ہوتی ہے جیسا کہ آگ کی روشنی اور دھویں کی سیاہی کی مثال میں یہ قاعدہ مذکور ہوا۔ اخبار کی دلالت یہ ہے کہ حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ ابلیس کے پانچ لڑکے ہیں' ان میں سے ہر ایک کو مخصوص کام سپرد کیا گیا ہے' ایک کا نام بثر ہے' اس کے سپرد مصائب ہیں' واویلا کرنا' گریبان پھاڑنا' نوحہ کرنا اور جہالت کی باتیں کرنا وغیرہ امور اسی کے حکم سے ہوتے ہیں' دوسرے کا نام اَعْوَر ہے وہ زنا پر متعین ہے اور لوگوں کو اس پر آمادہ کرنا اور اس فعل کو اچھا قرار دینا اس کا کام ہے' تیسرے کا نام مبسُوط ہے' یہ جھوٹ پر مامور ہے' چوتھے کا نام واسم ہے' آدمی کے ساتھ اس کے گھر جاتا ہے اور اسے اہل خانہ کے عیوب بتا کر ان سے بدظن کر دیتا ہے' پانچویں کا نام زلنبور ہے وہ بازار کا شیطان ہے' اس کے بہکانے سے لوگ خرید و فروخت میں ظلم کا موقف اختیار کرتے ہیں نماز کے شیطان کا نام خنزب ہے (مسلم۔ عثمان بن ابی العاصؓ) وضو کے شیطان کا نام ولہان ہے (ترمذی)۔ شیاطین کے تعدد پر بہت سی روایتیں دلالت کرتی ہیں۔

جس طرح شیاطین فوج در فوج ہیں اسی طرح فرشتے بھی لاتعداد ہیں' ہم نے کتاب الشکر میں ملائکہ کی کثرت اور ان میں سے ہر ایک کی مخصوص عمل کے ساتھ وابستگی کے راز پر روشنی ڈالی ہے حضرت ابو امامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں: وكل بالمؤمن مائة وستون ملكا يذبون عنه مالم يقدر عليه من ذالك' للبصر سبعة املاك يذبون عنه كما يذب الذباب عن قصعة العسل في اليوم الصائف' ومالو بدالكم لرايتموه على كل سهل وجبل' كل باسط يده فاغز فاه' مالو وكل العبد الى نفسه طرفة عين لاختطفته الشياطين (ابن ابی الدنیا' طبرانی)

مؤمن پر ایک سو ساٹھ فرشتے مقرر ہیں جو اس پر سے وہ چیز دور کرتے ہیں جس کی اسے قدرت نہیں ہوتی' آنکھ پر سات فرشتے متعین ہیں جو اس پر سے اس طرح (شیاطین کو) دفع کرتے ہیں جس طرح گرمی کے دنوں

میں شہد کے پیالے سے مکھیاں اُڑائی جاتی ہیں۔ اگر تمہیں وہ چیز (فرشتہ) نظر آجائے تو تم اسے ہر نشیب و فراز میں دیکھو ہر فرشتہ اپنے ہاتھ پھیلائے اور منہ کھولے ہوئے ہے اگر بندہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے نفس کے حوالے کردیا جائے تو شیاطین اسے اُچک لیں۔

ایوب بن یونس بن یزید کہتے ہیں کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ انسان کی اولاد کے ساتھ جن کی اولاد بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ انہیں کے ساتھ نشوونما پاتی ہے' حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اُتارا گیا تو انہوں نے باری تعالیٰ سے عرض کیا اے اللہ! تو نے میرے اور شیطان کے درمیان عداوت ڈال دی ہے' اب اگر تیری اعانت شامل حال نہ رہی تو میں اس پر غالب نہ آسکوں گا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیرے جو بچہ بھی پیدا ہوگا اس پر ایک فرشتہ مقرّر کردیا جائے گا' حضرت آدم علیہ السلام نے زیادتی اعانت کی درخواست کی' فرمایا: تیری اولاد میں سے اگر کوئی ایک بدی کرے گا تو ایک ہی بدی کی سزا پائے گا' اور ایک نیکی کرے گا تو اسے دس گنا اجر سے جہاں تک مجھے منظور ہوگا عطا کروں گا' حضرت آدم علیہ السلام نے پھر زیادتی کی درخواست کی' فرمایا: جب تک جسم میں روح موجود ہے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے' ابلیس نے عرض کیا: اے اللہ! تو نے اس بندے کو مجھ پر بڑی فضیلت بخشی ہے' اب اگر تو نے میری اعانت نہ فرمائی تو میں ہرگز اس پر غلبہ نہ پاسکوں گا' فرمایا کہ آدم کے ہر بچے کے ساتھ تیرا بھی ایک بچہ پیدا ہوگا' ابلیس نے عرض کیا: یا اللہ! کچھ زیادہ عطا ہو' فرمایا: تو انسانوں کے جسموں میں اس طرح گردش کرے گا جس طرح خون گردش کرتا ہے' اور تو اس کے سینوں کو گھر بنالے گا' ابلیس نے پھر زیادتی کی دعا کی' حکم ہوا:

وَاَجْلِبْ عَلَيْهِم بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ اِلَّا غُرُوْرًا (پ۱۵ ر۷ آیت ۶۴)

اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھالانا اور ان کے مال اور اولاد میں اپنا ساجھا کرلینا' اور ان سے وعدہ کرنا اور شیطان ان لوگوں سے بالکل جھوٹے وعدے کرتا ہے۔

حضرت ابوالدرداءؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

خلق اللہ الجن ثلاثۃ اصناف' صنف حیات وعقارب وخشاش الارض وصنف کالریح فی الھواء' وصنف علیھم الثواب العقاب' وخلق اللہ تعالیٰ الانس ثلاثۃ اصناف' صنف کالبھائم کما قال تعالیٰ: لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ' وصنف اجسامھم اجسام بنی آدم وارواحھم ارواح الشیاطین وصنف فی ظل اللہ تعالیٰ یوم القیامۃ یوم لا ظل الا ظلہ (۱)

اللہ تعالیٰ نے جن کی تین قسمیں پیدا کی ہیں' ایک قسم میں سانپ' بچھو اور حشرات الارض ہیں' دوسری آندھی کی طرح ہے' اور تیسری قسم پر ثواب وعذاب ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کی بھی تین قسمیں بنائی ہیں' ایک بہائم کی طرح ہے جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے "ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں ہیں' ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں ہیں' ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں ہیں' وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔" ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کے جسم بنی آدم کے جسموں کی طرح ہیں' اور روحیں شیاطین کی روحوں کی طرح ہیں' اور ایک قسم ان انسانوں کی ہے جو قیامت کے روز باری تعالیٰ کے سائے میں رہیں گے اس دن اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا۔

---

(۱) یہ روایت ابن ابی الدنیا نے مکائد الشیطان میں اور ابن حبان نے کتاب الضعفاء میں نقل کی ہے' حاکم نے ابو ثعلبہ الخشنی سے یہ روایت اختصار کے ساتھ نقل کی ہے۔

وہیب بن الورد کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہوا کہ ابلیس ایک روز حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے سامنے آیا' اور کہنے لگا کہ میں آپ کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں' انہوں نے فرمایا: مجھے تیری نصیحت کی ضرورت نہیں' البتہ مجھے انسانوں کے بارے میں کچھ بتلا (کہ کس طرح کے انسانوں سے تیرا سابقہ پڑتا ہے) اس نے کہا کہ انسانوں کی ہمارے یہاں تین قسمیں ہیں' ایک قسم میں وہ لوگ ہیں جو ہم پر بڑے سخت ہیں' ہم ان کے پاس جاتے ہیں اور انہیں کسی فتنے میں مبتلا کردیتے ہیں اور ان پر قابو پالیتے ہیں' لیکن وہ ارتکاب گناہ کے فوراً بعد توبہ و استغفار کرلیتے ہیں اور اس طرح ہماری تمام محنت ضائع کردیتے ہیں' ہم دوبارہ محنت کرتے ہیں وہ دوسری بار بھی یہی حرکت کرتے ہیں' ہماری عجیب حالت ہے نہ ان سے مکمل مایوسی ہے کہ انہیں چھوڑ کر الگ ہٹ جائیں اور نہ مطلب ہی نکلتا ہے' دوسری قسم کے لوگ ہمارے ہاتھوں میں ایسے ہیں جیسے گیند بچوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے' ہم جس طرح چاہیں انہیں اُلٹ پُلٹ کر رکھ دیتے ہیں' یہ لوگ ہماری محنت کا پورا پورا صلہ دیتے ہیں' تیسری قسم میں آپ جیسے لوگ ہیں' نیک سیرت' معصوم گناہوں سے دور۔ ہم ان پر غالب نہیں آپاتے۔

شیطان کا مجسّم ہو کر سامنے آنا: اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیطان بعض لوگوں کے سامنے مجسّم ہو کر کس طرح آجاتا ہے جب کہ بعض دوسرے لوگوں کے سامنے نہیں آتا' نیز جب وہ کسی صورت میں ظاہر ہوتا ہے تو وہ اس کی حقیقی صورت ہوتی ہے یا مثالی؟ اگر وہ اس کی اصل صورت ہے تو وہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے نیز ایک ہی وقت میں دو جگہوں پر دو مختلف صورتوں میں کیسے نظر آجاتا ہے یہاں تک کہ دو شخص اسے دو مختلف صورتوں میں دیکھتے ہیں؟ اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ فرشتوں اور شیطان کی حقیقی صورتیں بھی ہیں مگر ان کی حقیقی صورتوں کا مشاہدہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے' بلکہ انہیں نبوت کے انوار ہی سے دیکھا جاسکتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں صرف دو مرتبہ دیکھا ہے' ایک مرتبہ خود آپ نے ان سے کہا تھا کہ مجھے اپنی اصل صورت دکھلایئے انہوں نے بقیع میں اس کا وعدہ کیا' اور جبلِ حراء پر اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوئے تو مغرب سے مشرق تک' کا تمام اُفق ان کے وجود سے گھر گیا' دوسری مرتبہ معراج کی رات میں سدرۃ المنتہیٰ پر اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئے اور آپ نے انہیں دیکھا عام طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آدمی کی صورت میں دیکھا ہے[1] حضرت جبرئیل علیہ السلام اکثر دحیہ کلبیؓ کی صورت میں آیا کرتے تھے[2] یہ ایک خوبصورت اور وجیہ شخص تھے۔

اکثر اہلِ دل کو مکاشفہ اس طرح ہوتا ہے کہ اس کی صورت اصلی کی مثال ان کے سامنے آجاتی ہے' چنانچہ شیطان بیداری کی حالت میں ان کے سامنے آتا ہے وہ اسے دیکھتے بھی ہیں اور اپنے کانوں سے اس کی آواز بھی سنتے ہیں' یہ مثالی صورت اس کی حقیقی صورت کے قائم مقام ہو جاتی ہے' اکثر صلحاء کو یہ صورت خواب میں پیش آتی ہے۔ صاحب کشف وہ ہے کہ حواس کی مشغولیت اس کے مکاشفے کی راہ میں مانع نہ ہو' یعنی جو بات لوگوں کو خواب میں معلوم ہو وہ انہیں بیداری میں نظر آجائے۔ جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے باری تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ مجھے انسان کے قلب میں وہ جگہ دکھلا دی جائے جہاں شیطان رہتا ہے' اس نے خواب میں انسان کے جسم کو بلوریں شیشے کے مانند دیکھا جس میں اندر کی چیز باہر نظر آجاتی ہے اور شیطان کو ایک مینڈک کی صورت میں بائیں شانے پر مونڈھے اور کان کے درمیان بیٹھے ہوئے دیکھا اس کی ایک پتلی اور لمبی سونڈ تھی جسے وہ آدمی کے قلب میں ڈالے ہوئے تھا۔ اور اس کے ذریعہ وسوسے پیدا کر رہا تھا' جب وہ آدمی اللہ کا ذکر کرتا تو شیطان اپنی سونڈ ہٹا لیتا' کبھی اس طرح کا مشاہدہ بیداری کی حالت میں ہو جاتا ہے' چنانچہ بعض اہل کشف نے شیطان کو کتے کی صورت میں دیکھا جو مردار پر پڑا ہوا ہے اور لوگوں کو بھی اس کی دعوت دے رہا ہے' مردار دنیا کی تمثیل ہے' اس طرح کا مشاہدہ صورت اصلی کے قائم مقام

(۱) بخاری و مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت۔ (۲) حوالہ سابق۔ (۲) بخاری و مسلم میں حضرت اسامہ بن زید کی حدیث' روایت کرتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بات چیت کرنے لگے' جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو آپ نے ام سلمہ سے پوچھا کہ یہ کون تھے؟ انہوں نے عرض کیا وحیہ۔

ہے' یہ بات پہلے بھی بیان کی جاچکی ہے کہ قلب کے دو طرف ہیں ایک طرف عالم ملکوت کے مقابل ہوتا ہے' یہ وحی' الہام اور غیبی اشارات کا مدخل ہے۔ دوسرا طرف عالم ظاہری کے مقابل ہے' لیکن کیونکہ دونوں طرف ایک دوسرے سے متصل ہیں اس لیے عالم ملکوت کی جانب والے حصے کا اثر عالم ظاہر والی جانب میں جھلکتا ہے۔ عالم ظاہر والی جانب میں جو شئے نظر آتی ہے وہ اس کی صورت متخیلہ ہوتی ہے' کیونکہ کہ تمام عالم ظاہر متخیلات میں سے ہے' اور تخیلات میں یہ بات ممکن ہے کہ جو صورت آدمی کے دل میں اس کی خیالی حس' کے ذریعے آئے وہ اس کی اصل سیرت کے مطابق نہ ہو' چنانچہ ایک شخص ظاہر میں خوبصورت نظر آتا ہے' مگر یہ ضروری نہیں کہ اس کے ظاہر کی خوبصورتی باطن کی خوبصورتی کے مطابق ہو' وہ بد باطن بھی ہو سکتا ہے' عالم ظاہر تمام تر تلبیس ہی تلبیس ہے' لیکن وہ صورت جو خیال میں عالم ملکوت کی چمک سے ظاہر ہوتی ہے اصل صفت کے تابع اور اس کے عین مطابق ہوتی ہے' چنانچہ جو شئی باطن میں بری ہوگی وہ ظاہر میں بھی بُری ہی نظر آئے گی۔ چنانچہ شیطان کتے' مینڈک اور خنزیر کی شکل میں نظر آتا ہے' جب کہ فرشتے اچھی شکلوں میں نظر آتے ہیں' یہ صورت معانی کا عنوان اور ان کے باطن کی سچی تصویر ہوتی ہے' یہی وجہ ہے کہ خواب میں کتے اور بندر کی صورت میں کسی شخص کا نظر آنا اس کے خبث پر دلالت کرتا ہے' اور بکری کی صورت میں نظر آنا اس کے سلیم الطبع ہونے کی دلیل ہے' خوابوں کی تعبیر کا یہی حال ہے۔ یہ امر بھی قلب کے اسرار سے متعلق ہے' علم معاملہ میں اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہے' یہاں اس موضوع کو چھیڑنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ اس بات کا یقین کرلیا جائے کہ شیطان اور فرشتے اہل دل پر کبھی تمثیل اور حکایت کے طور پر منکشف ہوتے ہیں جیسا کہ نیند کی حالت میں۔ اور کبھی بطریق حقیقت کے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ کوئی ایسی تمثیلی صورت نظر آتی ہے جو باطن کے مشابہ ہو' اگرچہ وہ صورت مثالی ہوتی ہے' مگر آنکھ سے اس کا مشاہدہ حقیقی ہوتا ہے' تاہم اسے اہل کشف ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے آس پاس کے لوگ نہیں دیکھ سکتے' جس طرح خواب سونے والا دیکھ سکتا ہے قریب بیٹھے ہوئے لوگ نہیں دیکھ سکتے۔

دِل کے وَساوس' اَوہام' خَواطر اور ارادے

یہ ایک دقیق بحث ہے' اور اس میں آیات و روایات اس حد تک متعارض ہیں کہ ان میں تطبیق دینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے' صرف علماء کاملین ہی اس تعارض کو دُور کر سکتے ہیں' چنانچہ حدیث شریف میں ہے:۔

ان اللہ تجاوز عن امتی ما حدثت بہ نفوسہا مالم تتکلم بہ او تعمل بہ۔ (بخاری و مسلم۔ ابوہریرہؓ)

اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے وہ تمام گناہ معاف کردیے ہیں جن کا دل میں خیال آئے جب تک وہ زبان پر نہ آئیں یا ان پر عمل نہ ہو۔

حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ان اللہ تعالیٰ یقول للحفظة ازا ہم عبدی بسیة فلا تکتبوھا علیہ' فان عملها فاکتبوھا سیئة و اذا ھم بحسنة فلم یعملها فاکتبوھا حسنة فان عملها فاکتبوھا عشرا۔ (مسلم' بخاری)

اللہ تعالیٰ محافظ فرشتوں (کراماً کاتبین) سے فرماتے ہیں کہ جب میرا بندہ کسی بُرائی کا قصد کرے تو اسے مت لکھو' اگر وہ اس پر عمل کرے تو ایک بُرائی لکھو' اور اگر کسی نیکی کا قصد کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو ایک نیکی لکھو اور اگر اس پر عمل کرے تو دس نیکیاں لکھو۔

اس حدیث کی تخریج بخاری و مسلم دونوں نے کی ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ قلب کا عمل' اور بُرائی کا قصد قابل معافی ہے۔ یہی روایت ان الفاظ میں بھی وارد ہے:۔

من هم بحسنة فلم یعملها کتبت له حسنة و من هم بحسنة فعملها کتبت له عشرا الی سبعمائة ضعف و من هم بسیئة فلم یعملها لم تکتب علیه و ان عملها کتبت۔

جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے اور اسے عملی جامہ نہ پہنائے اس کے لیے ایک نیکی لکھی جائے گی' اور جو اس پر عمل کرے اس کے لیے دس سے سات سو تک نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اور جو شخص کسی بُرائی کا قصد کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو وہ بُرائی نہیں لکھی جائے گی' عمل کرلے تو (ایک بُرائی) لکھی جائے گی۔

ایک روایت کے الفاظ یہ ہے:۔

و اذا تحدث بان یعمل سیئة فانا اغفرها له مالم یعملها

جب کوئی بندہ دل میں بُرائی کا خیال لاتا ہے تو میں اسے معاف کر دیتا ہوں جب تک کہ اس گناہ کا ارتکاب نہ کرے۔

ان سب روایات سے عفو اور عدم مواخذہ پر دلالت ہوتی ہے' دوسری طرف بہت سی آیات سے قلب کے عمل پر مواخذے کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً ارشادِ باری ہے:۔

اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ (پ ۳ ر ۸ آیت ۲۸۴)

اور جو باتیں تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم ظاہر کرو گے یا پوشیدہ رکھو گے حق تعالیٰ تم سے حساب لیں گے پھر جس کے لیے منظور ہو گا بخش دیں گے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ (پ ۱۵ ر ۴ آیت ۳۲)

اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد مت کیا کر' کیوں کہ کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی (قیامت کے دن) پوچھ ہو گی۔

مطلب یہ ہے کہ قلب کا عمل آنکھ اور کان کے عمل کی طرح ہے' جس طرح ان پر مواخذہ ہو گا اسی طرح وہ بھی ماخوذ ہو گا' ارشاد فرمایا:۔ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ یَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ۔ (پ ۳ ر ۸ آیت ۲۸۳)

اور شہادت کا اخفاء مت کرو' جو شخص اس کا اخفاء کرے گا اس کا قلب گنہ گار ہو گا۔

لَا یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ یُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (پ ۲ ر ۱۲ آیت ۲۲۵)

اللہ تعالیٰ تم پر (آخرت میں) داروگیر نہ فرمائیں گے تمہاری (ایسی) قسموں میں سے بے ہودہ قسم پر۔ لیکن مواخذہ فرمائیں گے۔ اس (جھوٹی قسم) پر جس میں تمہارے دلوں نے (جھوٹ بولنے کا) ارادہ کیا ہے۔

اس مسئلے میں حق یہ ہے کہ جب تک قلب کے اعمال کی تفصیل سامنے نہ آجائے اس وقت تک کوئی مطلق حکم نہ لگانا چاہئے۔ قلب کا عمل کئی مرحلوں سے گذر کر اعضاء کے ارتکاب تک پہنچتا ہے۔ قلب پر سب سے پہلے جو چیز وارد ہوتی ہے اسے خاطر کہتے ہیں' مثلاً دل میں کسی ایسی عورت کا خیال آئے جو اس کے پیچھے ہو کر اگر وہ گھوم کر دیکھنا چاہئے تو دیکھ سکتا ہے' دوم یہ کہ دیکھنے کی رغبت میں ہیجان پیدا ہو یعنی طبیعت میں موجود شہوت متحرک ہو' یہ رغبت پہلے خاطر سے پیدا ہوتی ہے اسے میلانِ طبع کہتے ہیں' اور خاطرِ اوّل کو حدیثِ نفس کہا جاتا ہے' سوم اس رغبت کے لیے دل کی اجازت مثلاً قلب کا یہ حکم لگانا کہ مذکورہ عورت کو دیکھ لینا چاہئے' بعض اوقات طبیعت تو راغب ہوتی ہے' لیکن بعض موانع مثلاً شرم اور خوف کے باعث دل دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا' یہ موانع تأمل سے دور ہوتے ہیں اور عقل ان کا فیصلہ کرتی ہے' اس عمل کا نام اعتقاد ہے' چہارم یہ کہ عورت کو دیکھنے کا مصمم عزم ہو اسے قصد' نیت' اور ارادہ کہتے ہیں' اس قصد کا مبدأ

کبھی ضعیف ہوتا ہے، لیکن جب قلب خاطر اوّل کی طرف پوری طرح متوجہ رہتا ہے تو یہ قصد مؤکد ارادہ پختہ اور عزم جازم ہو جاتا ہے، بعض اوقات ارادے کی پختگی کے باوجود آدمی کسی وجہ سے مثلاً ندامت کی بنا پر فعل کا مرتکب نہیں ہوتا، کبھی غفلت کے باعث فعل کا دھیان نہیں رہتا، کبھی کوئی ایسا مانع پیش آجاتا ہے کہ چاہنے کے باوجود بھی اس ارادے کو عملی جامہ پہنانا دشوار ہو جاتا ہے۔

عمل سے پہلے دل کی چار حالتیں: خلاصہ یہ ہے کہ اعضاء کے عمل سے پہلے چار حالتیں ہوتی ہیں، حدیثِ نفس، میلانِ طبع، اعتقاد، عزم ان چار حالتوں کا حکم الگ الگ ہے۔ جہاں تک خاطر یعنی حدیثِ نفس کا تعلق ہے اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، کیوں کہ یہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے، یہی حکم میلانِ طبع کا ہے، یہ حالت بھی اختیاری نہیں ہے، یہی دونوں حالتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں مراد ہیں کہ میری اُمّت سے ان کے دلوں کی باتیں معاف کر دی گئی ہیں۔ حدیثِ نفس کہتے ہی ہیں ان خواطر کو جو دل میں گذریں اور جن پر عمل کرنے کا عزم نہ ہو، عزم و ارادے کو حدیثِ نفس نہیں کہتے، حدیثِ نفس کی مثال حضرت عثمان بن مظعون کی یہ روایت ہے کہ انہوں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:

نفسی تحدثنی ان اطلق خولته، قال مهلا ان من سنتی النکاح، قال نفسی تحدثنی ان اجب نفسی قال: مهلا خصاء امتی دوب الصیام، قال نفسی تحدثنی ان اترهب، قال: مهلا رهبانیة امتی الجهاد والحج، قال: نفسی تحدثنی ان اترک اللحم قال: مهلا فانی احبه ولو اصبته لاکلته ولو سالت الله لاطعمنیه۔[1]

میرا دل یہ کہتا ہے کہ میں خولہ (بیوی) کو طلاق دے دوں آپ نے فرمایا: ایسا نہ کرو، نکاح میری سنّت ہے، انہوں نے عرض کیا کہ میرا دل کہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو خصی کرلوں فرمایا: ایسا نہ کرو، میری اُمّت میں خصی ہونا ہمیشہ روزہ رکھنا ہے، عرض کیا: میرا دل کہتا ہے کہ میں راہب (تارک الدنیا) بن جاؤں، فرمایا: ایسا نہ کرو، میری امت کی رہبانیت جہاد اور حج ہے، عرض کیا: میرا دل چاہتا ہے کہ گوشت چھوڑ دوں، فرمایا: ایسا نہ کرو، مجھے گوشت مرغوب ہے، مل جاتا ہے تو کھالیتا ہوں، اگر میں اللہ تعالیٰ سے اس کی درخواست کروں تو وہ مجھے کھلا دے۔

یہ وہ خواطر تھے جن پر عمل کا عزم نہیں تھا، یہی خواطر حدیثِ نفس کہلاتے ہیں، چنانچہ اسی لیے حضرت عثمان بن مظعون نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان پر عمل کرنے یا نہ کرنے کے سلسلے میں مشورہ کیا، قلب کی تیسری حالت اعتقاد ہے، یعنی دل کا یہ حکم لگانا کہ اس فعل کا کرنا مناسب ہے، یہ اعتقاد اختیاری بھی ہوتا ہے، اور اضطراری بھی، اختیاری پر مواخذہ ہے اضطراری پر نہیں ہے۔ چوتھی حالت یعنی فعل کا ارادہ کرنا قابلِ مواخذہ ہے، اگر کسی وجہ سے وہ فعل نہ کرسکا تو یہ دیکھا جائے گا کہ اس کا رُکنا ندامت یا خوفِ خدا کی وجہ سے ہے یا نہیں، اگر خوفِ خدا اور ندامت نے اسے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے باز رکھا ہے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی جائے گی، کیوں کہ معصیت کا عزم کرنا معصیت ہے، اور اس سے رُکنا اور نفس پر مجاہدہ کرنا نیکی ہے۔ طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہو کر اس نے معصیت کا ارادہ کیا تھا اس کا یہ عمل باری تعالیٰ سے مکمل اعراض اور غفلت پر دلالت نہیں کرتا البتہ اس نے معصیت کا ارادہ ترک کر کے جو مجاہدہ کیا ہے وہ یقیناً بڑی بات ہے، اگر اس نے ارادہ معصیت سے شیطان کی اتباع کی تھی تو اس سے رُک کر طبیعت کی مخالفت کی ہے، اس لیے وہ ایک نیکی کا مستحق ہے، البتہ اگر اس نے کسی مانع یا عذر کی بنا پر اپنے ارادے پر عمل نہیں کیا تو ایک بُرائی لکھی جائے گی، کیونکہ قلب کا ارادہ اختیاری فعل ہے، اس تفصیل پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

قالت الملائکة علیهم السلام، رب ذاک عبدک یرید ان یعمل سیئة و هو ابصر به فقال: ارقبوه فان هو عملها فاکتبوها له بمثلها و ان ترکها فاکتبوها له حسنة و انما

---

[1] اس روایت کے مختلف ٹکڑے دارمی، بغوی، طبرانی، احمد، ابو یعلی اور ابو داؤد وغیرہ کتب حدیث میں صحیح اسناد کے ساتھ متعدد صحابہؓ سے منقول ہیں، یہ حدیث احیاء العلوم کی تفصیل کے مطابق حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں سعید بن المسیب سے مرسلاً نقل کی ہے۔

ترکھامن جرائی۔

ملائکہ علیہم السلام باری تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں اے اللہ! یہ تیرا بندہ گناہ کرنا چاہتا ہے' (حالانکہ خدا کو اس کا حال زیادہ معلوم ہے) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس کی نگرانی کرو' اگر وہ ارادے پر عمل کرلے تو اس کے برابر برائی لکھ لو اور اگر وہ چھوڑ دے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھو کیونکہ اس نے میری وجہ سے یہ گناہ چھوڑا ہے۔

جن روایات میں مَنْ لَمْ یَعْمَلْهَا (اس ارادے پر عمل نہیں کیا) آیا ہے اس میں بھی اللہ کے خوف سے چھوڑنا مراد ہے' اگر کوئی شخص کسی گناہ کا عزم کرے پھر وہ غفلت کے باعث یا کسی اور وجہ سے اس گناہ کا ارتکاب نہ کرسکے تو وہ نیکی کا مستحق کیوں ہوگا؟

حدیث شریف میں ہے:۔ انمایحشر الناس علی نیاتھم (۱) آدمی اپنی اپنی نیتوں پر اٹھائے جائیں گے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص رات کو یہ نیت کرے کہ میں صبح کو فلاں مسلمان کو قتل کروں گا یا فلاں عورت کے ساتھ زنا کروں گا اور صبح ہونے سے پہلے مرجائے تو وہ اپنے ارادہ و عزم پر مرے گا اور اسی نیت پر اس کا حشر ہوگا' حالانکہ اس نے ارتکاب نہیں کیا تھا' اس امر پر قطعی دلالت اس روایت سے ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

اذا التقی المسلمان بسیفیھما فالقاتل والمقتول فی النار' فقیل یا رسول اللہ ہذا القاتل فما بال المقتول' قال لانہ اراد قتل صاحبہ (بخاری و مسلم۔ ابوبکرۃ)

جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں لے کر آمنے سامنے آجائیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ قاتل کا دوزخ میں جانا تو سمجھ میں آتا ہے' مقتول کو کیا ہوا وہ دوزخ میں کیوں جائے گا' فرمایا اس لیے کہ اس نے اپنے ساتھی (قاتل) کو مارنے کا ارادہ کیا تھا۔

معلوم ہوا کہ مقتول محض اپنے ارادے و نیت کی بنا پر دوزخ کا مستحق ہے' بظاہر وہ مظلوم تھا اور قاتل نے ظلماً اسے قتل کیا تھا' اس صراحت کے بعد یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ نیتوں اور ارادوں پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے' اس سلسلے میں یہ اصول یاد رکھنا چاہئے کہ ہر وہ قصد قابلِ مواخذہ ہے جو اختیار کے تحت ہو' ہاں اگر وہ کسی نیکی کے ذریعہ اس قصد کا کفارہ ادا کردے تو اس کے نامۂ اعمال میں نیکی لکھی جائے گی' کیونکہ ندامت کی وجہ سے عزم کو فسخ کرنا نیکی ہے' کسی مجبوری کی وجہ سے ترک فعل کرنا نیکی نہیں ہے' اس لیے پہلے پر اجر ملے گا اور دوسرے پر مواخذہ ہوگا' خواطر اور میلانِ طبع بندے کے اختیار میں نہیں ہیں' ان پر مواخذہ کرنا بندے کی طاقت سے باہر کی چیزوں پر مواخذہ کرنا ہے' قرآن کریم میں ہے:۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ (پ ۳ ر ۸ آیت ۲۸۴)

اور جو باتیں تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم ظاہر کرو گے یا پوشیدہ رکھو گے حق تعالیٰ تم سے حساب لیں گے۔

روایات میں ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو کچھ صحابی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم پر ایسی بات کا حکم ہوا ہے جو ہماری طاقت سے باہر ہے' ہمارے دلوں میں بہت سی باتیں ایسی گزرتی ہیں کہ ان کا دل میں رہنا ہمیں منظور نہیں ہوتا' اس آیت کی رو سے ہماری وہ باتیں بھی قابلِ مواخذہ ہوں گی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: غالباً تم بھی یہودیوں کی طرح یہ کہنا چاہتے ہو سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا (ہم نے سنا اور نافرمانی کی) تمہیں تو یہ کہنا چاہئے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (ہم نے سنا اور اطاعت کی) صحابہ نے سمع و طاعت کا اعتراف کیا' ایک سال بعد مندرجہ ذیل آیت کے ذریعہ یہ تنگی دور ہوئی۔ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲)

اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت و اختیار میں ہو۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ قلب کے جو اعمال بندے کے دائرۂ اختیار سے خارج ہیں' ان پر مواخذہ نہیں ہے' بعض لوگ ان

---

(۱) ابن ماجہ میں لفظ "اِنَّما" کے حذف کے ساتھ۔ مسلم میں یہ روایت ام سلمہؓ اور عائشہؓ سے منقول ہے۔ (۲) یہ روایت مسلم شریف میں ابو ہریرہؓ اور ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

اعمال میں کوئی فرق نہیں کرتے بلکہ جو کچھ دل میں آئے اسے حدیث نفس یا خاطر کہہ دیتے ہیں' ان کی یہ رائے درست نہیں ہے' قلب کے اعمال پر مواخذہ کیوں نہ ہو جب کہ کبر' عجب' ریا' اور حسد وغیرہ قلب کے اعمال ہیں' اور آیات و روایات سے ان پر مواخذہ ثابت ہے۔ اصل یہی ہے کہ جو اعمال بندے کے اختیار میں ہیں خواہ وہ آنکھ کے ہوں یا کان کے ہوں یا دل کے ہوں سب پر مواخذہ ہو گا' چنانچہ اگر کسی نا محرم عورت پر بلا اختیار نظر پڑ جائے تو اس پر مواخذہ نہیں ہے' لیکن اگر دوبارہ قصد و ارادے کے ساتھ اس پر نظر ڈالی تو مواخذہ ہو گا۔ یہی حال قلب کے خواطر کا ہے' بلکہ پہلے مواخذہ قلب ہی سے ہونا چاہئے کیوں کہ قلب ہی اصل ہے' چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سینے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا۔

اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا (مسلم۔ ابوہریرہؓ)

تقویٰ یہاں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاءُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ (پ ۱۷ ر ۱۲ آیت ۳۷)

اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون' لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

الاثم حواز القلوب۔ (۱)

گناہ دلوں میں کھٹکنے والا ہے

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:۔

البر ما اطمأن الیہ القلب وان افتوک وافتوک (۲) (طبرانی۔ ابو ثعلبہ)

نیکی وہ ہے جس پر دل مطمئن ہو جائے اگرچہ لوگ تم پر فتویٰ لگائیں' فتویٰ لگائیں۔

ہم یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر مفتی کے دل میں کسی امر کے وجوب کا خیال آیا اور وہ امر فی الحقیقت واجب نہیں ہے تب بھی اسے ثواب ملے گا' اسی طرح اگر کسی کے دل نے یہ گواہی دی کہ میں وضو سے ہوں' اس نے دل کی گواہی پر مطمئن ہو کر نماز پڑھ لی' پھر قرائن سے معلوم ہوا کہ نماز بلا وضو پڑھی گئی ہے تو اس نماز پر ثواب ملے گا' لیکن اگر طہارت کی گواہی کے بعد نماز چھوڑے گا تو گنہگار ہو گا' اسی طرح اگر کسی نے اجنبیہ سے یہ سمجھ کر جماع کر لیا کہ یہ میری بیوی ہے تو گنہگار نہ ہو گا' اس کے برعکس اگر یہ عورت منکوحہ ہوتی اور وہ اسے غیر سمجھ کر جماع کرتا تو گنہگار ہوتا۔ ان تمام مسائل میں قلب کو اہمیت دی گئی ہے' اعضاء کو ان میں کوئی دخل نہیں ہے۔

ذکر کے وقت قلب کے وسوسوں کا مکمل انقطاع

اس بحث کا موضوع یہ ہے کہ ذکر کے وقت قلب کے وساوس پورے طور پر ختم ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ احوالِ قلب کے نگراں' اور اس کے عجائب و صفات پر نظر رکھنے والے علماء کے اس سلسلے میں پانچ فریق ہیں۔

ایک فریق کا خیال یہ ہے کہ اللہ کے ذکر سے وسوسہ ختم ہو جاتا ہے' حدیث میں ہے:۔

---

(۱) یہ روایت کتاب العلم میں گذر چکی ہے (۲) اسی مضمون کی ایک حدیث وابصہ سے مسند احمد میں منقول ہے' یہ دونوں روایتیں پہلے بھی گذر چکی ہیں۔

فاذاذکر اللہ خنس۔ (ابن ابی الدنیا، ابن عدی۔ انس)

جب اللہ کا ذکر کرتا ہے تو ہٹ جاتا ہے۔

خنس کے معنیٰ ہیں سکوت' مطلب یہ ہوا کہ شیطان ذکر الٰہی کے وقت خاموش ہو جاتا ہے' اور اپنی حرکتیں ختم کر دیتا ہے' دوسرے فریق کا قول یہ ہے کہ ذکر سے وساوس ختم تو نہیں ہوتے البتہ ان کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے' اس لیے کہ جب دل پر اللہ تعالیٰ کا ذکر محیط ہو جاتا ہے تو اس میں وسوسہ کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی' اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص گہری سوچ میں غرق ہو' اگرچہ لوگوں کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑتی ہیں اور وہ خود بھی گفتگو میں حصہ لیتا ہے لیکن سمجھتا کچھ نہیں ہے' جس طرح سوچ میں مستغرق شخص ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتا ہے اسی طرح ذاکر بھی وساوس کے اثر سے آزاد ہو جاتا ہے' تیسرے فریق کی رائے یہ ہے کہ نہ وسوسہ ختم ہوتا ہے اور نہ اس کا اثر زائل ہوتا ہے البتہ قلب سے اس کا غلبہ ختم ہو جاتا ہے' یعنی وسوسہ ضعیف پڑ جاتا ہے۔ چوتھے فریق کا خیال یہ ہے کہ ذکر سے وسوسہ ختم ہو جاتا ہے' اور وسوسہ سے ذکر کا اثر معدوم ہو جاتا ہے' یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے کہ وسوسہ ہے تو ذکر نہیں اور ذکر ہے تو وسوسہ نہیں۔ اور ان دونوں کی آمد و رفت پے بہ پے جاری رہتی ہے' ان کی جلدی جلدی اور پے بہ پے آنے سے ایسا لگتا ہے گویا وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کرہ پر قریب قریب نقطے ہوں اور اسے تیزی سے حرکت دی جائے تو وہ نقطے ایک دوسرے سے متصل دائرے معلوم ہوں گے' اس فریق کی دلیل یہ ہے کہ اگرچہ حدیث شریف میں خنس (سکوت) وارد ہے لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ذکر کے باوجود قلب وسوسوں میں گھرا رہتا ہے' حدیث شریف کے مفہوم اور ہمارے تجربے میں تطبیق کی یہی ایک صورت ہے جو مذکور ہوئی۔ پانچویں فریق کا قول یہ ہے کہ وسوسہ اور ذکر کبھی منقطع نہیں ہوتے' بلکہ دونوں کا عمل اپنی اپنی جگہ جاری رہتا ہے' جس طرح انسان اپنی آنکھ سے بیک وقت دو مختلف چیزیں دیکھ لیتا ہے اسی طرح قلب پر بھی بیک وقت دو مختلف حال طاری ہو جاتے ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

مامن عبد الا ولہ اربعۃ اعین' عینان فی راسہ یبصر بھما امر دنیاہ' وعینان فی قلبہ یبصر بھما امر دینہ (ابو منصور دیلمی۔ معاذ بن جبل)

ہر بندے کی چار آنکھیں ہوتی ہیں' دو سر میں جن سے وہ اپنے دنیوی امور دیکھتا ہے اور دو دل میں جن سے وہ اپنے دینی امور کا مشاہدہ کرتا ہے۔

محاسبی کی رائے بھی یہی ہے۔

وساوس کی قسمیں: ہمارے نزدیک یہ تمام مذاہب صحیح ہیں' لیکن ان میں وسوسوں کی تمام قسموں کا احاطہ نہیں کیا گیا بلکہ ان میں سے ہر فریق نے ایک قسم پر نظر ڈالی اور اسی کے مطابق فیصلہ کر دیا۔ وسوسوں کی کئی قسمیں ہیں۔

پہلی قسم۔ تلبیس حق: ایک قسم یہ ہے کہ شیطان حق کو مشتبہ کرنے کے لیے وسوسہ ڈالے مثلاً کسی انسان سے یوں کہے کہ دنیاوی لذات نہ چھوڑنی چاہئیں۔ کیونکہ زندگی طویل ہے' اتنے طویل عرصے تک خواہشات کو قابو میں رکھنا صبر آزما کام ہے اس موقعہ پر اگر بندہ اللہ تعالیٰ کے حق عظیم' ثواب عظیم اور عذاب الیم کا تصور کرے گا اور دل کو یہ سمجھائے گا کہ زندگی طویل ہو سکتی ہے مگر آخرت کی زندگی کے مقابلے میں وہ بہرحال مختصر ہے' اور یہ تمام دنیاوی لذات فانی ہیں' اگرچہ بظاہر ان پر صبر کرنا مشکل ہے لیکن دوزخ کی آگ کے مقابلے میں چنداں مشکل نہیں ہے' اور ان دونوں میں سے ایک ضروری ہے اگر دنیا میں لذات پر صبر کی مشقت برداشت کرلی تو دوزخ کی مشقت برداشت نہیں کرنی پڑے گی' اور دنیا میں صبر نہ کیا تو آخرت کی مشقت برداشت کرنی ہوگی' بہرحال اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور وعیدوں کی یاد دہانی' اور ایمان و یقین کی تجدید شیطان کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے'

اس لیے کہ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ دوزخ کی آگ معاصی پر صبر کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے یا یہ کہ معاصی کا ارتکاب دوزخ کی طرف نہیں پہنچاتا' اگر اس نے اس طرح کے دعوے کئے بھی تو بندہ مؤمن کتاب اللہ پر اپنے ایمان کی وجہ سے ان وعدوں پر یقین ہی کب کرے گا۔ اسی طرح اگر وہ عجب کا وسوسہ ڈالے مثلاً یہ کہے کہ تجھ سے زیادہ کسی شخص کو باری تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہے' اور نہ تیری عبادت کی مثال کہیں ملتی ہے' اللہ کے یہاں تیرا درجہ انتہائی بلند ہے' اس موقعہ پر بندہ کو یہ سوچنا چاہئے کہ معرفت' عبادت' علو مرتبت اور وہ تمام اعضاء جنھوں نے عمل کیا' اور وہ تمام اعمال جن سے معرفت حاصل ہوئی سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اسی کی عطا کردہ دولت ہیں' میرا اس میں کوئی کمال نہیں ہے' اس خیال کے بعد عُجب اور خود پسندی کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی' شیطان ہزیمت اٹھاتا ہے' اس لیے کہ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سب اللہ کی مخلوق نہیں ہیں' اگر اس نے یہ کہا بھی تو بندہ کی معرفت اور اس کا ایمان اس کی بات کا یقین ہی کب کرنے دے گا۔ وسوسوں کی یہ قسم ایمان و معرفت کے نور کے حامل عارفین کے دلوں سے ذکر کے ذریعہ بالکلیہ ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری قسم۔ تحریکِ شہوت : وسوسوں کی دوسری قسم یہ ہے کہ شیطان شہوت کو تحریک دے' اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ بندہ کو اس شہوت کا معصیت ہونا یقینی طور پر معلوم ہو دوسری یہ کہ وہ ظنِ غالب سے معلوم ہو' یقین کی صورت میں شیطان شہوت کو حرکت دینے سے تو باز نہیں آئے گا لیکن وہ اس حرکت کو مؤثر نہ بنا سکے گا' اگر وہ یقینی نہیں بلکہ ظن ہے تو شیطان کی تحریک مؤثر بھی ہو سکتی ہے' اس صورت میں اس کے ازالے کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہوگی' وسوسہ کی یہ قسم ذکر کے وقت پورے طور پر ختم نہیں ہوتی البتہ غالب بھی نہیں ہو پاتی۔

تیسری قسم۔ خواطر : وسوسہ کی تیسری قسم محض خواطر اور غائب احوال کی یاد ہے جو نماز میں آتی ہے' چنانچہ جب بندہ ذکر الٰہی میں مشغول ہوتا ہے تو یہ خواطر تھوڑی دیر کے لیے ختم ہو جاتے ہیں' پھر آجاتے ہیں پھر ختم ہو جاتے ہیں' بعض اوقات خواطر کی آمد و رفت اتنی پے بہ پے اور مسلسل ہوتی ہے کہ خواطر اور ذکر دونوں ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں معلوم ہوتی ہیں' یہاں تک کہ بعض اوقات خواطر بھی آتے ہیں اور قرأت کے معنی بھی سمجھ میں آتے ہیں گویا قلب میں دونوں کے لیے دو الگ الگ جگہیں ہیں جہاں وہ دونوں بیک وقت سما سکتے ہیں' اس قسم کے وسوسہ کا مکمل طور پر سے منقطع ہونا بہت مشکل ہے' لیکن محال نہیں ہے' اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

من صلی رکعتین لم یحدث فیہما نفسہ بشئی من امر الدنیا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ۔(۱)

جو شخص دو رکعتیں ایسی پڑھے کہ ان میں اس کا نفس کوئی دنیا کی بات نہ کرے تو اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

اگر یہ ممکن نہ ہوتا کہ ذکر الٰہی کے وقت کسی طرح کا کوئی وسوسہ دل میں نہ ہو تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ذکر نہ فرماتے۔ لیکن یہ صورت تمام قلوب کے ساتھ پیش نہیں آسکتی' بلکہ صرف اسی دل میں اس کا تصور کیا جا سکتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی محبت اس درجہ غالب آچکی ہو کہ اس کے علاوہ کوئی خیال نہ آتا ہو' جس طرح عاشق صادق کے دل میں محبوب کی بات کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں آتی' اسی طرح اگر کسی شخص کو اپنے دشمن کا فکر ہوتا ہے تو وہ اس کے تصور میں' اور اسے ایذا پہنچانے کے خیال میں اتنا مستغرق ہوتا ہے کہ نماز کا خیال بھی نہیں آتا' اور نہ یاد رہتا ہے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں' اور کس رکعت میں کیا پڑھا ہے؟ حد یہ ہے کہ اس دوران اگر کوئی قریب سے بھی گذر جائے تو پتا نہیں چلتا' خواہ آنکھیں کھلی ہوں اور بظاہر اسے دیکھ بھی رہی ہوں' جب دنیاوی امور میں استغراق کی یہ کیفیت ہو سکتی ہے تو دوزخ کے خوف اور جنت کے شوق میں بندے کی

---

(۱) یہ روایت کتاب الصلوٰۃ میں گذر چکی ہے۔

یہ حالت کیوں نہیں ہو سکتی' البتہ ایمان کی کمزوری کے پیش نظر اس طرح کی کیفیت عام نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ شیطان سے چند لمحوں کے لیے نجات ممکن ہے' لیکن عمر بھر کے لیے چھٹکارا ممکن نہیں ہے' اگر کوئی شخص شیطان کے وسوسوں اور اس کی ہیجان انگیزی سے محفوظ رہ سکتا تھا تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہوتی' جب کہ روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ نماز پڑھتے ہوئے اپنے کپڑے کے نقوش پر آپ کی نظر پڑی' سلام پھیرنے کے بعد آپ نے وہ کپڑا اتار پھینکا اور ارشاد فرمایا:۔

شغلنی عن الصلاۃ' اذھبوا بہ الی ابی جھم (۱)

اس کپڑے نے تو مجھے نماز سے روک دیا' اسے ابو جہم کے پاس لے جاؤ۔

آپ کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی تھی' ایک مرتبہ خطبہ کے دوران اس پر نظر جا پڑی تو آپ نے اسے اٹھا کر پھینک دیا' اور فرمایا:۔ نظر الیہ' و نظر الیکم (نسائی۔ ابن عباسؓ)

میں ایک بار اسے دیکھتا ہوں اور ایک بار تمہیں دیکھتا ہوں۔

کپڑے کے نقوش اور سونے کی انگوٹھی سے دھیان بٹنے کا عمل شیطان کا وسوسہ تھا' یاد رہے کہ سونے کی انگوٹھی کا واقعہ مردوں کے لیے سونے کی حرمت کی نزول سے پہلے کا ہے' آپ نے یہ انگوٹھی پہنی کیونکہ اس وقت پہننا جائز تھا' بعد میں اُتار دی کیونکہ اس سے وسوسے پیدا ہو رہے تھے اور دنیاوی مال و متاع سے متعلق وسوسے انہیں اپنے سے دور ہٹا کر ہی ختم کیے جاسکتے ہیں' جب تک کوئی شخص ضرورت سے زائد چیز کا مالک رہے گا تو اسے شیطان وسوسہ میں ضرور مبتلا کرے گا' خواہ وہ زائد چیز ایک درہم یا ایک دینار ہی کیوں نہ ہو' دراہم و دنانیر میں وسوسے کی صورت یہ ہوگی کہ شیطان صاحب مال کو ان کی حفاظت کے سلسلے میں متفکر رکھے گا' نیز اسے بتلائے گا کہ وہ اس مال کو کہاں خرچ کرے' اسے کس طرح چھپا کر رکھے تاکہ لوگوں کو تمہارے پاس مال کی موجودگی کا پتا نہ چلے یا اسے کس طرح ظاہر کرے کہ لوگ تمہاری برتری تسلیم کریں' یہ اور اسی طرح کے دوسرے وسوسے اسے پریشان رکھیں گے' دنیاوی دولت کے مردہ جسم میں اپنی طمع کے پنجے گاڑنے کے بعد شیطان سے بچنے کی خواہش رکھنے والا ایسا ہے جیسے کوئی شخص شہد میں گر جائے اور یہ توقع رکھے کہ اس پر مکھیاں نہیں بیٹھیں گی' حالانکہ یہ ممکن نہیں ہے' دنیا شیطانی وسوسوں کا ایک بڑا دروازہ ہے' اور یہ صرف ایک دروازہ نہیں ہے بلکہ بے شمار دروازے ہیں جن سے شیطانی لشکر وسوسوں کے بوجھ اٹھائے اپنی آمد و رفت جاری رکھے ہوئے ہیں ایک دانشور کہتے ہیں کہ شیطان آدمی کے پاس معاصی کی راہ سے آتا ہے' یہ راہ بند ہو تو نصیحت کا راستہ اپناتا ہے اور اسے بدعت میں مبتلا کر دیتا ہے' اگر وہ راستہ بھی مسدُود کر دے تو اسے تنگی اور تشدّد کی راہ دکھلاتا ہے کہ جو چیز حرام نہ ہو اسے بھی حرام کر لے' اگر وہ اس سے بھی منع کر دے تو اسے وضو اور نماز کے دوران شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیتا ہے' اگر اس سے بھی کام نہیں چلتا تو اس پر خیر کے کاموں کو آسان کر دیتا ہے' جب لوگ اسے نیک اور صابر و عفیف سمجھ کر راغب ہونے لگتے ہیں تو وہ اسے عُجب میں مبتلا کر کے ہلاک کر دیتا ہے' یہاں وہ جدوجہد کی تمام تر قوت صرف کر دیتا ہے' یہ آخری موقعہ ہوتا ہے' اور شیطان یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا' اس لیے کہ وہ یہ جانتا ہے کہ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو میرا شکار جال میں پھنسنے کے بجائے سید ھا جنت میں جائے گا۔

قلب کی سُرعتِ تغیر اور اِثبات و تغیر میں اس کی قِسمیں

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا قلب مختلف متضاد اوصاف کے درمیان گھرا ہوا ہے' گویا وہ ایک ہدف ہے جس پر چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہوتی ہے' اس پر ایک چیز کا اثر ہوتا ہے تو دوسری طرف سے دوسری چیز آکر اس اثر کو زائل کر دیتی ہے' شیطان اسے ہوائے نفس کی

(۱) یہ روایت کتاب الصلوۃ میں گذر چکی ہے۔

طرف کھینچتا ہے' فرشتہ سمتِ مخالف میں کھینچتا ہے' ایک شیطان ایک شر کی جانب لے جاتا ہے تو دوسرا شیطان دوسرے شر کی دعوت دیتا ہے اسی طرح ایک فرشتہ ایک خیر کی طرف بلاتا ہے تو دوسرا فرشتہ دوسرے خیر کی طرف بلاتا ہے' کبھی وہ دل دو فرشتوں کی کشاکش میں جتلا ہو جاتا ہے' کبھی دو شیطانوں کی اور کبھی شیطان و فرشتے کی۔ اسے کسی بھی وقت فرصت کا لمحہ میسّر نہیں آتا' اس آیت میں قلب کی اسی کیفیت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ (پ ۷ ر ۱۹ آیت ۱۱۰)

اور ہم بھی ان کے دلوں کو اور ان کی نگاہوں کو پھیر دیں گے۔

کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قلب کی عجیب میں اللہ کا عجب و غریب صنعت پر مطلع تھے' اور اس بات سے واقف تھے کہ یہ گوشت کا ٹکڑا ہر لحہ ہر آن متغیر رہتا ہے اس لیے آپ یہ قسم کھایا کرتے تھے۔

لا : ومقلب القلوب۔ بخاری۔ ابن عمرؓ نہیں! قسم ہے دلوں کے بدلنے والے کی۔

آپ بکثرت یہ دعا فرماتے تھے:۔ یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ

اے دلوں کے بدلنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ۔

لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا آپ کو بھی اپنے دل کے بارے میں کسی طرح کا کوئی اندیشہ ہے' فرمایا:۔

ومايومنني والقلب بين اصبعين من اصابع الرحمٰن يقلبه كيف يشاء۔

میں کس وجہ سے بے خوف ہو جاؤں جب کہ دل باری تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے وہ جس طرح چاہتا ہے بدل دیتا ہے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:۔

ان شاء ان يقيمه اقامه وان شاء ان يزيغه ازاغه۔ (حاکم جابر بن عبداللہؓ)

اگر وہ سیدھا کرنا چاہتا ہے تو سیدھا کر دیتا ہے اور ٹیڑھا کرنا چاہتا ہے تو ٹیڑھا کر دیتا ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قلب کی تین مثالیں بیان فرمائیں۔ ایک مثال یہ ہے۔

مثل القلب مثل العصفور يتقلب في كل ساعة (حاکم' بیہقی۔ ابو عبید الجراحؓ)

قلب کی مثال چڑیا جیسی ہے کہ ہر وقت لوٹ پوٹ ہوتی رہتی ہے۔

دوسری مثال ان الفاظ میں بیان فرمائی:۔

مثل القلب في تقلبه كالقدر اذا استجمعت غليانها۔ (احمد' حاکم۔ مقداد بن اسودؓ)

قلب کی مثال بدلنے میں ہانڈی جیسی ہے۔ جس وقت اس میں خوب جوش آتا ہے۔

تیسری مثال یہ بیان فرمائی:۔

مثل القلب كمثل ريشة بارض فلاة تقلبها الرياح ظهر البطن۔ (طبرانی بیہقی۔ ابو موسیٰ الاشعری)

قلب کی مثال ایسی ہے جیسے صحرا میں پر ہو جسے ہوائیں الٹ پلٹ کرتی رہتی ہوں۔

قلب کے تغیّرات' اور ان میں اللہ تعالیٰ کی صنعت کے عجائب کی معرفت وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو قلب کے نگراں رہتے ہوں اور مراقبہ میں لگے رہتے ہوں۔

تغیر و ثبات کے اعتبار سے قلب کی تین قسمیں : خیر و شر پر ثبات یا ان دونوں کے درمیان متردد رہنے کے اعتبار سے قلب کی تین قسمیں ہیں۔

تقویٰ کے نور سے معمور : ایک دل وہ ہے جو تقویٰ کے نور سے معمور ہو' اور اخلاقِ رذیلہ سے پاک و صاف ہو' اس طرح کے قلب پر خیر کے خواطر غیب کے خزانے اور عالم ملکوت سے آتے ہیں' عقل ان کے دقائق اور اسرار و فوائد پر مطلع ہونے کے لیے ان میں

فکر کرتی ہے' جب نُورِ بصیرت سے کسی خیر کا خیر ہونا ظاہر ہو جاتا ہے تو عقل اس کی اہمیت کا فیصلہ کرتی ہے اور قلب کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دیتی ہے' فرشتہ جب یہ دیکھتا ہے کہ اس قلب کا جوہر صاف ہے' نورِ خرد سے اس کی محرابیں روشن ہیں' تقوٰی کی ضیا بار کرنیں چاروں طرف پڑ رہی ہیں' اور معرفتِ الٰہی کی شمع جل رہی ہے' بلاشبہ اسی طرح کے قلوب ہمارا مسکن' ہمارے اترنے اور ٹھہرنے کی جگہیں ہیں تو وہ نظر نہ آنے والے لشکروں سے اس کی مدد کرتا ہے' اور بہت سے خیر کے کاموں کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے' اور عمل پر اس کی اعانت کرتا ہے' یہاں تک کہ وہ اسے عمل خیر کا عادی بنا دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالٰی فرماتے ہیں:۔

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ۔ (پ ۳۰ ر ۱۷ آیت ۵۔۷)

سو جس نے (اللہ کی راہ میں مال) دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات (اسلام) سچا سمجھا تو اس کے لیے سامان راحت کریں گے۔

اسی طرح کے قلوب میں محراب ربوبیت کی شمع سے اتنا اُجالا پھیلتا ہے کہ وہ شرک خفی بھی نگاہوں سے اُوجھل نہیں ہوتا جو اندھیری رات میں رینگنے والی سیاہ چیونٹی سے بھی زیادہ خفی ہے۔ ایسے دلوں پر شیطانی مکر مؤثر نہیں ہوتا' وہ لاکھ دھوکا دیتا ہے' چکنی چپڑی باتیں بناتا ہے لیکن بندہ اس کی طرف ادنٰی اِلتفات بھی نہیں کرتا' یہ دل ہلکات سے نجات کے بعد منجیات سے آراستہ ہو جاتا ہے' یہ منجیات ہیں شکر' صبر' خوف' رجاء' فقر' زہد' محبت' رضا' شوق' توکل' تفکر' اِحتساب وغیرہ۔ اسی قلب پر اللہ تعالٰی کی توجہ ہوتی ہے' اسی قلب کا ذکر مندرجہ ذیل آیتوں میں ہے۔

أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (پ ۱۳ ر ۱۰ آیت ۲۸)

خوب سمجھ لو اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (پ ۳۰ ر ۱۴ آیت ۲۷۔۲۸)

اے اطمینان والی روح اپنے پروردگار کی (جوارِ رحمت کی) طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔

خواہشاتِ نفس سے لبریز قلب: دوسرا دِل اس دِل کے برعکس ہے یعنی وہ نفسانی خواہشات سے پُر ہوتا ہے اور مذموم عادات سے آلودہ ہوتا ہے' اس دل کے دروازے شیاطین کے لیے کھلے رہتے ہیں اور فرشتوں کے لیے بند رہتے ہیں' اس طرح کے دل میں شر کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ پہلے اس میں ہوائے نفس کا تصور آتا ہے' اور گناہ کی کھٹک پیدا ہوتی ہے' دل عقل کے حاکم سے مشورہ طلب کرتا ہے' عقل کیوں کہ پہلے ہی سے ہوائے نفس کی خادم ہے اور اس سے مانوس ہے اس لیے وہ اس کے حق میں فیصلہ کرتی ہے اور جواز کے لیے اسباب مہیا کرتی ہے' اس طرح نفس دل پر اپنا قبضہ جمالیتا ہے اور گناہ پر اس کی مدد کرتا ہے' آدمی کا سینہ نفسانی خواہشات کے لیے کھل جاتا ہے' اور ہوس کے اندھیرے پھیلنے لگتے ہیں کیوں کہ عقل کی فوج پہلے اپنی قوّتِ مدافعت کھو بیٹھتی ہے' اور اپنی باگ دوڑ نفس کے ہاتھ میں دے دیتی ہے اس لیے شیطان کی سلطنت کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے' وہ دل کو ظاہری زیب و زینت فریب و مکر اور جھوٹی امیدوں میں پھنساتا ہے' اور اس طرح کی چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے کہ ایمان کی سلطنت کمزور پڑ جاتی ہے اور یقین کی شمع گُل ہو جاتی ہے' یعنی وعدہ' وعید' جنت دوزخ اور آخرت پر ایمان باقی نہیں رہتا' ہوائے نفس ایک دھواں ہے جو قلب کے چاروں طرف پھیل جاتا ہے اور ایمان و یقین کا چراغ گل کر دیتا ہے' عقل کی کیفیت اس طرح ایسی ہو جاتی ہے جیسے کسی شخص کی آنکھ میں دُھواں بھر جائے اور وہ دیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے' غلبۂ شہوت بھی قلب سے غور و فکر کی صلاحیت اور بصیرت کا نور سلب کر لیتا ہے' اور ہدایت سے اس قدر بے بہرہ ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی واعظ اچھی بات بتلانا بھی چاہے تو وہ سمجھتا نہیں ہے۔ شیطان الگ حملہ آور ہوتا ہے' نفس کی خواہشات الگ حملہ کرتی ہیں۔ اعضاء الگ موافقت کرتے ہیں' اس طرح معصیت کے ظہور کے لیے تمام اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔ حسبِ ذیل آیات میں ایسے ہی دل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا۔ (پ ۱۹ ر ۲ آیت ۴۴)

اے پیغمبر! آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے سو کیا آپ اس کی نگرانی کر سکتے ہیں یا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں یہ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰی اَکْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ (پ ۲۸ ر ۱۸ آیت ۶)

ان میں سے اکثر لوگوں پر بات ثابت ہو چکی ہے سو ہرگز یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے۔

سَوَاءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ (پ ۱ ر ۱ آیت ۶)

برابر ہے ان کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لائیں گے۔

بعض دلوں کا حال تو تمام شہوتوں میں یکساں ہوتا ہے' بعض دل بعض شہوتوں میں ملوّث ہو جاتے ہیں اور بعض شہوتوں کے قریب بھی نہیں جاتے۔ مثلاً بعض لوگ عام معاصی سے اجتناب کرتے ہیں لیکن جب کوئی حسین صورت نظر پڑتی ہے تو انہیں ضبط کا یارا نہیں رہتا اور وہ عقل و خرد سے بیگانہ ہو کر اس گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں' بعض لوگ اقتدار' جاہ اور منصب کے اتنے بھوکے ہوتے ہیں کہ جب بھی ان چیزوں کے حصول کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے وہ دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑتے ہیں' بعض لوگ اپنا عیب نہیں سن سکتے اپنی اہانت برداشت نہیں کر سکتے' اگر کوئی ایک لفظ بھی کہہ دیتا ہے تو وہ غصہ سے آگ بگولا ہو جاتے ہیں' بعض لوگ اپنی عام زندگی میں تقویٰ و طہارت پر عمل پیرا رہتے ہیں لیکن جب روپے پیسے کی لین دین کی بات آتی ہے تو تقویٰ و تقدس کی تمام قبائیں چاک کر ڈالتے ہیں' اور مال پر اس طرح گرتے ہیں جس طرح کتا بچی ہوئی ہڈی پر ٹوٹتا ہے ان تمام معاصی کا ارتکاب ان ہی دلوں سے ہوتا ہے جن کے ارد گرد ہوائے نفس کے دھوئیں کی دبیز چادر چھا جاتی ہے' اور بصیرت کا نور مدھم پڑ جاتا ہے' حیا اور ایمان رخصت ہو جاتا ہے' اور وہ لوگ شیطان کے منشاء و مراد کی تکمیل میں لگ جاتے ہیں۔

تیسرا قلب۔ خاطر شہوت اور خاطر ایمان کے درمیان: قلب کی تیسری قسم وہ ہے جس میں ہوائے نفس کے خواطر پیدا ہوتے ہیں اور اسے شر کی طرف بلاتے ہیں' اسی وقت ایمان کے خواطر آتے ہیں اور اسے خیر کی طرف بلاتے ہیں' نفس اپنی تمام تر شہوتوں کے ساتھ شر کے خواطر پر آمادہ نظر آتا ہے' شہوت کو تقویت دیتا ہے' اور لذت خیزی و عیش کوشی کے فضائل بیان کرتا ہے۔ عقل خیر کے خواطر کی مدد کرتی ہے' اور شہوت کی برائی کرتی ہے' اور نفس کو بتلاتی ہے کہ یہ کام جہالت کا ہے' بہائم اور درندوں کے افعال کے مشابہ ہے' کیونکہ بہائم اور درندے ہی انجام کی پروا کئے بغیر شر پر گر پڑتے ہیں۔ نفس عقل کی نصیحت پر مائل نظر آتا ہے تو شیطان نفس کا پیچھا چھوڑ کر عقل کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور اس طرح شہوت کے دواعی کو تقویت پہنچاتا ہے' شیطان عقل سے کہتا ہے کہ تو خواہ مخواہ اپنے نفس کو کیوں تنگی میں مبتلا کئے ہوئے ہے' تو نے اپنی خواہشات بالائے طاق کیوں رکھ دیں' کیا تیرے ہم عصروں میں کوئی ایسا ہے جو خواہشات کا مخالف اور اپنی اغراض کا تارک ہو' ان کے حصے میں دنیا کی لذتیں ہیں' اور تیرے حصے میں تنگی ہے وہ خوش نصیب ہیں تو محروم القسمت' بدبخت' اور مصیبت زدہ ہے' دنیا کے لوگ تیرا مضحکہ اڑاتے ہیں اور دوسروں کی مثالیں دیتے ہیں جنہوں نے میرے بتلائے ہوئے راستے پر چل کر بڑے بڑے منصب حاصل کئے' تو ان کی راہ کیوں نہیں چلتی' کیا تو فلاں عالم کو نہیں دیکھتی کہ وہ فلاں فلاں کام کرتے ہیں' اگر یہ کام برے ہوتے تو وہ کیوں کرتے' نفس شیطان کی طرف جھکتا ہے اسی وقت فرشتہ نفس کا راستہ روک لیتا ہے اور اسے بتلاتا ہے کہ جو شخص حال کی لذات کے حصول میں مآل اور انجام سے بے پرواہ ہو جاتا ہے وہ تباہ و برباد ہوتا ہے' کیا تو ان چند روزہ لذتوں پر قناعت کر کے جنت کی دائمی نعمتوں اور لذتوں کو چھوڑنے کے لیے تیار ہے' کیا تجھے شہوت پر صبر کے مقابلے میں دوزخ کے عذاب کی تکلیف سہل نظر آتی ہے' لوگوں کی اتباع مت کر' اور شیطان کے فریب میں مت آ۔ دوسروں کے گناہ تیرے عذاب کی تکلیف کم نہیں کر سکتے' اگر تجھے سخت گرمی اور لو کے زمانے میں آرام دہ ٹھنڈا مکان میسّر آ جائے تو کیا تو لوگوں کا ساتھ دے گا یا اس مکان کو ترجیح دے گا جہاں نہ سورج کی تپش سے جسم پگھلتے ہیں' اور نہ گرم

جھونکے بدن جھلساتے ہیں' دنیا میں تیرا حال یہ ہے کہ سورج کی گرمی تجھے برداشت نہیں' دھوپ میں تو کھڑا نہیں ہو سکتا' پھر معلوم نہیں دوزخ کے خوف سے کیا چیز مانع ہے' کیا دوزخ کی حرارت سورج کی حرارت سے کم ہے؟ اس نصیحت سے نفس فرشتے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ فرشتے اور شیطان کی کش مکش جاری رہتی ہے اور وہ اسی کشاکش کے درمیان اپنی عمر کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے' بعض اوقات شیطانی اوصاف غالب آجاتے ہیں اور نفس بالکلیہ شیطان کی طرف مائل ہو جاتا ہے' اس کا معاون و مددگار بن جاتا ہے رحمانی گروہ سے اعراض کرتا ہے' اور اس کے اعضاء سے وہ تمام اعمال صادر ہوتے ہیں جن پر ازلی تقدیر نے مہر ثبت کر رکھی ہے اور جو اسے اللہ سے دور لے جاتے ہیں' ملکوتی صفات غالب آتی ہیں تو نفس شیطان کے جال میں نہیں پھنستا' اس کے فریب کا قلع قمع کر دیتا ہے' دنیا کی فانی لذات کو ترجیح نہیں دیتا۔ آخرت کے اُمور میں سُستی کا مظاہر نہیں کرتا' بلکہ رحمانی گروہ کی اطاعت کرتا ہے' اور اس کے اعضاء سے وہ اعمال صادر ہوتے ہیں جو رضائے الٰہی کا باعث ہوں۔ اور یہ بھی تقدیر ازل ہی کے مطابق ہوتا ہے قلب المؤمن بين اصبعين من اصابع الرحمٰن میں اسی کش مکش کی طرف اشارہ ہے جو دونوں فریقوں کے درمیان جاری ہے۔ اس طرح کے قلوب کسی ایک گروہ کی طرف مستقل طور پر مائل نہیں ہوتے' بلکہ ان میں انقلاب اور تغیر کا عمل جاری رہتا ہے۔

اطاعات اور معاصی سب خزانۂ غیب سے عالم ظہور میں آتے ہیں' اور قلب ان کے درمیان واسطہ بنتا ہے' کیونکہ قلب ملکوت کے خزائن میں سے ایک خزانہ ہے۔ اربابِ قلوب اسی ظہور سے قضاء و قدر کی معرفت حاصل کرتے ہیں' جو لوگ جنت کے لیے پیدا ہوئے ہیں ان کے لیے اطاعت کے اسباب مہیّا کر دئے جاتے ہیں اور جو دوزخ کے لیے بنے ہیں ان کے لیے نافرمانی کے اسباب پیدا کر دیئے جاتے ہیں' اور بُرے رُفقاء کی صحبت عطا کی جاتی ہے' اس کے دل میں شیطانی وسوسے پیدا کئے جاتے ہیں۔

شیطان اللہ کی رحمت اور اس کے کرم کا حوالہ دے کر بہت زیادہ بے وقوف بناتا ہے' وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ابھی زندگی پڑی ہے' گناہ کئے جا' توبہ کر لینا یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ سے ڈرنے والوں کی کمی نہیں اگر تو نے ان کی مخالفت کی تو کیا غضب ہو جائے گا۔ قرآن کریم نے اس کے وعدوں کی صحیح تصویر کشی کی ہے:۔

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا (پ ۵ ر ۱۵ آیت ۱۲۰)

شیطان ان لوگوں سے وعدے کیا کرتا ہے اور ان کو ہوسیں دلاتا ہے اور شیطان ان سے صرف جھوٹے وعدے کرتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ توبہ کا وعدہ کرتا ہے' اور مغفرت کی تمنّا دلاتا ہے' اور لوگوں کو ان حیلوں و تدبیروں سے ہلاکت میں مبتلا کر دیتا ہے' آدمی شیطان کے فریب میں آکر اس کی بات قبول کر لیتا ہے' اور حق کے لیے اس کا سینہ بحکم تقدیر ازلی تنگ ہو جاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ (پ ۸ ر ۲ آیت ۱۲۵)

سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ رستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو اسلام کے لیے کُشادہ کر دیتے ہیں' اور جس کو بے راہ کرنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو تنگ بہت تنگ کر دیتے ہیں جیسے کوئی آسمان میں چڑھتا ہے۔

إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ (پ ۴ ر ۸ آیت ۱۵۹)

اگر حق تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں تب تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا اور اگر تمہارا ساتھ نہ دیں' تو اس کے بعد ایسا کون ہے جو تمہارا ساتھ دے' اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہیے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ ہی ہدایت دینے والا ہے اور وہی گمراہ کرنے والا ہے۔

يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيدُ

اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔

نہ کوئی اس کے حکم کو ٹال سکتا ہے' اور نہ اس کے فیصلے کو رَد کرسکتا ہے' اس نے جنت پیدا کی' اور اس کے مستحق پیدا کئے' پھر ان مستحقین کو اطاعت کی راہ پر لگایا' اسی نے دوزخ اور اس کے اہل پیدا کئے' پھر انہیں معاصی کے راستے پر ڈالا' اور اپنے بندوں کو جنتیوں اور دوزخیوں کی علامات بتلادیں اور یہ اعلان فرمادیا:۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ (پ ۳۰ ر ۲۹ آیت ۱۳-۱۴)

نیک لوگ بے شک آسائش میں ہوں گے اور بدکار (کافر) لوگ بے شک دوزخ میں ہوں گے۔

پھر یہ فرمایا جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:۔

هولاء في الجنة ولا ابالي وهولاء في النار ولا ابالي (احمد' ابن حبان۔ عبدالرحمٰن بن قتادہؓ)

یہ لوگ جنت میں ہیں مجھے ان کی پرواہ نہیں اور یہ لوگ دوزخ میں ہیں مجھے ان کی پروا نہیں۔

اللہ تعالیٰ بلند و برتر ہیں:۔ لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ (پ ۱۷ ر ۲ آیت ۲۳)

وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کرسکتا اور اوروں سے باز پرس کی جاسکتی ہے۔

عجائبِ قلب کے سلسلے میں ہم اسی مختصر پر اکتفا کرتے ہیں' کیونکہ اس موضوع پر اس سے زیادہ کچھ کہنا علم معاملہ کے مناسب نہیں ہے' جو کچھ ذکر کیا گیا اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان لوگوں کو علوم معاملہ کے اسرار و رموز سے واقفیت ہو جائے جو ظواہر پر قانع نہیں رہنا چاہتے' اور چھلکے کے بجائے مغز کو ترجیح دیتے ہیں' اور حقائق کی باریکیوں کے مشتاق ہیں' امید ہے کہ ہماری یہ مختصر باتیں ان کی تشنگی دُور کریں گی اور ان کے لیے مفید ثابت ہوں گی۔

کتاب ریاضۃ النفس و تہذیب الاخلاق و معالجۃ امراض القلب

ریاضتِ نفس' تہذیبِ اخلاق اور امراضِ قلب کے علاج کا بیان

جاننا چاہیے کہ حُسنِ اخلاق سیّد المرسلین سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے اور صدّیقین کا افضل ترین عمل ہے۔ یہ حقیقت میں نصف دین ہے' متقین کے مجاہدے اور عابدین کی ریاضت کا ثمرہ ہے۔ برے اخلاق سمِ قاتل ہیں' ان کے دامن میں ذلّت' خواری اور رُسوائی ہے یہ اللہ تعالیٰ سے دور کرتے ہیں' اور شیطان سے قریب کرتے ہیں' یہ اس آگ کے دروازے ہیں جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے:۔

نَارُ اللّٰهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ (پ ۳۰ ر ۲۹ آیت ۶-۷)

وہ اللہ کی آگ ہے جو (اللہ کے حکم سے) سُلگائی گئی ہے جو کہ (بدن کو لگتے ہی) دلوں تک جا پہنچے گی۔

اخلاقِ حَسنہ جنت کے کھلے دریچے' اور تقربِ الٰہی کے وسائل ہیں' اخلاقِ خبیثہ دلوں کے امراض ہیں اور رُوحوں کی بیماریاں ہیں' بدن کے امراض دنیا کی زندگی سے محروم کردیتے ہیں اور دل و روح کے امراض سے آخرت کی زندگی ختم ہو جاتی ہے' بدن کے امراض اور روح و قلب کے امراض میں بظاہر کوئی نسبت نہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اطباء بدن کے امراض کا علاج کرتے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے لاتعداد اصول و قوانین ترتیب دے رکھے ہیں جن کی روشنی میں امراض کی تشخیص کی جاتی ہے' اور دوائیں تجویز کی جاتی ہیں' جب فانی بدن کے امراض کے سلسلے میں انسان جدوجہد کرتا ہے تو اسے روح و قلب کی بیماریوں کے لیے بھی جدوجہد کرنی چاہیے۔ ان بیماریوں کی بھی ایک طِب ہے' جس کا سیکھنا ہر شخص کے لیے ضروری ہے کیونکہ ہر دل میں کچھ نہ کچھ امراض ہوتے ہیں' اگر ان کا علاج نہ کیا جائے تو وہ تباہ کُن ثابت ہوتے ہیں' اور ان کے نتیجے میں دوسرے صدہا امراض پیدا

ہو جاتے ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان امراض کا علم حاصل کیا جائے' امراض کے اسباب دریافت کئے جائیں' اور ان کے علاج و معالجے کے طریقوں سے واقفیت حاصل کی جائے۔ قرآن پاک کی اس آیت

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا (پ ۳۰ ر ۱۶ آیت ۹)

یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے (جان کو) پاک کرلیا۔

میں دل کا علاج ہی مراد ہے' نیز اس آیت

قَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (پ ۳۰ ر ۱۶ آیت ۱۰)

اور نامراد ہوا جس نے اس کو (فجور) میں دبا دیا۔

میں دل کے علاج سے غفلت مقصود ہے۔ ہم اس کتاب میں دلوں کے کچھ امراض اور ان کے علاج کی کیفیات اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں' ہر مرض کا جداگانہ بیان اس جلد کی بقیہ کتب میں آئے گا۔ یہاں مقصد تہذیبِ اخلاق اور اس کے مناہج پر روشنی ڈالنا ہے پہلے ہم بدن کے علاج کا ذکر تقریب فہم کے لیے بطور مثال کریں گے' اسی دوران حسن خلق کے فضائل بیان کئے جائیں گے' حسن اخلاق کی حقیقت بھی زیر بحث آئے گی' اور یہ بیان کیا جائے گا کہ ریاضت کے ذریعہ اچھے اخلاق قبول کئے جاسکتے ہیں' اچھے اخلاق حاصل کرنے کے اسباب اور طریقوں پر بھی گفتگو ہوگی' تہذیبِ اخلاق اور ریاضتِ نفس کے طریقوں کے ساتھ ساتھ ان علامات کا ذکر بھی کیا جائے گا جن سے دلوں کے امراض پہچانے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں گیارہ مباحث ہیں۔

حُسنِ خُلق کی فضیلت اور بَد خلقی کی مذمت

آیات و احادیث : اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں' اور ان پر اپنی نعمتوں کے اظہار کے طور پر فرمایا:۔

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (پ ۲۹ ر ۳ آیت ۴)

اور بے شک آپ اخلاق حسنہ کے اعلیٰ پیمانے پر ہیں۔

حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق قرآن تھا۔(۱) ایک مرتبہ ایک شخص نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے حُسن خلق کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (پ ۹ ر ۱۴ آیت ۱۹۸)

سرسری برتاؤ کو قبول کرلیا کیجئے' اور نیک کام کی تعلیم دیا کیجئے اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہو جایا کیجئے۔

اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:

ھو ان تصل من قطعک و تعطی من حرمک و تعفو عمن ظلمک (۲)

حسن خلق یہ ہے کہ جو تجھ سے قطع رحمی کرے تو اس سے صلہ رحمی کرے جو تجھے محروم رکھے اسے دے اور جو تجھ پر ظلم کرے اسے معاف کردے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (احمد' حاکم' بیہقی۔ ابو ہریرہؓ)

میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔

اثقل مایو ضع فی المیزان یوم القیامۃ تقوی اللہ و حسن الخلق (ابوداؤد'

---

(۱) یہ روایت مسلم میں ہے' اور احیاء العلوم میں پہلے بھی کئی بار گذر چکی ہے۔ (۲) یہ روایت ابن مردویہ نے حضرت جابر' قیس بن سعد بن عبادۃ اور انسؓ سے نقل کی ہے۔

ترمذی۔ ابوالدرداءؓ)

سب سے زیادہ بھاری چیز جو قیامت کے دن میزان میں رکھی جائے گی وہ اللہ کا خوف اور حسن خلق ہوگی۔

ایک شخص سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سامنے کی طرف سے آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! دین کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: حسن خلق وہ شخص چلا گیا اور دوبارہ دائیں طرف سے آیا اور وہی سوال کیا' آپ نے جواب میں فرمایا: حسن خلق' وہ شخص تیسری مرتبہ بائیں طرف سے آیا اور کہنے لگا رسول اللہ! دین کیا ہے' آپ نے فرمایا: حسن خلق' اس شخص نے چوتھی بار بھی یہی سوال کیا' اور پیچھے کی طرف سے آیا' آپ نے فرمایا: کیا تو سمجھتا نہیں ہے دین یہ ہے کہ تو غصہ نہ کرے۔(۱) ایک شخص نے آپ سے پوچھا: رسول اللہ نحوست کیا ہے؟ فرمایا: بدخلقی (احمد۔ عائشہؓ) ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نصیحت کی درخواست کی' آپ نے اسے نصیحت فرمائی:۔

اتق اللہ حیث کنت' قال: زدنی' قال اتبع السئة الحسنة تمحھا' قال: زدنی قال: خالق الناس بخلق حسن۔ (ترمذی۔ ابوذرؓ)

جہاں بھی رہو اللہ سے ڈرتے رہو' اس نے عرض کیا کچھ اور نصیحت فرمائیں! آپ نے فرمایا گناہ کے بعد نیک کام ضرور کرلیا کرو نیکی گناہ کو مٹا دیتی ہے' اس نے عرض کیا مزید نصیحت فرمائیں' آپ نے فرمایا لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کا معاملہ کرو۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! سب سے اچھا عمل کون سا ہے؟ فرمایا: خوش اخلاقی۔ ایک حدیث میں ہے:۔

ماحسن اللہ خلق عبد و خلقہ فتطعمہ النار (۲)

اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کے اخلاق اور صورت دونوں اچھے نہیں بنائے کہ اسے دوزخ کی آگ کھائے۔

حضرت فضیل نقل کرتے ہیں کہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ فلاں عورت دن میں روزے رکھتی ہے' راتوں کو نماز پڑھتی ہے' مگر بد اخلاق بھی ہے اپنے پڑوسیوں کو زبان سے تکلیف پہنچاتی ہے' آپ نے فرمایا: اس عورت میں کوئی خیر نہیں ہے' یہ دوزخی ہے(۳)۔ حضرت ابوالدرداءؓ کہتے ہیں کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے:۔

اول مایوضع فی المیزان حسن الخلق والسخاء' ولما خلق اللہ الایمان قال: اللھم قونی' فقواء بحسن الخلق والسخاء ولما خلق اللہ الکفر قال اللھم قونی' فقواہ بالبخل وسوء الخلق (۴)

میزان میں سب سے پہلے حسن اخلاق اور سخاوت رکھی جائے گی' جب اللہ تعالیٰ نے ایمان کی تخلیق فرمائی تو اس نے عرض کیا اے اللہ مجھے قوت عطا کر' اللہ نے اسے حسن خلق اور سخاوت سے تقویت بخشی اور جب کفر پیدا کیا تو اس نے عرض کیا اے اللہ! مجھے طاقت دے' اللہ نے اسے بخل اور بدخلقی کی طاقت عطا کی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ان اللہ استخلص ھذا الدین لنفسہ ولا یصلح لدینکم الا السخاء وحسن الخلق الا فزینوا دینکم بھما (دار قطنی' خرائطی۔ ابوسعید الخدری)

---

(۱) یہ روایت محمد بن نصر المروزی نے "کتاب تعظیم قدر الصلوٰۃ" میں ابوالعلاء بن الشخیر سے مرسلاً نقل کی ہے۔
(۲) یہ روایت کتاب آداب الصحبۃ میں گزر چکی ہے۔ (۳) یہ روایت بھی کتاب آداب الصحبۃ میں گزر چکی ہے۔ (۴) اس روایت کی اصل مجھے نہیں ملی' البتہ ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابوالدرداءؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ میزان میں حسن خلق سے زیادہ بھاری چیز کوئی دوسری نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے اس دین کو اپنے لئے خالص کو لیا ہے' اور تمہارے دین کے لیے سخاوت اور حسن خلق سے زیادہ کوئی چیز موزوں نہیں ہے خبردار! اپنے دین کو ان دونوں صفتوں سے مزیّن کرو۔

ایک حدیث میں ہے:۔ حسن الخلق خلق اللّٰہ الاعظم (طبرانی اوسط۔ عمار بن یاسرؓ)

خوش خلقی خدائے اعظم کا خلق ہے۔

صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ایمان کے اعتبار سے کون سا مؤمن افضل ہے؟ فرمایا: جو اخلاق کے اعتبار سے سب سے بہتر۔ (ابوداؤد۔ ترمذی' نسائی۔ ابوہریرہؓ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

انکم لن تسعوا الناس باموالکم فسعوھم ببسط الوجہ وحسن الخلق (۱)

تم لوگوں کے ساتھ اپنے مالوں سے وسعت اختیار نہیں کرسکتے سوخندہ روئی اور خوش خلقی کے ساتھ وسعت اختیار کرو۔

آپ نے یہ بھی فرمایا:۔

سوء الخلق یفسد العمل کما یفسد الخل العسل (۲)

بداخلاقی عمل کو اس طرح فاسد کردیتی ہے جس طرح سرکہ شہد کو خراب کردیتا ہے۔

جریر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا:۔

انک امرؤ قد حسن اللّٰہ خلقک فحسن خلقک (خرائطی مکارم الاخلاق)

تجھے اللہ تعالیٰ نے خوبصورت بنایا ہے تو اپنے اخلاق بھی خوبصورت کر۔

براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ اچھے اخلاق والے تھے (خرائطی۔ مکارم الاخلاق) ابو مسعود البدریؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے:۔

اَللّٰهُمَّ حَسَّنْتَ خَلْقِيْ فَحَسِّنْ خُلُقِيْ (۳)

اے اللہ! تو نے میری صورت اچھی بنائی ہے میری سیرت بھی اچھی کر۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کثرت سے فرمایا کرتے تھے:۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعَافِيَةَ وَحُسْنَ الْخُلُقِ (خرائطی)

اے اللہ! میں تجھ سے صحت و عافیت اور خوش خلقی کا سوال کرتا ہوں۔

حضرت ابوہریرہؓ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:۔

کرم المرء دینہ وحسبہ حسن خلقہ ومروتہ عقلہ (ابن حبان' حاکم)

آدمی کا کرم اس کا دین ہے' حسب خوش خلقی ہے اور مروّت عقل ہے۔

اُسامہ ابن شریک کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' اس وقت کچھ اَعرابی آپ سے یہ دریافت کررہے تھے کہ بندے کو سب سے بہتر چیز کیا عطا ہوئی ہے' آپ نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا خلق حسن (اچھے اخلاق) (ابن ماجہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

---

(۱) بزار' ابو یعلیٰ' طبرانی۔ ابوہریرہؓ (۲) ابن حبان بروایت ابوہریرہؓ' بیہقی بروایت ابن عباسؓ (۳) خرائطی۔ مکارم الاخلاق۔ راوی دراصل حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ہیں جیسا کہ ابن حبان نے اپنی صحیح میں اس کی صراحت کی ہے' یہ روایت عائشہؓ سے مسند احمد میں بھی ہے۔

ان احبکم الی واقربکم منی مجلسا یوم القیامۃ احسنکم اخلاقا (۱)
قیامت کے روز مجھے سب سے زیادہ محبوب اور باعتبار مجلس کے مجھ سے قریب تر وہ لوگ ہوں گے جو تم میں زیادہ اچھے اخلاق والے ہوں گے۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں:۔
ثلاث من لم تکن فیہ او واحدۃ منھن فلا تعتدوابشی من عملہ' تقوی تحجزہ عن معاصی اللہ اوحلم یکف بہ السفیہ او خلق یعیش بہ بین الناس (خرائطی' طبرانی کبیر۔ ام سلمہؓ)
جس شخص میں یہ تین چیزیں یا ان میں سے ایک نہ ہو تو اس کے کسی عمل کا اعتبار مت کرو' تقوٰی جو اللہ کی نافرمانیوں سے اسے روکے' بُردباری جس سے بے وقوف کو باز رکھے' اور اخلاق جن کے سہارے لوگوں کے درمیان زندگی گذارے۔

نماز کے آغاز میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کرتے تھے۔
اللّٰھم اھدنی لاحسن الاخلاق لا یھدی لاحسنھا الا انت' واصرف عنی سیئھا لا یصرف عنی سیئھا الا انت (مسلم۔ علیؓ)
اے اللہ! اچھے اخلاق کی طرف میری ہدایت کر' تیرے سوا کوئی اچھے اخلاق کی ہدایت نہیں کرتا' اور مجھے برے اخلاق سے دور رکھ' تیرے سوا برے اخلاق سے کوئی دور نہیں رکھتا۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم ایک روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا:۔
ان حسن الخلق لیذیب الخطیئۃ کما تذیب الشمس الجلید (خرائطی)
خوش اخلاقی گناہ کو اس طرح گلا دیتی ہے جس طرح سورج برف کو پگھلا دیتا ہے۔

خوش اخلاقی کا وصف ان الفاظ میں بھی بیان فرمایا:۔
من سعادۃ المرء حسن الخلق (خرائطی۔ مکارم الاخلاق)
حسن خلق آدمی کی نیک بختی میں سے ہے۔
الیمن حسن الخلق (خرائطی۔ علیؓ)
خوش اخلاق ہونا اچھا شگون ہے۔

حضرت ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا:۔
لا عقل کالتدبیر ولا حسب کحسن الخلق (ابن ماجہ' ابن حبان۔ ابوذرؓ)
عقل جیسی کوئی تدبیر نہیں اور حسن خلق جیسا کوئی حسب نہیں۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت امّ حبیبہؓ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر دنیا میں کسی عورت کے دو شوہر تھے اور وہ دونوں مر گئے تو وہ عورت جنت میں کس کو ملے گی' آپ نے فرمایا:۔
لاحسنھما خلقا کان عندھا فی الدنیا یا ام حبیبۃ ذھب حسن الخلق بخیر الدنیا والآخرۃ (بزار' طبرانی کبیر' خرائطی)
اس کو ملے گی جو دنیا میں اس کے ساتھ زیادہ خوش خلق رہا ہوگا' اے اُمّ حبیبہؓ! خوش خلق دنیا و آخرت کا خیر لے کر گیا۔

---

(۱) یہ روایت کتاب الصحبۃ میں گذر چکی ہے۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:۔

ان المسلم المسدد ليدرك درجة الصائم القائم بحسن خلقه وكرم مزيته (احمد۔ عبداللہ ابن عمروؓ)

جس مسلمان کو خدا توفیق دیتا ہے وہ اپنی خوش اخلاقی اور طبیعت کے کرم سے روزہ دار شب زندہ دار عابد کا درجہ پالیتا ہے۔

ایک روایت میں درجة الظمان فی الهواجر (گرمی کی دوپہر میں پیاسے کا درجہ) کے الفاظ ہیں' عبدالرحمٰن بن سمرة روایت کرتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے' آپ نے ہم سے فرمایا:۔

انی رايت البارحة عجبا رايت رجلا من امتی جاثيا علی ركبتيه وبينه وبين الله حجاب فجاء حسن خلقه فادخله على الله (خرائطی مکارم الاخلاق)

میں نے رات ایک عجیب خواب دیکھا میں نے دیکھا کہ میری اُمت کا ایک شخص دو زانو بیٹھا ہوا ہے اس کے اور خدا تعالیٰ کے درمیان حجاب ہے' اتنے میں اس کا حسن خلق آیا' اور اس کو خدا کے سامنے پیش کردیا۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ان العبد ليبلغ خلقه عظيم درجات الاخرة و شرف المنازل وانه لضعيف فی العبادة (طبرانی' خرائطی۔ انسؓ)

بندہ اپنی خوش اخلاقی سے بڑے بڑے درجات اور منازل کا شرف حاصل کرے گا حالانکہ وہ عبادت میں کمزور ہوگا۔

روایت ہے کہ ایک روز حضرت عمرؓ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی' آپ کے پاس اس وقت قریش کی کچھ عورتیں بیٹھی ہوئی بلند آواز سے باتیں کررہی تھیں' انہوں نے حضرت عمرؓ کی آواز سُنی تو پردہ کے پیچھے چلی گئیں' جب حضرت عمر حاضر ہوئے تو آپ مُسکرا رہے تھے' عرض کیا یا رسول اللہ! آپ مُسکرا کیوں رہے ہیں؟ فرمایا: مجھے ان عورتوں پر ہنسی آرہی ہے جو ابھی تمہارے آنے سے پہلے زور زور سے باتیں کررہی تھیں' اور اب تمہارے ڈر سے اندر چلی گئیں ہیں' حضرت عمرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ آپ اس کے زیادہ مستحق تھے کہ یہ عورتیں آپ سے خوف کھاتیں' پھر آپ ان عورتوں کے پاس گئے اور ان سے دریافت کیا کہ اے دشمن جاں! کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں' انہوں نے جواب دیا: ہاں! کیوں کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہ نسبت سخت مزاج ہو' اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:۔

ايها يا ابن الخطاب' والذی نفسی بيده مالقيك الشيطان قط سالكا فجا الا سلك فجا غير فجك (بخاری و مسلم)

اور سُناؤ خطّاب کے بیٹے! اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے شیطان تم سے کسی ایسے راستے پر نہیں ملے گا جس پر تم چل رہے ہوگے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

سوء الخلق ذنب لا يغفر و سوء الظن خطيئة تضوح (طبرانی صغیر۔ عائشہؓ)

بد خلقی ایک نا قابل معافی گناہ ہے' اور بد گمانی ایک ایسا گناہ ہے جس سے دوسرے گناہ پیدا ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے:۔

ان العبد ليبلغ بسوء خلقه اسفل درك جهنم (طبرانی' خرائطی۔ انسؓ)

بندہ اپنی بد خلقی کی وجہ سے جہنم کے نچلے طبقے میں پہنچ جاتا ہے۔

آثار : حضرت لقمان سے ان کے بیٹے نے پوچھا: ابا جان! انسان میں کون سی خصلت اچھی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: دین' صاحبزادے نے پوچھا اگر دو ہوں انہوں نے کہا: دین اور مال' بیٹے نے کہا: اگر تین ہوں؟ انہوں نے جواب دیا: دین' مال اور حیا۔ پھر پوچھا: اگر چار ہوں؟ فرمایا: دین' مال' حیا اور خوش اخلاقی۔ پوچھا: اگر پانچ ہوں؟ جواب دیا: دین' مال' حیا' حسن خلق' اور سخاوت۔ پوچھا: اگر چھ ہوں؟ انہوں نے جواب دیا: بیٹے! اگر کسی شخص میں یہ پانچ خصلتیں جمع ہو جائیں تو وہ پاکیزہ خو ہے' متقی ہے' اللہ کا ولی ہے' اور شیطان سے بری ہے۔ حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ جس شخص کے اخلاق خراب ہیں وہ عذاب میں مبتلا ہے۔ انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ آدمی اپنے حسن خلق کی وجہ سے جنت کے اعلیٰ درجے میں پہنچ جاتا ہے' جب کہ وہ عبادت گذار بھی نہیں ہوتا اور بد اخلاقی کی وجہ سے جہنم کے نچلے حصے میں چلا جاتا ہے جب کہ وہ عبادت گذار بھی ہوتا ہے' یحییٰ بن معاذ کہتے ہیں اخلاق کی وسعت میں رزق کے خزانے ہیں' وہب بن منبہ فرماتے ہیں بد اخلاق کی مثال ایسی ہے جیسے ٹوٹے ہوئے برتن کہ نہ ان میں پیوند لگایا جاسکتا ہے اور نہ انہیں مٹی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے' فضیل بن عیاض فرماتے ہیں کہ خوش اخلاق فاجر کی صحبت مجھے بد اخلاق عابد کی صحبت سے زیادہ پسند ہے۔ کوئی بد اخلاق آدمی حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے ساتھ سفر میں تھا آپ اس کی بد اخلاقی برداشت فرماتے' اور اس کے ناز اٹھاتے' جب وہ کسی منزل پر رخصت ہوگیا تو آپ اسے یاد کرکے بہت روئے' لوگوں نے رونے کی وجہ معلوم کی' فرمایا مجھے اس پر رحم آتا ہے' بیچارہ مجھ سے تو رخصت ہوگیا لیکن اخلاق بد ابھی تک اس کے ساتھ ہیں۔ حضرت جُنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ قلتِ علم اور قلتِ عمل کے باوجود چار خصلتیں انسان کو اعلیٰ درجات تک پہنچا دیتی ہیں ایک حِلم' دوسری تواضع' تیسری سخاوت اور چوتھی خوش خُلق' اور یہی چار خصلتیں ایمان کا کمال ہیں۔ کتانی کہتے ہیں کہ تصوّف اخلاق کا نام ہے' جو اخلاق میں زیادہ ہوتا ہے وہ تصوّف میں بھی زیادہ ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ اخلاق سے ملو' اور ان کے ساتھ اعمال سے دور رہو' یحییٰ بن معاذ فرماتے ہیں کہ بد اخلاقی ایک ایسی برائی ہے جس کی موجودگی میں حسنات کی کثرت بھی نفع بخش نہیں ہوتی' اور خوش اخلاقی ایک ایسی نیکی ہے کہ اس کے سامنے بُرائیوں کی کثرت بھی نقصان دہ نہیں ہوتی' حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دریافت کیا گیا: کرم کیا ہے؟ فرمایا: کرم وہ ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں اس طرح کیا گیا ہے:۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (پ ۲۶ ر ۱۴ آیت ۱۳)

اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔

پوچھا گیا: حسب کیا چیز ہے؟ فرمایا: تم میں سب سے بہتر اخلاق کا حامل سب سے اچھے حسب کا حامل ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے یہ بھی فرمایا کہ ہر عمارت کی بنیاد ہوتی ہے اسلام کی بنیاد خوش خلقی ہے۔ عطاء فرماتے ہیں کہ جس شخص نے بھی بلندی حاصل کی خوش اخلاقی ہی کے طفیل حاصل کی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی نے بھی حسن خلق کا کمال حاصل نہیں کیا' وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہیں جو حسن خلق کے سلسلے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوشِ پا کی اِتباع کرتے ہیں۔

خوش خلقی اور بد خلقی کی حقیقت

لوگوں نے خوش خلقی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس کی حقیقت پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی' جن لوگوں نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا انہوں نے خوش خلقی کے نتائج و ثمرات پر بحث کی' اور وہ بحث بھی مکمل نہیں کی' بلکہ جس کے ذہن میں جو ثمرہ آیا اس نے وہی لکھ دیا۔ خوش خلقی کی حقیقت و ماہیت اور اس کے مکمل ثمرات و نتائج کا موضوع ہنوز تشنۂ کلام ہے۔

خوش خلقی کے بارے میں چند اقوال : اس سلسلے میں ہم بزرگوں کے کچھ اقوال و ارشادات نقل کرتے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ خوش خلقی یہ ہے کہ خندہ رو رہے' مال خرچ کرے اور لوگوں کی اذیت برداشت کرے۔ واسطی فرماتے ہیں کہ خوش خلقی یہ ہے کہ نہ وہ کسی سے جھگڑے اور نہ کوئی دوسرا اس سے جھگڑا کرے' شاہ کرمانی کے نزدیک خوش خلقی ایذا رسانی سے باز

رہنے اور دوسروں کی ایذا پر صبر کرنے کا نام ہے۔ ایک بزرگ کے بقول خوش خلقی یہ ہے کہ آدمی لوگوں کے قریب بھی ہو اور ان میں اجنبی بھی ہو' واسطی نے ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ تنگی اور کشادگی میں مخلوق کو راضی رکھنے کا نام خوش اخلاقی ہے ابو عثمان کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے خوش رہنا خوش خلقی ہے' سہل تستری سے خوش خلقی کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی تحمل سے کام لے' کسی سے اپنے لیے انتقام نہ لے' ظالم پر رحم اور شفقت کرے' اس کے لیے مغفرت اور ہدایت کی دعا کرے' ایک مرتبہ انہوں نے اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ رزق کے سلسلے میں خدا تعالیٰ سے بدگمان نہ ہو' اس پر اعتماد کرے' اس کا وعدہ پورا نہ ہونے پر خاموش رہے' اس کے حقوق اور اس کی مخلوق کے حقوق میں کوتاہی نہ کرے حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ حسن خلق تین خصلتوں سے عبارت ہے محرمات سے اجتناب' حلال کی طلب' اور اہل و عیال پر توسع۔ حسین بن منصور کے بقول خوش خلقی یہ ہے کہ قبول حق کے بعد مخلوق کا ظلم اس سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو۔ ابو سعید الخراز کہتے ہیں کہ خوش خلقی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے سوا تیرا کوئی مقصد نہ ہو۔ اس طرح کے اقوال بیشمار ہیں۔ لیکن ان اقوال میں خوش خلقی کی حقیقت کے بجائے اس کے ثمرات مذکور ہیں' ثمرات میں بھی مخصوص ثمرات کا ذکر ہے۔ ان اقوال کے ذکر کے بجائے ہم خوش خلقی کی حقیقت بیان کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔

خوش خلقی کی حقیقت : یہاں دو لفظ ہیں خَلق اور خُلق۔ اور دونوں لفظ یکجا بھی استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص خَلق بھی ہے اور خوش خُلق بھی۔ یعنی اس کی صورت بھی اچھی ہے اور سیرت بھی وہ ظاہری حسن بھی رکھتا ہے اور باطنی حسن سے بھی آراستہ ہے۔ اس طرح کی عبارت میں خَلق سے مراد ظاہری صورت ہے اور خُلق سے مراد باطنی صورت ہے اور یہ اس لیے کہ انسان جسم و روح سے مرکّب ہے' جسم کا مشاہدہ آنکھ سے ہوتا ہے' اور روح کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہے جسم و روح دونوں ہی کی ایک ہیئت اور صورت ہے' یہ صورت بُری بھی ہوتی ہے اور اچھی بھی۔ بصیرت کے ذریعہ ادراک کی جانے والی روح آنکھ کے ذریعہ ادراک کئے جانے والے جسم کے مقابلے میں افضل اور اعلیٰ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی روح کی نسبت اپنی طرف کرکے اس کی عظمت کا اظہار فرمایا۔ ارشاد ہے:۔

اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (پ ۱۴ ر ۳ آیت ۲۸-۲۹)

میں ایک بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے سے بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں سو جب میں اس کو بنا چکوں اور اس میں اپنی طرف سے جان ڈال دوں تو تم سب اس کے رُوبرو سجدہ میں گر پڑنا۔

اس آیت میں جسم مٹی کی طرف اور روح باری تعالیٰ کی طرف منسوب ہے۔ یہاں روح اور نفس دونوں سے ایک ہی چیز مراد ہے' اگر ہم کہیں روح کے بجائے نفس کا لفظ استعمال کریں تو اس سے مغالطہ نہ ہونا چاہیے۔ اب خلق کی تعریف سنئے' خلق نفس میں ایک ایسی راسخ ہیئت کا نام ہے جس سے افعال بآسانی صادر ہوں' اگر اس ہیئت سے صادر ہونے والے افعال شرعاً اور عقلاً عمدہ ہوں تو اسے خوش خلقی کہا جائے گا اور بُرے ہوں تو بد خلقی نام ہوگا۔

اس تعریف میں راسخ ہیئت کی قید اس لیے لگائی گئی کہ مثلاً اگر کوئی بعض نادار حالات میں بہت سا مال خرچ کردے تو اسے سخاوت پیشہ نہیں کہا جائے گا جب تک سخاوت کی صفت اس کے نفس میں ثابت و راسخ نہ ہو' افعال کے بآسانی اور کسی تکلّف کے بغیر صدور کی قید اس لیے لگائی گئی کہ مال خرچ کرنے میں تکلّف کرنا' سخاوت اور تکلّف اور جدّوجہد کے ذریعہ غصہ پر قابو پانا حِلم نہیں ہے' کیوں کہ خلق وہ ہے جو کسی تکلّف کے بغیر ظاہر ہو۔

یہاں چار امور ہیں' اوّل فعل کا اچھا یا بُرا ہونا' دوم فعل کی اچھائی یا بُرائی پر قادر ہوں' سوم ان کی معرفت حاصل ہونا' چہارم نفس میں ایسی ہیئت کا موجود ہونا جو حُسن و قبح میں سے کسی ایک کی طرف مائل ہوسکے اور اس پر ان دونوں میں سے ایک آسان

ہو جائے خلق فعل کا نام نہیں ہے' بہت سے لوگوں کے مزاج میں سخاوت ہوتی ہے لیکن وہ خرچ نہیں کرپاتے کبھی اس لیے کہ ان کے پاس مال نہیں ہوتا اور کبھی کسی دوسرے مانع کی وجہ سے' دوسرا شخص فی الحقیقت بخیل ہوتا ہے لیکن ریا و ناموری کے لیے یا کسی دوسری ضرورت سے مجبور ہو کر خرچ کرتا ہے' خلق جس طرح فعل کا نام نہیں اس طرح فعل پر قدرت اور قوت کا نام بھی نہیں' کیوں کہ آدمی دینے یا نہ دینے یعنی سخاوت و بخل بلکہ تمام اضداد پر یکساں قوت رکھتا ہے' اور ہر انسان کو فطرتاً دینے یا نہ دینے پر قادر پیدا کیا گیا ہے قدرت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس میں خلق سخاوت یا خلق بخل ہو گا۔ اسی طرح خلق معرفت کو بھی نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ حسن و قبح اور تمام اضداد کی معرفت ایک ہی طریقے پر ہوتی ہے' اور سب سے متعلق ہو سکتی ہے' اصل میں خلق چوتھے معنیٰ سے عبارت ہے' یعنی اس ہیئت کا نام ہے جس کے ذریعہ آدمی نفس بخل یا سخا پر مستعد ہوتا ہے۔

<u>حسن باطن کے چار ارکان</u> : جس طرح ظاہری حسن محض آنکھوں کی خوبصورتی کا نام نہیں' بلکہ تمام اعضاء آنکھ' ناک' کان' ہونٹ اور رخسار وغیرہ کی موزونیت کو حسن کہتے ہیں' اور ان تمام کی خوبصورتی سے حسن ظاہر کی تکمیل ہوتی ہے اسی طرح باطنی حسن کے بھی چار ارکان ہیں ان چاروں ارکان میں بھی حسن کا پایا جانا ضروری ہے' یہ سب ارکان معتدل اور موزوں رہیں گے تو آدمی حسن باطن کے اعتبار سے مکمل کہلائے گا۔ وہ چار ارکان ہیں قوتِ علم' قوتِ غضب' قوتِ شہوت اور قوتِ عدل یعنی پہلی تینوں قوتوں کو اعتدال پر رکھنے کی قوت۔

قوت علم کی خوبی اور اس کا حسن یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعہ اقوال میں جھوٹ' سچ' اعتقادات میں حق و باطل' اور افعال میں حسن و قبح میں فرق کرنے پر قادر ہو جائے' جب یہ قوت اس درجے کی ہو جائے گی تو اس کا ثمرہ حکمت کی صورت میں دیا جائے گا' اخلاق کی اصل حکمت ہے' اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (پ ۳ ر ۵ آیت ۲۶۹)

اور جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔

غضب اور شہوت کی قوتوں کی خوبی یہ ہے کہ یہ دونوں حکمت یعنی عقل و شریعت کے اشاروں پر چلیں اور قوت عدل کا حاصل یہ ہے کہ شہوت و غضب کی قوتوں کو حکمت کے تابع اور پابند کردے عقل ناصح اور مشفق مشیر کی طرح ہے' اور قوت عدل عقل کے مشوروں کو نافذ کرنے والی ہے' غضب وہ قوت ہے جس میں عقل کے اشارات کی تنفیذ مقصود ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے شکاری کتا' اسے تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے' اور تربیت کے بعد اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ شکاری کے اشارے کے بغیر نہ آگے بڑھتا ہے اور نہ پیچھے ہٹتا ہے' شہوت اس گھوڑے کی طرح ہے جس پر سوار ہو کر شکار کیلئے نکلا جاتا ہے' گھوڑا کبھی سدھا سدھایا ہوتا ہے اور کبھی سرکش و اَڑیل ہوتا ہے قوت عدل سے شہوت کو بھی قابو میں رکھا جاتا ہے' ورنہ آدمی شکار کرنے کی بجائے خود شکار ہو جائے۔

جس شخص میں یہ چاروں رکن درجۂ اعتدال پر ہوں گے وہ خوش اخلاق ہو گا' اور جس شخص میں بعض ارکان معتدل اور بعض غیر معتدل ہوں گے وہ معتدل کی بہ نسبت خوش اخلاق کہلائے گا' یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کے چہرے پر آنکھیں خوبصورت ہوں اور باقی اعضاء اچھے نہ ہوں تو اسے آنکھوں کے اعتبار سے حسین کہا جاتا ہے...... اور باقی اعضاء کے اعتبار سے بدصورت قرار دیا جاتا ہے' قوتِ غضب کے حسن اور اعتدال کا نام شجاعت ہے' اور قوتِ شہوت کے اعتدال و حسن کو عِفت کہتے ہیں' قوتِ غضب اگر حدِ اعتدال سے زیادہ ہو گی تو اسے تہور کہا جائے گا' اور کم ہو گی تو اسے بزدلی اور نامردی قرار دیا جائے گا' اسی طرح قوت شہوت کی حدِ اعتدال سے زیادتی شر کہلاتی ہے اور کمی کو جمود کہا جاتا ہے' ان دونوں قوتوں میں اعتدال یعنی شجاعت اور عِفت ہی مطلوب ہیں' طرفین یعنی کمی اور زیادتی مطلوب نہیں ہیں بلکہ مذموم ہیں اور انہیں فضائل کے بجائے رذائل کہا جاتا ہے۔ قوت عدل میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی اس کی ضد ظلم ہے' عدل نہ ہو گا تو ظلم ہو گا۔ قوت علم کا اعتدال حکمت کہلاتا ہے حکمت کو غلط

اغراض میں استعمال کرنا اسے حد اعتدال سے باہر کرنا ہے' اگر یہ استعمال زیادتی کی صورت میں ہے تو اسے خبث اور فریب کہتے ہیں اور کمی کی صورت میں ہے تو بے وقوفی کہتے ہیں۔ علم کا درجۂ اوسط حکمت کہلاتا ہے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ اخلاق کے بنیادی اصول اور ارکان چار ہیں۔ حکمت' شجاعت' عِفّت اور عدل۔

حکمت سے نفس کی وہ حالت مراد ہے جس سے آدمی تمام اختیاری افعال میں صحیح کو غلط سے ممتاز کرلے' اور عدل سے نفس کی وہ حالت اور قوت مراد ہے جس کے ذریعہ وہ غضب اور شہوت پر حکومت کرے اور انہیں حکمت کے تابع بنائے' شجاعت سے مراد یہ ہے کہ غضب کی قوت عقل کی تابع اور مطیع ہو' اور اس کی مرضی کے بغیر نہ اقدام کرتی ہو اور نہ اعراض۔ عِفّت سے مراد وہ قوت ہے جس کے ذریعہ شہوت کو عقل و شرع کے پابند بنایا جاسکے۔ تمام اچھے اخلاق کا منبع اور سرچشمہ یہی چاروں اصول ہیں مثلاً قوت عقل کے اعتدال سے یہ محاسن پیدا ہوتے ہیں حسنِ تدبیر' جُودتِ ذہن' اِصابتِ رائے' نفس کے مخفی آفات اور اعمال کی باریکیوں پر اِنتباہ۔ اس قوت کی زیادتی سے خبث' مکر' فریب' اور چالاکی پیدا ہوتی ہے' اور کمی سے ناتجربہ کاری' بے وقوفی' حماقت' بے شعوری' اور جنون جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ناتجربہ کاری سے مراد یہ ہے کہ تخیّل کی سلامتی کے باوجود تجربہ نہ ہو جیسے بعض آدمی ایک امر میں تجربہ کار ہوتے ہیں' اور دوسرے میں انہیں کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ حماقت اور جنون میں یہ فرق ہے کہ احمق کا مقصد تو صحیح ہوتا ہے لیکن اسے اپنے مقصد تک پہنچنے کا راستہ معلوم نہیں ہوتا' جنون یہ ہے کہ جو چیز اختیار کے قابل نہ ہو اسے اختیار کرے' اس کا اختیار سرے سے فاسد ہوتا ہے' شجاعت کے اعتدال سے یہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں کرم' دلیری' شہامت' کسرِ نفسی' حلم' استقامت' غصہ پینا' وقار' اور سنجیدگی وغیرہ۔ اس قوت کا نام تہور ہے' اور کمی سے اہانت' ذلت' خوف' خساست' احساس کمتری اور کم حوصلگی۔ عِفّت کے اعتدال سے سخاوت' حیاء' صبر' چشم پوشی' قناعت' تقویٰ' لطافت' بلند حوصلگی' وسعت ظرفی' اور قلتِ طمع جیسے فضائل اخلاق حاصل ہوتے ہیں' اس خلق کا اعتدال کی حدود سے تجاوز کرنا حرص' طمع' بے شرمی' خباثت' اِسراف' ریا' اہانت' لغوگوئی' تملّق' خوشامد' حسد' مالداروں میں ذلت اور فقیروں کو حقیر سمجھنے کا مرض وغیرہ جیسے رذائل کا باعث بنتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ محاسن اخلاق کے چار اصول ہیں حکمت' شجاعت' عِفّت اور عدالت' باقی اخلاق ان ہی چاروں اصولوں کی فروع ہیں۔ ان چاروں اصولوں میں کمالِ اعتدال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کو نصیب نہیں ہوا' بعد کے لوگوں میں تفاوت ہے' جو شخص ان اخلاق میں آپ سے جس قدر قریب ہے وہ اللہ تعالیٰ سے اسی قدر قریب ہے اور جو بعید ہے وہ خداوند قدوس سے اسی قدر بعید ہے۔ جو شخص ان تمام اخلاق کا جامع ہے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ لوگ اس کی اطاعت کریں' اس کی طرف رجوع کریں اور تمام افعال میں اس کی اقتدا کریں اور جو شخص ان اخلاق سے محروم ہو بلکہ ان کی اضداد کا جامع ہو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسے شہر بدر کردیا جائے اور لوگ اس سے قطع تعلق کرلیں' کیوں کہ وہ انسان نہیں شیطان کا نمائندہ ہے' جس طرح شیطان سے دُوری اختیار کی جاتی ہے اسی طرح اس سے بھی دُور رہنا چاہیے جس طرح جامع اخلاق شخص ملکوتی صفات سے اپنی قرابت کی بناء پر اقتدار اور اطاعت کا مستحق ہوتا ہے اسی طرح یہ شخص شیطانی اوصاف سے اپنی وابستگی کی بنا پر لعنت اور اعراض کا مستحق ہوتا ہے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوئے ہیں' جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے' یہ اخلاق وہ ہیں جنہیں قرآن کریم نے مؤمنین کے اوصاف میں ذکر کیا ہے' ارشاد ہے:۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (پ ۲۶ ر ۱۴ آیت ۱۵)

پورے مؤمن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک نہیں کیا اور اپنے مال اور جان سے خدا کے راستے میں محنت اٹھائی یہ لوگ ہیں سچے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر کسی تردّد کے بغیر ایمان لانا یقین کی قوت کا عمل ہے اور قوت یقین ثمرِ عقل اور منتہائے

حکمت ہے۔ مال کے ذریعہ مجاہدہ کرنا سخاوت ہے' اور یہ مجاہدہ شہوت کو قابو میں رکھنے سے ہوتا ہے' اور نفس کے ذریعہ مجاہدہ کرنا شجاعت ہے' یہ مجاہدہ عقل کی شرط کے مطابق اور اعتدال کی حدود کے اندر رہ کر قوتِ غضب کے استعمال سے ہوتا ہے' صحابہؓ کی تعریف میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (پ ۲۶ ر ۱۲ آیت ۲۹)

وہ کافروں کے مقابلے میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شِدّت اور رحمت کے الگ الگ مقامات ہیں نہ ہر حال میں شدّت کمال ہے اور نہ رحمت قابلِ تعریف۔

ریاضت سے اخلاق میں تغیّر

جو لوگ اعتقاد کی گمراہی کا شکار ہیں وہ ریاضت اور مجاہدے کو شاق سمجھتے ہیں' انہیں یہ گوارہ نہیں کہ وہ نفس کے تزکیہ و تطہیر اور اخلاق کی تہذیب و تعمیر میں مشغول ہوں وہ اپنے اخلاق کے فساد کو اپنے قصور' نقص اور خبث پر' محمول نہیں کرتے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اخلاق جیسے پیدا ہوئے ہیں ایسے ہی رہتے ہیں ان میں تغیّر ممکن ہی نہیں ہے کیوں کہ فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس دعوئی کی انہوں نے دو دلیلیں پیش کی ہیں' ایک یہ کہ خلق باطنی صورت کا نام ہے' اور خلق ظاہری صورت کو کہتے ہیں' اور ظاہری صورت میں تبدیلی ممکن نہیں ہے' مثلاً کوئی پست قد اپنا قد نہیں بڑھا سکتا' نہ طویلُ القامت اپنا قد چھوٹا کر سکتا ہے نہ بدصورت خوبصورت ہو سکتا ہے نہ خوبصورت بدصورت۔ باطنی صورت کو ظاہری صورت پر قیاس کرنا چاہیے' دوسری دلیل یہ ہے کہ حسن خلق سے شہوت اور غضب کا استیصال مراد ہے' لیکن ہم نے تجربہ و آزمائش کے بعد یہ بات معلوم کی ہے کہ شہوت و غضب انسانی فطرت کا مقتضیٰ ہیں' ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا' ان کے درپے ہونا لاحاصل تگ ودو کرنا ہے اور اپنی عمر کو بے فائدہ کاموں میں ضائع کرنا ہے کیونکہ تزکیۂ نفس کا مقصد یہ ہے کہ قلب فانی لذّتوں کی طرف ملتفت نہ رہے اور ایسا ہونا محال ہے۔ ذیل میں ہم ان دونوں دلیلوں کا جواب عرض کرتے ہیں۔

<u>پہلی دلیل کا جواب</u> : یہ ہے کہ اگر اخلاق میں تغیّر ممکن نہ ہوتا تو نہ وعظ و نصیحت اور تادیب و تعلیم کی ضرورت تھی' اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرامؓ سے یہ ارشاد فرماتے حسنوا اخلاقکم (اپنے اخلاق اچھے بناؤ(۱)) اخلاق کا تغیّر آدمیوں ہی کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ جانوروں کے اخلاق بھی بدل جاتے ہیں' باز کو دیکھو کہ وہ وحشی ہونے کے باوجود کس طرح انسان کے ساتھ مانوس ہو جاتا ہے' شکاری کتّا تعلیم کے بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں شکار کے پیچھے دوڑے' اسے پکڑے اور کھائے بغیر آقا کو پیش کرے' اسی طرح سرکش گھوڑا سُدھانے سے مطیع بن جاتا ہے' کیا یہ سب اخلاق میں تغیّر کے نمونے نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ موجودات کی دو قسمیں ہیں' کامل اور ناقص۔ کامل موجودات وہ ہیں جو اپنے وجود کے اعتبار سے مکمل ہیں نہ ان میں کمی ممکن ہے اور نہ زیادتی' ان میں کمی یا زیادتی کا اختیار آدمی کو حاصل نہیں ہے جیسے آسمان' ستارے' جسم کے ظاہری اور اندرونی اعضاء' حیوانات کے اجزاء وغیرہ۔ ناقص موجودات وہ ہیں کہ ابھی ان کا وجود نامکمل ہے' یہ چیزیں مکمل ہو سکتی ہیں بشرطیکہ ان میں کمال کی شرائط موجود ہوں جیسے کھجور کی گٹھلی نہ پھل ہے اور نہ درخت لیکن اس کی ساخت ایسی ہے کہ اگر اسے بو دیا جائے اور اس کی خدمت کی جائے (یعنی پانی دیا جائے) تو یہ گٹھلی درخت بن سکتی ہے۔ کیوں کہ اس میں درخت بننے کی صلاحیت موجود ہے' لیکن اگر کوئی اس گٹھلی کو براہِ راست پھل بنانا چاہے تو یہ ممکن نہیں کیونکہ اس میں پھل بننے کی صلاحیت نہیں ہے' جب گٹھلی کا حال یہ ہے کہ وہ بندے کے اختیار سے متأثر ہوتی ہے اور ایک حال سے دوسرے

---

(۱) ابوبکر بن لال فی مکارم الاخلاق عن روایۃ معاذ بلفظ "یا معاذ حسن خلقک للناس"

حال میں بدل جاتی ہے تو غضب اور شہوت کی قوتیں کیوں متغیر نہیں ہوسکتیں' ہاں ان قوتوں کو بالکل ہی ختم کردینا ہمارے اختیار میں نہیں ہے' ہم ریاضت اور مجاہدے کے ذریعہ ان قوتوں کو اپنے قابو میں تو کرسکتے ہیں لیکن انہیں ختم نہیں کرسکتے' ہمیں اسی کا حکم دیا گیا ہے' اور یہی ہماری اُخروی نجات کا سبب اور وُصول اِلی اللہ کا ذریعہ ہے البتہ طبائع مختلف ہیں' بعض طبیعتیں تغیر کو جلد قبول کرلیتی ہیں' اور بعض دیر سے قبول کرتی ہیں' طبائع کے اختلاف کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چیز جس کا تغیر مقصود ہو طبیعت میں انتہائی راسخ ہو یعنی اس چیز کے وجود کی مدت اتنی ہی ہو جتنی آدمی کے وجود کی۔ شہوت' غضب' اور تکبر ہر خلق کا تغیر ممکن ہے' لیکن سب سے زیادہ مشکل شہوت کا بدلنا ہے' کیونکہ یہ پیدائش سے ساتھ ہوتی ہے' چنانچہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی خواہش سے محروم نہیں ہوتے' غصّہ عام طور پر سات سال کی عمر میں پیدا ہوتا ہے' اس کے بعد قوّت تمیز پیدا ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ خلق عمل کی کثرت اس کے مقتضٰی کی مسلسل اطاعت اور اسے اچھا سمجھنے کی وجہ سے عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔

انسان کے چار مراتب : اس سلسلے میں انسان کے چار مراتب ہیں' پہلا مرتبہ یہ ہے کہ آدمی جس حالت میں پیدا ہوا ہے اسی حالت میں رہے' حق و باطل' اور اچھے بُرے میں تمیز نہ کرسکے' بلکہ اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے ہر طرح کے اعتقادات سے خالی ہو' اس شخص کا علاج سہل ہے' اور وہ بہت جلد تندرست ہوسکتا ہے' اس مریض کو صرف ایک استاذ ایک مُرشد اور ایک اندرونی محرّک کی ضرورت ہے' تاکہ وہ محرّک اسے مجاہدے کی تحریک دیتا رہے۔ اس کے اخلاق بہت جلد اچھے ہوسکتے ہیں۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ آدمی بُرائی کو برائی سمجھتا ہو لیکن نیک عمل کو خوگر نہ ہو' بلکہ شیطان نے اسے عملِ بد میں اُلجھا رکھا ہو' وہ اپنی شہوات کا تابع ہو اور راہِ حق سے منحرف ہونے کے باوجود اپنے عمل کے قصور سے واقف ہو' ایسے شخص کی اصلاح پہلے کی بہ نسبت زیادہ سخت ہے کیوں کہ اس کی اصلاح کے دو مرحلے ہوں گے ایک یہ کہ اس کی بُری عادت چھڑائی جائے دوسرا یہ کہ اسے اچھے کام کا عادی بنایا جائے' اس کی اصلاح ہوسکتی ہے بشرطیکہ وہ ریاضت اور مجاہدے کے لیے پوری طرح مُستعِد ہو۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اخلاقِ رذیلہ کو اچھا سمجھتا ہو' اور اعمال بد اس کے نزدیک وجوب کا درجہ رکھتے ہوں' ان ہی اخلاق و اعمال پر اس کی پرورش بھی ہوئی ہو ایسے شخص کا علاج محال کے درجے میں ہے اس کی اصلاح کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی' کیونکہ گمراہی کا ایک سبب ہو تو دور بھی ہوجائے یہاں تو اسباب کا ہجوم ہے کون کون سا سبب دور کیا جائے گا۔ چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ وہ خود بھی برائی میں مبتلا ہو' اور دوسروں کو بھی اپنا جیسا دیکھنا چاہتا ہو' اور انہیں تباہ و برباد کرنے میں فخر سمجھتا ہو' یہ شخص انتہائی سخت درجے پر ہے' اور اس کی گمراہی تہہ بہ تہہ ہے اس کی اصلاح ناممکن اور محال ہے۔

ان چاروں میں پہلا شخص محض جاہل ہے' دوسرا جاہل اور گمراہ ہے' تیسرا جاہل' گمراہ اور فاسق ہے' چوتھا جاہل' گمراہ' فاسق اور فتنہ پروَر ہے۔

دوسری دلیل کا جواب : منکرین کا یہ کہنا کہ ریاضت سے شہوت اور غضب کی قوتوں کا استیصال مقصود ہے جب کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ان قوتوں کا استیصال یا خاتمہ ہرگز مقصود نہیں ہے' بلکہ شہوت کی تخلیق فائدے کے لیے ہوئی ہے' آدمی میں اس کا موجود رہنا بھی ضروری ہے' چنانچہ اگر کسی شخص میں کھانے کی شہوت نہ رہے تو وہ ہلاک ہوجائے' جماع کی شہوت باقی نہ رہے تو نسل انسانی کا سلسلہ منقطع ہوجائے' اسی طرح اگر غضب کا وجود ختم ہوجائے تو آدمی مہلک چیزوں سے اپنا دفاع نہ کرسکے اور ہلاک ہوجائے' ان قوتوں کو نیست و نابود کرنا مقصد نہیں ہے' بلکہ انہیں افراط و تفریط سے بچا کر درجہ اعتدال پر لانا مقصود ہے۔ مثلاً غضب میں یہ مقصود ہے کہ آدمی میں نہ تہور ہو اور نہ بزدلی بلکہ اس کے غضب کی قوت عقل کی پابند ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (پ ۲۶ ر ۱۲ آیت ۲۹)

وہ کافروں کے مقابلے مین تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔

اس میں صحابہ کا وصف شدّت بیان کیا گیا ہے' شدّت غضب ہی سے پیدا ہوتی ہے' اگر غضب کی قوت نہ ہوتی تو نہ شدّت کا وجود ہوتا اور نہ جہاد ہوتا۔ غضب اور شہوت کی قوتوں کو یکسر کس طرح ختم کیا جاسکتا ہے جب کہ انبیاء علیہم السلام بھی ان سے خالی نہیں ہیں۔ چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

انما انا بشر اغضب کما یغضب البشر (مسلم۔ انس)

میں انسان ہی ہوں انسان کی طرح غصہ کرتا ہوں۔

روایات میں ہے کہ جب کوئی بات آپ کی مرضی کے خلاف پیش آتی تو غضب کی شدّت سے آپ کے رُخسار مبارک سرخ ہوجاتے لیکن اس حالت میں بھی آپ حق بات ہی فرماتے غصہ آپ کو حق گوئی سے نہیں ہٹاتا تھا (بخاری و مسلم۔ عبداللہ بن الزبیرؓ) باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ (پ ۴ ر ۵ آیت ۱۳۴)

اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے۔

اس آیت میں ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو غصہ پی لیتے ہیں' یہ نہیں فرمایا کہ ان میں غصہ نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ غضب اور شہوت کا بالکلیہ ختم ہونا غیر فطری چیز ہے اور یہ شریعت کو مطلوب نہیں ہے شریعت کو مطلوب یہ ہے کہ یہ دونوں قوتیں اعتدال کے اس درجے پر آجائیں کہ عقل کو ان پر غلبہ اور تفوّق حاصل رہے' نہ یہ کہ دونوں عقل پر غالب آجائیں' تبدیل خلق کا حاصل یہی ہے۔ بعض اوقات انسان پر شہوت اتنی شدت کے ساتھ حملہ آور ہوتی ہے کہ عقل اس کے دفع کرنے پر قادر نہیں رہتی تاہم ریاضت کے ذریعہ اس کا حدِ اعتدال پر آجانا ممکن ہے' امتحان اور تجربے سے یہ بات پوری طرح ثابت ہوجاتی ہے' اور اس میں کسی طرح کا کوئی ابہام یا شک باقی نہیں رہتا۔ اس امر پر کہ اخلاق میں افراط و تفریط کے بجائے اعتدال مطلوب ہے قرآن پاک کی یہ آیت دلیل ہے:۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا (پ ۱۹ ر ۴ آیت ۶۷)

اور وہ جب خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ کرنا اعتدال پر رہتا ہے۔

اس آیت میں سخاوت کی طرف اشارہ ہے جو اسراف اور بخل کا درمیانی درجہ ہے' نیز فرمایا:۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ (پ ۱۵ ر ۳ آیت ۲۹)

اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لینا چاہئے اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہئے۔

شہوت طعام میں بھی اعتدال پر زور دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (پ ۸ ر ۱۰ آیت ۳۱)

اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے مت نکلو بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا حد سے نکلنے والوں کو۔

غضب کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (پ ۲۶ ر ۱۲ آیت ۲۹)

وہ کافروں کے مقابلے میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔

حدیث شریف میں ہے:۔

(بیہقی۔ مطرف بن عبداللہؓ)

بہترین اُمور درمیانی اُمور ہیں۔

اوسط درجے کے پسندیدہ و مطلوب ہونے کے پس پردہ ایک راز ہے۔ اور اس راز کی تحقیق یہ ہے کہ سعادتِ اُخروی کا مدار اس پر ہے کہ قلب دنیا کے عوارض سے پاک ہو جیسا کہ باریِ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (پ ۱۹ ر ۹ آیت ۸۹)

مگر ہاں (اس کی نجات ہوگی) جو اللہ کے پاس (کفر سے) پاک دل لے کر آئے گا۔

بخل اور اسراف دونوں کا تعلق دنیاوی عوارض سے ہے' دل کا ان دونوں عوارض سے خالی ہونا ضروری ہے' یعنی نہ وہ مال کے جمع و احتکار کی طرف مائل ہو اور نہ اس کو خرچ کرنے کا حریص ہو' کیونکہ جسے خرچ کرنے کا حرص ہو گا اس کا دل اسی طرف لگا رہے گا کہ کہیں سے مال آئے اور وہ خرچ کرے' جب کہ بخیل کی ساری توجہ اِمساک (مال کو روکنے پر) ہوگی۔ قلب کی سلامتی یہ ہے کہ وہ ان دونوں چیزوں سے خالی ہو' اور کیوں کہ رفع نقیضین ممکن نہیں ہے اس لیے ہم نے وہ حالت تلاش کی جس میں یہ دونوں وصف نہ ہوں اور وہ حالت درجہ اعتدال کی ہے درجۂ اعتدال میں یہ دونوں وصف ہو موجود نہیں ہیں چنانچہ گرم پانی کی حرارت نکل جائے اور وہ ٹھنڈا بھی نہ ہونے پائے تو اس پانی کو نہ گرم کہتے ہیں اور نہ ٹھنڈا کہتے ہیں بلکہ گنگنا کہتے ہیں یہی سخاوت اسراف اور بخل کا درمیانی درجہ ہے' شجاعت تہور اور نامردی کے درمیان کی صفت ہے' عِفّت' حرص اور جمود کی درمیانی کیفیت کا نام ہے' باقی تمام اخلاق کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہئے' ہر خلق میں افراط و تفریط مذموم ہے اور اعتدال مقصود ہے۔ البتہ استاذ اور مُرشد کو چاہئے کہ وہ اپنے شاگرد و مرید کے سامنے غضب اور بخل کی بُرائی کرتے رہیں اور اس سلسلے میں کسی طرح کی رخصت نہ دیں' کیوں کہ اگر انہوں نے تھوڑے کی اجازت دی تو وہ زیادہ کے لیے کوئی عُذر تلاش کرلیں گے' البتہ اگر کم کی اجازت بھی نہ دے تو یہ ممکن ہے کہ وہ کم پر قناعت کرلیں اور زیادہ پر مائل نہ ہوں اس طرح اعتدال کا درجہ حاصل ہو گا۔ کم کی اجازت زیادہ کے لیے بہانہ بن جائے گی اسی لیے شاگرد اور مرید سے یہی کہا جاتا رہے کہ وہ ان قوتوں کو بالکل نہ رہنے دیں' انہیں سرے سے ختم کردیں' یہ راز لکھنے کا نہیں تھا کیوں کہ کم عقل لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا غضب بھی حق ہے اور بخل بھی حق ہے۔

حسنِ خلق کے حصول کا سبب

یہ بات آپ اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ حسن خلق کا حاصل یہ ہے کہ قوت عقل معتدل ہو حکمت کامل ہو شہوت اور غضب کی قوتیں اعتدال کے ساتھ شریعت و عقل کے تابع اور مطیع ہوں یہ اعتدال دو وجہوں سے حاصل ہوتا ہے پہلی وجہ یہ ہے کہ آدمی پر خدا کا فضل و کرم ہو' اور وہ اپنی پیدائش کے روزِ اوّل ہی سے خوش خلق اور کاملُ العقل ہو' شہوت و غضب اس پر غالب نہ ہوں بلکہ یہ دونوں عقل و شرع کی پابند ہوں۔ ایسے شخص کو عالم بننے کے لیے ظاہری تعلیم کی اور مؤدب بننے کے لیے ظاہری تادیب کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ فطری عالم اور مؤدب ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام' حضرت یحییٰ علیہ السلام' خاتم الانبیاء سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام تھے۔ اور یہ امر کچھ بعید نہیں ہے کہ آدمی کی طبع اور فطرت میں وہ بات موجود ہو جو اکتساب سے حاصل ہوتی ہے بہت سے بچے شروع ہی سے سچے' جرأت مند' اور سخاوت پیشہ ہوتے ہیں' بعض بچے روزِ اوّل ہی سے جھوٹے' مکّار' بزدل اور کنجوس ہوتے ہیں' مگر ان میں یہ اوصاف بعض اوقات ان اوصاف کے حامل لوگوں سے اختلاط رکھنے کی بنا پر' اور بعض اوقات سیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان اخلاق کو مجاہدے اور ریاضت سے حاصل کرے یعنی نفس سے وہ کام لے جن سے مطلوبہ خلق حاصل ہو جائے مثلاً جو شخص سخاوت اختیار کرنا چاہتا ہے اسے سخاوت پیشہ لوگوں کی تقلید کرنی چاہئے اور ان کے طریقے پر مال خرچ کرنا چاہئے' خواہ اس کے لیے نفس پر صبر کرنا پڑے' اور یہ

سلسلہ اس وقت تک جاری رہنا چاہئے جب تک کہ نفس اس کا عادی نہ ہو جائے' اور سخاوت طبیعت نہ بن جائے۔ اسی طرح جس شخص پر کبر غالب ہو اور وہ متواضع بننا چاہتا ہو اسے متواضع لوگوں کے افعال کی پابندی کرنی چاہئے' اور اس سلسلے میں اس وقت تک مجاہدہ کرنا چاہئے اور نفس کے تواضع پر مائل کرنا چاہئے جب تک کہ یہ صفت عادت نہ بن جائے اور تواضع اس کے نفس پر سہل نہ ہو جائے' تمام اخلاق محمودہ کے حصول کا یہی طریقہ ہے۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ متعلقہ خلق آدمی کی طبیعت بن جائے اور اس میں لذّت محسوس ہونے لگے' مثلاً سخی اس شخص کو کہا جائے گا جو مال خرچ کرے اور اس میں اسے لذّت ملے' اگر خرچ کرتا ہو' اور لذّت کے بجائے تکلیف ہوتی ہو تو اسے سخی نہیں کہیں گے' اسی طرح متواضع وہ شخص کہلائے گا جسے تواضع میں مزہ ملے۔ دینی اخلاق نفس میں اس وقت تک راسخ نہیں ہوتے جب تک کہ نفس تمام اعمالِ بد سے نفرت نہ کرنے لگے' اور ان سے تکلیف محسوس نہ کرنے لگے' اور تمام اچھے اعمال کا عادی نہ بن جائے' اور ان کی پورے شوق و رغبت کے ساتھ پابندی نہ کرنے لگے' حدیث شریف میں ہے:۔

جعلت قرة عيني في الصلاة (نسائی۔ انسؓ)

میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

نماز میں آپ نے آنکھوں کی ٹھنڈک اسی لیے محسوس کی کہ یہ نیکی آپ کی عادت بن گئی تھی' جب تک نفس عبادت میں مشقت اور ممنوعات کے ترک میں دشواری محسوس کرتا رہے گا تب تک نقصان باقی رہے گا' اور سعادت کا کمال حاصل نہ ہوگا۔ البتہ مشقّت اور تکلیف کے احساس کے ساتھ اعمالِ حسنہ کی مواظبت' عدم مواظبت سے بہتر ہے مگر رغبت کے ساتھ نیک عمل کرنے سے بہتر نہیں ہے' ارشادِ باری ہے:۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ (پ ا ر ۵ آیت ۴۵)

اور بے شک نماز دشوار ضرور ہے لیکن جن کے دل میں خشوع ہے ان پر دشوار نہیں ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

اعبد اللّٰہ فی الرضاء فان لم تستطع ففی الصبر علی ما تکرہ خیر اکثیرا (طبرانی کبیر)

اللہ کی عبادت رضا کی حالت میں کر' اگر یہ ممکن نہ ہو تو جو چیز تجھے ناپسند ہو اس پر صبر کرنے میں بڑا خیر ہے۔

پھر سعادت کا یہ کمال نہیں ہے کہ کبھی فعل رضا و رغبت سے ہو' اور اس میں لذّت ملے' اور کبھی اس کے برعکس ہو' بلکہ ہر لمحہ اور ہر آن ایک ہی حالت رہنی چاہئے' بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ شوق و رغبت اور اُنس و رضا میں زیادتی ہونی چاہئے' سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی شخص نے سعادت کے متعلق دریافت کیا' آپ نے فرمایا:۔

طول العمر فی طاعة اللّٰہ (ابو منصور دیلمی۔ ابن عمرؓ)

خدا کی اطاعت میں عمر کا طویل ہونا۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ موت کو ناپسند کرتے تھے' کیونکہ الدنیا مزرعة الآخرة (دنیا آخرت کی کھیتی) ہے' جس قدر عمر ہوگی اسی قدر عبادات ہوں گی' اور اسی نسبت سے اجر و ثواب بھی زیادہ ہوگا' نفس طاہر سے اَطہر بنے گا' اخلاق قَوی سے قَوی تر' اور حسن سے اَحسن بنیں گے' علاوہ اَزیں عبادات کا مقصد یہ ہے کہ قلب پر ان کا اثر ہو' اور قلب پر اثر اسی وقت ہوتا ہے جب عبادات پر مُواظبت اور مُداومت ہو۔

ان اخلاق کا مقصد یہ ہے کہ دل میں دنیا کی محبت باقی نہ رہے' اور اللہ کی محبت راسخ ہو جائے' اللہ کی ملاقات کے علاوہ کوئی چیز اسے محبوب نہ ہو' وہ اپنا تمام مال اسی طریقے پر خرچ کرے جس طریقے سے اللہ تک پہنچا جا سکتا ہو' غضب اور شہوت دونوں انسان

کے لیے مسخر ہیں، ان دونوں قوتوں کو شریعت کے بتلائے ہوئے طریقے پر استعمال کرے، اور انہیں بھی وُصول اِلی اللہ کا ذریعہ بنائے۔ پھر اس طرح کے کاموں سے خوش ہو، اور لذت پائے۔ اگر کسی کو نماز میں راحت ملتی ہو یا آنکھوں کی ٹھنڈک میسّر ہو یا عبادات اچھی معلوم ہوتی ہوں تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے، عادت نفس کے اندر اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب چیزوں کے ظہور کا باعث بن سکتی ہے، ہم شاہوں اور خوش حال لوگوں کو ہمیشہ غم و کرب میں مبتلا پاتے ہیں، دوسری طرف مفلس جواری کو دیکھئے وہ ہار کر بھی خوش ہوتا ہے اور مزہ پاتا ہے حالانکہ جس حال میں وہ ہے اگر دوسرے بھی اسی میں مبتلا ہو جائیں تو بے قمار زندگی ہی دو بھر ہو جائے، قمار (جُوئے) سے مال ختم ہوتا ہے، گھر تباہ و برباد ہوتا ہے، زندگی کی آسائشیں چھنتی ہیں حاکمانِ وقت کی بازپُرس کا خوف تلوار کی طرح لٹکا رہتا ہے، پھر بھی اس کا چسکا ختم نہیں ہوتا، کیوں کہ کھیلتے کھیلتے وہ قمار کا عادی بن جاتا ہے اور کوشش کے باوجود وہ اسے چھوڑ نہیں پاتا۔ کبوتر باز بھی اپنے کھیل کا اتنا دلدادہ ہے کہ دن بھر دھوپ میں کھڑا رہتا ہے، دھوپ کی شدت اسے محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ کبوتروں سے اسے عشق ہے، خلاؤں میں ان کی اُڑان سے اسے دلچسپی ہے، اور بازی لگانا اس کا محبوب مشغلہ ہے یہی حال ان بد طینت لوگوں کا ہے جن پر رات دن کوڑے برستے ہیں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں انتہائی ہولناک سزائیں دی جاتی ہیں، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے لیکن وہ اپنی حرکات سے باز نہیں آتے، وہ اپنے مشاغل کو قابلِ فخر سمجھتے ہیں، اور تمام سزائیں ہنسی خوشی برداشت کرتے ہیں حد یہ ہے کہ اگر چوروں کو قتل بھی کر دیا جائے تو وہ مسروقہ مال کا پتا نہ دیں اور اپنے ساتھیوں کی نشاندہی نہ کریں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے کام کو کمال اور تہور کو شجاعت سمجھتے ہیں اور ان مشغلوں کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ ان کے لیے سزائیں سہنے سے بھی گریز نہیں کرتے، یہ سزائیں ان کے لیے سامان راحت ہیں۔ بد ترین حال ان مخنثوں کا ہے جو عورتوں کی صورت بنا لیتے ہیں، اور اپنی اس مذموم حرکت پر فخر کرتے ہیں ہر شخص اپنے اپنے حال میں مست اپنے اپنے پیشے پر نازاں ہے، خواہ وہ مُلوک و سَلاطین ہوں، یا کنجر اور حجام۔ یہ سب امور عادت اور ایک ہی کام پر مسلسل مواظبت کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں، اور جب اپنے ہم مذاق اور ہم مشرب لوگوں میں بھی ان کا مشاہدہ ہوتا ہے تو یہ امور نفس میں اور زیادہ راسخ ہو جاتے ہیں بہر حال جب نفس انسان باطل سے تلذّذ حاصل کر سکتا ہے اور بُرائیوں کی طرف مائل ہو سکتا ہے تو حق سے لطف کیوں نہیں اٹھا سکتا، اور اچھائیوں کی طرف کیوں نہیں مائل ہو سکتا بلکہ رذائل کی طرف میلان طبعی نہیں ہوتا، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مٹی کھانے کی رغبت رکھتا ہو، کیا اس رغبت کو فطری کہا جا سکتا ہے۔ کسی شخص کا حکمت، اللہ کی محبت، معرفت اور عبادت کی طرف مائل ہونا ایسا ہے جیسے کوئی کھانے پینے کی طرف مائل ہو، جس طرح کھانے کی رغبت فطری ہے اسی طرح اللہ کی محبت، معرفت اور عبادت کی طرف میلان بھی طبیعت قلب کا مقتضی ہے، کیوں کہ قلب امر ربانی ہے، شہوت کے تقاضوں کی طرف اس کا میلان عارضی تو ہو سکتا ہے دائمی اور فطری نہیں ہو سکتا، قلب کی اصل غذا حکمت، معرفت اور محبتِ الٰہی ہے، اگر عوارض کی وجہ سے وہ طبعی تقاضوں سے منحرف ہو جائے تو یہ ایسا ہے جیسے کسی شخص کے معدے میں خلل ہو جائے اور کھانے کی اِشتہا باقی نہ رہے، حالانکہ کھانا معدے کی غذا ہے، اور اسی پر انسان کی زندگی موقوف ہے۔ اس مثال سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ جو دل غیر اللہ کی طرف جس قدر مائل ہو گا اسی قدر اس میں مرض ہو گا ہاں اگر کسی غیر اللہ سے محبت اللہ کے لیے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، اسے مرض نہیں کہا جائے گا، بلکہ یہ محبت بھی طبعی کہلائے گی۔

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو چکی ہے کہ ریاضت کے ذریعہ اخلاقِ حسنہ کا اکتساب کیا جا سکتا ہے یعنی اگر کوئی شخص اولاً انہیں بتکلف اختیار کرے اور ان کی پابندی رکھے تو آخرالامر یہ اخلاق طبعی اور خلقی ہو جاتے ہیں، قلب اور اعضاء کے مابین یہ عجیب تعلق ہے کہ جو صفت قلب میں پیدا ہوتی ہے اعضاء پر اس کا اثر ضرور پڑتا ہے، اور اعضائے قلب کے اشارے پر حرکت کرنے لگتے ہیں، اسی طرح اعضاء پر جو حرکات طاری ہوتی ہیں قلب ان سے متأثر ہوتا ہے، قلب اور اعضاء کی اَثر پذیری کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

مثلاً کوئی شخص فن کتابت میں مہارت حاصل کرنا چاہے تو اس کا یہ طریقہ ہے کہ وہ مشق کے سلسلے میں ماہرین فن کاتبوں کی تقلید کرے اور جس طرح وہ حروف و الفاظ لکھتے ہیں اسی طرح وہ بھی لکھے' اور عرصۂ دراز تک اس کی مشق جاری رکھے یہاں تک کہ کتابت اس کی عادت بن جائے اور خوبصورت حروف جس طرح بہ تکلّف بنتے تھے اب بلا تکلّف بننے لگیں' اسی طرح اگر کوئی شخص فقیہ بننا چاہے تو اسے فقہاء کی تقلید کرنی چاہئے' یعنی فقہ کے مسائل کا بار بار تکرار و اعادہ کرنا چاہئے تاکہ وہ مسائل اَزبَر ہوجائیں اور دل تک ان کا اثر پہنچے' اور فقیہ النفس ہوجائے اسی طرح سخی' متقی' بردبار اور متواضع بننے کا خواہش مند بھی ان لوگوں کی تقلید کرے جو صحیح معنیٰ میں سخاوت' تقویٰ' حلم اور تواضع کے زیور سے آراستہ ہیں۔ تقلید کی ابتدا تکلّف سے ہوتی ہے' بعد میں زیرِ تقلید افعال عادت بن جاتے ہیں اور طبیعت میں جڑ پکڑ لیتے ہیں' اخلاق کے اکتساب کی یہی تدبیر ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جس طرح فقہ کا طالب علم ایک روز کی چھٹی سے اپنے مقصد میں ناکام نہیں ہوتا اور ایک دن کے مطالعہ و تکرار سے فقیہ نہیں بنتا اسی طرح اعمالِ حسنہ کے ذریعہ قلب کے تزکیہ' تکمیل' اور تحسین کا طالب ایک دن کی عبادت سے یہ مقصد حاصل نہیں کرسکتا اور نہ ایک روز کی معصیت سے اس مقصد کی تکمیل میں رکاوٹ ہوسکتی ہے۔ اکابر کے اس قول کا یہی مطلب ہے کہ ایک گناہِ کبیرہ دائمی بدبختی کا باعث نہیں ہوگا۔ البتہ ایک روز کا تعطّل دوسرے روز کے تعطّل کا سبب بن سکتا ہے۔ اگر یہ سلسلے دراز رہے تو طبیعت میں سُستی پیدا ہوسکتی ہے' اور نفس بے عملی کا عادی بن سکتا ہے' اور یہ سُستی اور بے عملی فقہ سے محرومی کا باعث بن سکتی ہے یہی حال صغیرہ گناہوں کا ہے کہ ایک گناہِ صغیرہ کا اِرتکاب دوسرے صغیرہ گناہ کا سبب ہوتا ہے اور بہت سے صغیرہ گناہ مل کر کبیرہ گناہ بن جاتے ہیں۔ اَلعیاذ باللہ۔ نیز جس طرح ایک رات کے مطالعہ فقہ کا اثر فوری نہیں ہوتا بلکہ بدن کے تدریجی نشو و نما کی طرح آہستہ آہستہ ہوتا ہے اسی طرح ایک رات کی عبادت کا اثر بھی فوری طور پر مرتّب نہیں ہوتا بلکہ بتدریج ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ایک رات یا ایک ساعت بلکہ ایک لمحہ کی مختصر ترین عبادت کو حقیر سمجھیں' اس لیے کہ تھوڑا تھوڑا بہت ہوجاتا ہے کہ بمصداق چند مختصر مختصر عبادتیں طویل عبادت بن جاتی ہیں' کیا عجب ہے کہ مختصر عبادت اپنے اخلاص کی بناء پر طویل عبادت سے فائق اور اجر و ثواب میں زیادہ ہو' بہرحال مختصر عبادت بھی مؤثر ہوتی ہے گو اس کی تاثیر محسوس نہ ہو' تاثیر کے مخفی رہنے یا نہ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ عبادت کی انتہا ثواب ہے' اور وہ ضائع نہیں جاتا۔ اسی پر معصیت کو قیاس کرنا چاہئے۔

بہت سے فقہاء ایک دن کی تعطیل کو حقیر اور غیر مؤثر سمجھتے ہیں۔ ان کی یہ عادت مسلسل تعطیل کا باعث بن سکتی ہے' وہ نفس کو تعطیل کے غیر مؤثر ہونے کا فریب دیتے رہیں گے اور طبیعت کو فقہ سے دور کرتے رہیں گے' یہی حال ان لوگوں کا ہے جو صغیرہ گناہوں کو اہمیت نہیں دیتے اور انہیں حقیر تصوّر کرتے ہیں' اور نفس کو توبہ کا فریب دیتے رہتے ہیں' یہاں تک کہ توبہ کی توفیق نہیں ہوتی اور موت کا آہنی پنجہ انہیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے گناہوں پر اصرار سے دل سیاہ ہوجاتے ہیں' اور توبہ کی توفیق نہیں ہوتی' توبہ کا دروازہ بند ہونے سے یہی مراد ہے' اور یہی اس آیت کے معنیٰ ہیں۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا (پ ۲۲ ر ۱۸ آیت ۹)

اور ہم نے ایک آڑ ان کے سامنے کردی اور ایک آڑ ان کے پیچھے کردی۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ قلب میں ایمان کی ابتدا ایک سفید نقطے سے ہوتی ہے' جتنا ایمان زیادہ ہوتا ہے اس نقطے کی سفیدی اور حجم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ تمام دل نورانی ہوجاتا ہے' اور نفاق کا آغاز ایک سیاہ نقطے سے ہوتا ہے' جس قدر نفاق بڑھتا ہے اسی قدر اس نقطے کی سیاہی اور حسّی وجود میں زیادتی ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ تمام قلب سیاہ پڑ جاتا ہے۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ اچھے اخلاق کبھی طبعی ہوتے ہیں' اور خلقتہً آدمی کے نفس میں پائے جاتے ہیں' کبھی ان کا اکتساب کرنا پڑتا ہے' اکتساب کی ابتدا تکلیف سے ہوتی ہے' بعد میں یہی اخلاق عادت اور طبیعت بن جاتے ہیں۔ نیک لوگوں کے مشاہدے

اور ان کی تقلید سے بھی اچھے اخلاق حاصل ہوتے ہیں' کیوں کہ طبائع نقل میں ماہر ہوتی ہے' اور وہ خیرو شر ہر طرح کے امور سرقہ کرلیتی ہیں' جس شخص میں یہ تینوں باتیں طبع' عادت اور تعلم بیک وقت موجود ہوں بلاشبہ وہ شخص فضیلت کے اعلیٰ درجے پر ہے' اور وہ شخص ذلت اور خدا تعالیٰ سے بعد کے انتہائی درجے پر ہے جس کی طبیعت بھی سلیم نہ ہو' عادتاً شر کو پسند کرتا ہو اور دوست احباب بھی برے ہوں' باقی لوگ ان دونوں کے درمیانی درجات پر ہیں' قرآن پاک میں ہے:۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (پ ۳۰ ر ۲۴ آیت ۷-۸)

جو شخص (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (پ ۱۴ ر ۱۰ آیت ۳۳)

اور ان پر اللہ تعالیٰ نے ذرا ظلم نہیں کیا لیکن وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔

تہذیبِ اخلاق کے حصول کا تفصیلی طریقہ

بدن اور نفس : یہ بات آپ پہلے جان چکے ہیں کہ اخلاق میں اعتدال نفس کی صحت اور اعتدال سے انحراف نفس کے مرض کی علامت ہے' یہ ایسا ہی ہے جیسے بدن کے مزاج میں اعتدال تندرستی اور اعتدال سے انحراف بیماری کی دلیل ہے' زیر بحث موضوع کے سلسلے میں ہم بدن کو بطور مثال بیان کرسکتے ہیں' جس طرح بدن سے امراض دور کرکے اس کی صحت اور تندرستی کے لیے کوشش کی جاتی ہے' اسی طرح نفس سے اخلاقِ رذیلہ دور کئے جاتے ہیں اور اسے اخلاق فاضلہ سے آراستہ کیا جاتا ہے' انسان کے جسمانی نظام میں اصل اعتدال ہی ہے' غذا اور خواہشات کے عوارض سے معدے میں خلل واقع ہوتا ہے اسی طرح نفسِ انسانی میں بھی اصل اعتدال ہی ہے' چنانچہ اسی اعتدالِ نفس کی طرف مشہور حدیث میں اشارہ ہے کہ ہر بچہ معتدل مزاج' اور صحیح فطرت کا حامل پیدا ہوتا ہے' بعد میں اس کے والدین اسے اپنے اپنے طرز پر ڈھال لیتے ہیں' حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

کل مولود یولد علی الفطرة وانما ابواہ یھودانه او ینصرانه او یمجسانه (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

ہر بچہ فطرت (اصلی ایمان پر) پیدا ہوتا ہے اور اس کے والدین اسے یہودی' نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی عادت یا تعلیم کے ذریعہ رذائل اختیار کرتا ہے پیدائش کے وقت یہ رذائل اس کے اندر پیدا نہیں ہوتے نیز جس طرح بدن ابتدا ہی سے کامل پیدا نہیں ہوتا بلکہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور نشوونما پاتا ہے اسی طرح نفس بھی شروع سے کامل پیدا نہیں ہوتا بلکہ بتدریج کمال حاصل کرتا ہے' البتہ بدن کی طرح نفس میں کمال حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے' تعلیم و تربیت اور تزکیہ و تہذیب سے نفس کامل ہوتا ہے۔

اگر بدن صحیح ہو تو طبیب اس کی صحت کی حفاظت کے لیے تدبیریں کرتا ہے اور بیمار ہو تو اس کی صحت کی واپسی کے لیے جدوجہد کرتا ہے' اسی طرح آدمی کو چاہئے کہ وہ پاک و صاف اور شائستہ و مہذب نفس کی حفاظت کرے اور صفاتِ کمال اور صفاء سے محروم نفس میں کمال اور صفاء پیدا کرنے کی کوشش کرے جس طرح بدن کے نظام اعتدال کو درہم برہم کرنے والی علت کا علاج اس کی ضد سے کیا جاتا ہے یعنی حرارت کا برودت سے اور برودت کا حرارت سے اسی طرح نفس کے امراض کا علاج بھی ان کی اضداد سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً جہل کے مرض کا علاج تعلیم سے بخل کی بیماری کا علاج سخاوت سے' تکبر کے مرض کا علاج تواضع سے' اور حرص و

ہَوس کا علاج نفسانی خواہشات کے سیلاب پر بند لگانے سے کیا جاتا ہے خواہ اس علاج میں تکلّف ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ جس طرح بدن کی بیماریوں کا علاج دوا کی تلخی برداشت کرنے اور دل کی خواہشات کو دبانے سے ہوتا ہے' اسی طرح نفس کے امراض بھی مجاہدے کی تلخی اور شدّت پر صبر کئے بغیر دور نہیں ہوتے بلکہ دل کے امراض میں اس مجاہدے کی ضرورت کچھ زیادہ ہی پڑتی ہے' اس لیے کہ بدن کی بیماریوں کا خاتمہ تو اس وقت ہوجاتا ہے جب انسان کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑتی ہے لیکن دل کے امراض مرنے کے بعد بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہ جاتے ہیں۔ نیز جس طرح حرارت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جسمانی مرض کے لیے ہر سرد دوا اس وقت تک مفید ہوتی جب تک وہ مرض کی شدّت وضعف کو سامنے رکھ کر تجویز نہ کی گئی ہو اور اس میں مقدار کی کمی' زیادتی کی رعایت نہ کی گئی ہو' اس کے لیے اطبّاء نے ایک معیار مقرّر کر رکھا ہے اسی معیار کی روشنی میں وہ دوا کی مناسب مفید اور مرض کے لیے مؤثّر مقدار تجویز کرتے ہیں' اگر یہ معیار ملحوظ نہ رہے تو مرض کم ہونے کی بجائے زیادہ ہوجائے' یہی حال نفس کی بیماریوں کا ہے۔ معالج کو چاہئے کہ وہ جن اخلاق کا ان کے اَضداد سے علاج کرے ان میں یہ معیار ملحوظ رکھے۔ دوا کا معیار مرض کی روشنی میں متعیّن کیا جاتا ہے' چنانچہ طبیب اس وقت تک کسی مرض کا علاج نہیں کرتا جب تک وہ یہ پتا نہیں چلالیتا کہ زیرِ علاج مرض کا سبب بارد ہے یا حار ہے' اگر وہ مرض حرارت کی بناء پر ہے تو وہ اس کے ضُعف وشدّت پر نظر ڈالتا ہے' پھر بدن کے احوال' وقت کے تقاضے' مریض کی عمر اور اس کے مشاغل وغیرہ بھی معالج کی نظر میں رہتے ہیں اور وہ انہی کی روشنی میں علاج تجویز کرتا ہے' اسی طرح مرشد کو چاہئے کہ وہ اپنے زیرِ علاج روحانی مریضوں پر ریاضتوں اور مجاہدوں کا اتنا بوجھ نہ ڈالے کہ وہ اسے برداشت نہ کرسکیں' نیز اپنے مریض کے لیے کوئی مجاہدہ اس وقت تک تجویز نہ کرے جب تک اس کے مرض کا صحیح طور پر اندازہ نہ کرلے۔ علاج کے سلسلے میں طبیب کا فرض یہ ہے کہ وہ مرض دیکھ کر دوا دے' اگر اس نے تمام امراض کا علاج ایک ہی دوا سے کیا تو اس کا انجام مریضوں کی ہلاکت کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح مرشد کو چاہئے کہ وہ اپنے تمام مریدین کی اصلاح کے لیے ایک ہی طریقہ اختیار نہ کرے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ اپنے روحانی مریضوں کے دلوں کو ہلاکت میں مبتلا کردے گا مرشد کا فرض یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے مرید کے مرض کی تشخیص کرے' اس کے حالات پر نظر ڈالے' اس کے سن وسال اور طبیعت ومزاج کی رعایت کرے' اور یہ دیکھے کہ وہ مجاہدے کی کس قدر مشقت اور تعب برداشت کرتا ہے' ان تمام امور کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس کے لیے کوئی مجاہدہ تجویز کرے۔ اگر مرید مُبتدی ہو اور شریعت کی حدود سے ناواقف ہو تو پہلے سے طہارت اور نماز اور ظاہری عبادات کے مسائل سکھلائے جائیں اگر وہ حرام مال میں مشغول ہو اور معصیت کا اِرتکاب کرتا ہو تو اسے منع کرے اور گناہوں کی زندگی گذارنے سے روکے' جب اس کا ظاہر گناہوں کی آلودگی سے پاک اور عبادات کے نور سے منوّر ہوجائے تو احوال کے قرائن سے اس کے باطن کا جائزہ لے اور اخلاق وعادات اور قلب کے امراض کا تجزیہ کرے' اگر اس کے پاس ضرورت سے زائد مال ہو تو اس سے لے لے اور خیرات کردے تاکہ اس کے دل میں مال کی طرف کوئی اِلتفات باقی نہ رہے اور وہ پوری طرح اللہ کی طرف مائل ہوجائے' اسی طرح اگر مرید کے دل میں تکبّر' رعُونت' اور عزتِ نفس کا احساس زیادہ ہو تو اسے مانگنے اور لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کے لیے بازار بھیجے' کیونکہ تکبّر اور رعُونت اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کا احساس ذلّت کے بغیر نہیں جاتا۔ اور گداگری سے زیادہ باعث ذلّت چیز کوئی دوسری نہیں ہے' جب تک یہ بیماری اچھی طرح ختم نہ ہوجائے اس وقت تک وہ اسے اس ذلیل پیشے کی پابندی کرنے کا مکلّف بنائے' کبر اور رعونتِ قلب کی بدترین مہلک بیماریاں ہیں' اگر کسی مرید پر جسم ولباس کی نظافت کا خیال غالب ہو' اور وہ صفائی کی طرف زیادہ مائل نظر آتا ہو تو اس سے گھریلو کام لئے جائیں مثلاً گھر کی صفائی کرائی جائے گندی جگہوں پر جھاڑو لگوائی جائے' باورچی خانے کا کوئی کام سپرد کردیا جائے تاکہ دھویں سے سابقہ پڑے' اور نظافت کی رعونت باقی نہ رہے۔ جو لوگ اپنے کپڑوں میں زیب وزینت اختیار کرتے ہیں اور خوبصورت جائے نمازیں تلاش کرتے ہیں ان میں اور دلہنوں میں کوئی فرق نہیں ہے' دلہنیں بھی دن بھر اپنی آرائش میں مشغول رہتی ہیں نیز اس میں بھی کوئی فرق نہیں ہے کہ آدمی اپنے آپ کو

پوجے یا پتھر کے صنم کی پرستش کرے، جب بھی بندہ غیر اللہ کی پرستش کرتا ہے اس کا قلب اللہ سے محجوب ہو جاتا ہے، جو شخص اپنے لباس میں اس کی پاکی اور حلت کے علاوہ بھی کسی چیز کا خیال رکھے وہ اپنے نفس کا پجاری ہے، مجاہدے کے لطائف میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مرید اپنی کسی مذموم اور قبیح عادت سے باز نہ آئے تو اس کا رخ اس مذموم عادت سے ہٹا کر کسی دوسری مذموم عادت کی طرف پھیر دینا چاہئے جو اس سے کم درجے کی ہو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کپڑوں پر لگا ہوا خون پیشاب سے دھوئے اور پیشاب کو پانی سے دھوڈالے۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ پانی سے خون زائل نہ ہوتا ہو' یا جیسے بچے کو مکتب میں اولاً گیند بلّے سے کھیلنے کی ترغیب دی جائے' پھر کھیل سے اچھے لباس کی طرف مائل کیا جائے' اچھے لباس اور زینت و تفاخر سے ریاست و جاہ کی طلب پر آکسایا جائے' اور آخر میں اسے آخرت کی ترغیب دی جائے اگر کسی شخص کا دل ایک دم ترک جاہ پر آمادہ نہ ہو تو اسے معمولی درجے کی جاہ کی ترغیب دینی چاہئے اور اسے بتدریج اس صفت سے ہٹانا چاہئے اسی طرح اگر کسی شخص پر کھانے کی ہوس غالب پائے تو اسے روزہ اور کم خوری کا پابند کردے' پھر اسے اس امر کا مکلّف بنائے کہ وہ لذیذ کھانے تیار کرے' دوسروں کو کھلائے' اور خود نہ کھائے' یہاں تک کہ اس کا نفس عادی ہو جائے اور اس میں صبر کی قوّت پیدا ہو جائے' ہوس کا خاتمہ ہو جائے۔ اسی طرح اگر کوئی مرید نوجوان ہو' اور نکاح کا خواہش مند ہو لیکن نان نفقہ سے عاجز ہو تو اسے روزہ رکھنے کے لیے کہے بعض اوقات روزے سے بھی شہوت کم نہیں ہوتی اس صورت میں مرید سے کہے کہ وہ ایک دن اپنا روزہ پانی سے افطار کرے' روٹی نہ کھائے' دوسرے دن روٹی سے افطار کرے پانی نہ پئے گوشت اور دوسرے سالنوں کے استعمال سے منع کرے' یہاں تک کہ اس کی شہوت ختم ہو جائے شروع میں بھوک سے اچھا کوئی دوسرا علاج نہیں ہے' اگر اس پر غصے کا غلبہ دیکھے تو تحمل اور خاموشی اختیار کرنے کا حکم دے' اور اس پر ایسے لوگ مسلّط کردے جو بد اخلاق ہوں' اور ایسے ہی لوگوں کو خدمت پر اسے مامور کردے تاکہ ان کے ساتھ رہتے رہتے وہ اذیتوں پر صبر کرنے کا خوگر بن جائے جیساکہ ایک بزرگ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ زیادہ تر ایسے لوگوں کی مزدوری کیا کرتے تھے جو بد اخلاق ہوں اور زشت روئی اور درشت کلامی ان کی عادت ہو' وہ ان کی طرف سے پہنچنے والی ہر اذیّت پر صبر کرتے تھے' اور غصہ پی لیتے تھے' شروع شروع میں ایسا کرنے کے لیے انہیں تکلّف سے کام لینا پڑا' بعد میں صبر ان کی عادت بن گیا یہاں تک کہ اس سلسلہ میں ان کا نام مثال کے طور پر لیا جانے لگا۔ بعض بزرگ اپنے اندر کمزوری اور بزدلی پاتے تھے اس کا علاج انہوں نے اس طرح کیا کہ وہ سمندر کے سینے پر اس وقت سفر کرنے لگے جب موسم سرد ہو' اور موجیں مضطرب ہوں۔ عبادت سے سُستی اور کاہلی کے علاج کے لیے ہندو عابد رات بھر ایک ہی پہلو کھڑے رہتے ہیں بعض بزرگ سلوک کی ابتدا میں سُست تھے' انہوں نے اپنے مرض کا علاج اس طرح کیا کہ رات بھر سر کے بل کھڑے رہے تاکہ نفس اس مشقت سے گھبرا کر پاؤں پر کھڑا ہونے پر رضامند ہو جائے بعض لوگوں نے مال کی محبت دل سے اس طرح سے زائل کی کہ درہم و دینار دریا برد کردئے خیرات کرنے کے بجائے دریا میں بہانے کو انہوں نے اس لیے ترجیح دی کہ خیرات کرنے میں ریاکاری کا اندیشہ تھا۔

ان مثالوں سے امراضِ قلب کے علاج کے طریقے معلوم ہوتے ہیں' لیکن یہاں ہمارا مقصد ہر مرض کی دوا بیان کرنا نہیں ہے' دوائیں اور علاج کے طریقے تو ہم آئندہ صفحات میں بیان کریں گے' اس وقت تو ہمارا مقصد صرف یہ بیان کرنا ہے کہ ہر مرض کا علاج اس کی ضد پر عمل کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ طریقہ علاج ایک ہی جملے میں بیان فرمایا ہے:۔

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ (پ ۳۰ ر ۴ آیت ۴۰-۴۱)

اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگا۔

مجاہدے میں اصل اور اہم تر بات یہ ہے کہ جس بات کا عزم کرے اسے پورا کرے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ترکِ شہوت کا عزم

کرلے اور اس راہ میں کچھ دشواریاں پیش آئیں تو ان دشواریوں کو انگیز کرنے کا حوصلہ رکھے' اور یہ سمجھ کہ یہ دشواریاں بطورِ ابتلاً و آزمائش پیش آئی ہیں' ان دُشواریوں سے نبرد آزما ہوکر اپنے ارادے پر قائم رہنا ہی مجاہدہ ہے عہد شکنی کرے گا تو نفس کو ایسی ہی عادت ہوجائے گی' اور وہ تباہ ہوجائے گا' اگر خدانخواستہ کبھی عہد شکنی کی نوبت آجائے تو اپنے آپ کو سزا دے جیسا کہ ہم نے محاسبہ اور مراقبہ کے باب میں نفس کو سزا دینے کے موضوع پر گفتگو کی ہے اگر نفس کو سزا نہ دی تو نفس اس پر غالب آجائے گا' اور تمام ریاضت برباد جائے گی۔

قلوبؔ کی بیماری اور صحت کی علامتیں

جاننا چاہئے کہ ہر عضو بدن ایک مخصوص فعل کے لیے پیدا ہوا ہے' اگر وہ فعل جس کے لیے عضو کی تخلیق کی گئی ہے اس عضو سے سرزد نہ ہو اور سرزد ہو تو اضطراب کے ساتھ سرزد ہو تو کہا جائے گا کہ یہ عضو اپنی صحت کھو چکا ہے' ہاتھ کا مرض یہ ہے کہ اس میں پکڑنے کی صلاحیت باقی نہ رہے' آنکھ کا مرض یہ ہے کہ وہ دیکھنے سے محروم ہوجائے۔ اسی طرح قلب کا مرض یہ ہے کہ وہ اپنے اس مخصوص فعل سے عاجز رہ جائے جس کے لیے اس کی تخلیق عمل میں آئی ہے' اور قلب کا فعل علم' حکمت اور معرفت' اللہ تعالیٰ کی محبت' اس کی عبادت' اس کے ذکر سے لذت حاصل کرنا اور اسے اپنی ہر خواہش پر ترجیح دینا' نیز اپنی تمام خواہشات اور اعضاء سے اس پر مدد لینا ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (پ ۲۷ ر ۲ آیت ۵۶)

اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔

بہرحال ہر عضو کے ساتھ کوئی نہ کوئی فائدہ مخصوص ہے قلب کا مخصوص فعل حکمت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے' نفسِ انسانی کی خصوصیت وہی ہونی چاہئے جس کے ذریعہ وہ بہائم سے ممتاز ہوجائے' کیونکہ کھانے پینے' دیکھنے' اور جماع کرنے کی قوت تو جانوروں کو بھی میسّر ہے' انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اشیاء کی حقیقتوں کا ادراک رکھتا ہے' اور یہ حقیقت ہے کہ اشیاء کی اصل' ان کا موجد اور مخترع اللہ تعالیٰ ہیں' اب اگر کوئی شخص کسی شئی کا علم رکھتا ہے لیکن اس کے موجد کی معرفت نہیں رکھتا تو کہا جائے گا کہ وہ اس شئی کی حقیقت سے واقف ہی نہیں ہے' معرفت کی علامت محبت ہے' جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھے گا وہ اس سے محبت بھی کرے گا' اور محبت کی علامت یہ ہے کہ اس پر دنیا کی کسی بھی محبوب چیز کو ترجیح نہ دی جائے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ٰاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (پ ۱۰ ر ۹ آیت ۲۴)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے ماں باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو' اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے' اور اسکے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو۔

جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور چیز کی محبت ہے اس کا دل بیمار ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کے معدے کو روٹی کے بجائے مٹی کی رغبت ہوجائے' ایسا معدہ مریض کہلاتا ہے' یہ قلب کے امراض کی علامتیں ہیں' اس سے معلوم ہوا کہ تمام قلوب بیمار ہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ۔

بعض امراض اتنے مخفی ہوتے ہیں کہ مریض کو ان کا علم بھی نہیں ہوپاتا۔ دل کے امراض کا حال کچھ ایسا ہی ہے کہ صاحبِ مرض کو اپنے مرض کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ اسی لیے وہ ان سے غفلت برتتا ہے' اگر وہ مرض کا حال جان لے تو اس کی دوا کی تلخی پر صبر کرنے کی ہمت کھو بیٹھے اس لیے کہ دل کے مرض کی دوا شہوتوں کی مخالفت ہے جس کی تکلیف جاں کنی کی تکلیف سے زیادہ سخت سمجھی جاتی ہے' اگر کسی شخص کے اندر صبر کا یارا بھی ہو تو ایسا طبیب حاذق میسّر نہیں آتا جو اس کا صحیح طریقے پر علاج کرسکے' دل کی بیماریوں کے معالج علماء ہوسکتے ہیں' لیکن ان کے قلوب خود بیماریوں میں مُبتلا ہیں' جب وہ اپنا ہی علاج نہیں کرپاتے تو دوسرے کا علاج کیا کریں گے' اس اعتبار سے دل کا مرض سنگین اور لاعلاج بن گیا ہے' دل کی بیماریوں کے علاج کا علم مٹ چکا ہے نہ ان بیماریوں کو سمجھنے والے رہے اور نہ علاج کرنے والوں کا وجود رہا۔ لوگ دنیا کی محبت میں غرق ہیں' اور ایسے اعمال میں مشغول ہیں جن کا ظاہر عبادت ہے اور باطن ریا ہے' یہاں تک اصل امراض کی علامات کا ذکر تھا۔ اب معالجہ کے نتیجے میں حاصل ہونے والی صحت کی علامات کا حال سُنیئے۔

اس سلسلے میں اس بیماری پر نظر رکھنی چاہیے جس کا علاج کرنا ہے' اگر وہ بیماری مثلاً بخل ہے جو ہلاک کرنے والی اور اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والی ہے تو اس کا علاج مال خرچ کرنے سے ہُوگا' لیکن بعض اوقات مال خرچ کرنے میں حدود سے تجاوز کیا جاتا ہے اور اِنفاق اسراف میں داخل ہوجاتا ہے' اِسراف بھی ایک مرض ہے' یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص بُرودت کا علاج حرارت سے کرے اور اتنی زیادہ حرارت پہنچائے کہ بُرودت پر حرارت غالب آجائے ظاہر ہے کہ حرارت کا غلبہ بھی مرض ہے' بلکہ مطلوب اعتدال ہے' جس میں نہ حرارت غالب ہوتی ہے اور نہ بُرودت' خرچ کرنے میں بھی اِسراف اور بخل کا درمیانی درجہ مطلوب ہے' اگر آپ نقطۂ اعتدال' اور دو چیزوں کے درمیان حدِّ اوسط معلوم کرنا چاہیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس فعل پر نظر ڈالیں جو کسی خلق کے باعث وجود میں آئے' اگر وہ فعل سہل اور لذیذ معلوم ہو تو جان لینا چاہئے کہ یہی خلق نفس پر غالب ہے' مثلاً اگر مال جمع کرنے اور اسے روکنے میں نفس کو مستحقین پر خرچ کرنے کے مقابلے میں زیادہ نفرت ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ نفس پر خلق بخل غالب ہے۔ اس صورت میں خرچ کرنے اور مستحقین کو ان کا حق پہنچانے کا التزام کرے' اور اگر نفس کو مستحق پر خرچ کرنے کے مقابلے میں غیر مستحق پر خرچ کرنے میں زیادہ لذّت ملتی ہو اور یہ خرچ کرنا جمع کرنے سے زیادہ سہل لگتا ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ نفس پر خلق اِسراف غالب ہے۔ اس صورت میں مال جمع کرنے اور روکنے کی طرف رُجوع ہونا چاہئے نفس کی نگرانی اسی طرح جاری رکھنی چاہئے اور یہ دیکھتے رہنا چاہئے کہ کون سا فعل نفس پر شاق گذرتا ہے' اور کون سا فعل سہل ہے۔ اور یہ نگرانی اس وقت تک جاری رہنی چاہئے جب تک مال کی رغبت قطعی طور پر ختم نہ ہوجائے یعنی نہ نفس کو خرچ سے دل چسپی رہے' اور نہ جمع و اِمساک کی طرف اس کا اِلتفات رہے بلکہ اس کی حیثیت پانی کی سی ہوجائے جو ضرورت کے لیے روکا جاتا ہے اور ضرورت کے وقت خرچ کیا جاتا ہے' نیز بَذل (خرچ کرنے) کو اِمساک (روکنے) پر کوئی ترجیح نہ ہو' جو دل اس درجہ کا ہوجائے گا وہ ان اخلاقِ رذیلہ سے پاک رہے گا۔ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے دل کا دُنیاوی علائق سے لاتعلق ہونا ضروری ہے' تاکہ جب دنیا سے اِذنِ سفر ملے تو نہ دل میں کسی شئی کی طرف اِلتفات ہو اور نہ اس کے اسباب کا دھیان ہو۔ اس صورت میں نفس کی ربّ کریم کے حضور واپسی اس نفس لطیفہ کی واپسی ہوگی جو خود بھی اپنے رب سے راضی ہے اور رب بھی اس سے راضی ہے' ایسے ہی نفوس اللہ کے مقرّب بندوں انبیاء' صدیقین' شُہداء اور صُلحاء کے زمرے میں شمار کیئے جاتے ہیں۔

درمیانی درجہ دونوں طرف کے درجات میں انتہائی دقیق ہے' بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ جو لوگ دنیا میں اس دُشوار گذار صراط (راستے) پر قائم رہیں گے وہ آخرت کے پُل صراط سے سلامتی کے ساتھ گذریں گے' اور کیونکہ آدمی صراطِ مستقیم کے درجہ اوسط کے ایک نہ ایک جانب تھوڑا بہت جھک ہی جاتا ہے اس لیے اس کا دل اسی جانب متعلق رہتا ہے جس جانب جھکتا ہے۔ اس لحاظ سے اسے کچھ نہ کچھ عذاب ضرور ہوگا گو وہ دوزخ کی آگ سے اس طرح

نکل جائے جس طرح بجلی چمکتی ہے اور اس کی رو تار کے اندر سے گذرتی ہے' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔
وَإِنْ مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا (پ ۱۶ ر ۸ آیت ۷۱-۷۲)
اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گذر نہ ہو یہ آپ کے رب کے اعتبار سے لازم ہے (ضرور) پورا ہو کر رہے گا پھر ہم ان لوگوں کو نجات دے دیں گے جو خدا سے ڈریں۔
مُتّقین سے وہ لوگ مراد ہیں جو صراطِ مستقیم سے قریب زیادہ اور بعید کم رہے ہیں صراطِ مستقیم پر ثبات قدمی کی اسی دُشواری کے پیش نظر بندے پر سورۂ فاتحہ کے دوران شب و روز میں سترہ مرتبہ یہ دعا واجب ہوئی ہے:۔
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (پ ر آیت)
بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا۔
روایت ہے کہ کسی بزرگ نے خواب میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی' اور عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ سورۂ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ اس سورت میں ایسی کیا بات ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس سورت میں یہ آیت ہے:۔
فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ (پ ۱۲ ر ۱۰ آیت ۱۱۲)
آپ جس طرح کہ آپ کو حکم ہوا ہے (راہِ دین) پر مستقیم رہئے۔
بہر حال سیدھے راستے پر قدم رہنا اگرچہ سخت دشوار ہے لیکن انسان کو استقامت سے قریب تر رہنے میں کسی غفلت سے کام نہ لینا چاہئے۔ اگرچہ وہ عینِ استقامت حاصل نہ کر پائے جو شخص نجات کا خواہاں ہے اسے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ نجات صرف نیک اعمال میں منحصر ہے' اور نیک اعمال اچھے اخلاق کے پہلو سے جنم لیتے ہیں' اس اعتبار سے ہر بندے کو اپنے اوصاف اور اخلاق کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے' تاکہ اگر کوئی نقص ہو تو اسے دُور کیا جاسکے۔

اپنے عیُوب پہچاننے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ جس بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے اس کے عیُوب پر مطّلع فرمادیتے ہیں' جس شخص کو گہری بصیرت میّسر ہوتی ہے اس پر عیُوب مخفی نہیں رہتے' اور جب عیُوب کا علم ہو جاتا ہے تو ان کے علاج میں بھی آسانی ہو جاتی ہے' لیکن اکثر لوگ اپنے عیُوب سے ناواقف ہیں حال یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی آنکھ کا تنکا دیکھ لیتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھ پاتا..... اپنے عیوب پہچاننے کے چار طریقے ہیں:

پہلا طریقہ : یہ ہے کہ کسی ایسے شیخ کی مجلس میں حاضری دیا کرے جو نفس کے عیوب سے واقف' اور مخفی آفات پر مطّلع ہو' اس شیخ کی بات سُنے اور مجاہدے کے باب میں اس کی ہدایات پر عمل پیرا ہو' یہ حال مرید کا مُرشد کے ساتھ اور شاگرد کا استاذ کے ساتھ ہے' شیخ اپنے مرید کو' اور استاذ اپنے شاگرد کو اس کے باطنی عیوب سے آگاہ کرتا ہے ان کے اِزالے کا طریقہ تجویز کرتا ہے' اس زمانے میں مذکورہ طریقہ پر عمل کرنے والے شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔

دوسرا طریقہ : یہ ہے کہ کوئی مخلص' وفاشناس' زیرک اور دیندار دوست تلاش کرے اور اسے اپنے نفس کا نگراں مقرر کردے تاکہ وہ اس کے اَحوال اور اَفعال پر نظر رکھے' اور ظاہر و باطن میں جو بُرائی بھی دیکھے اس پر تنبیہہ کرے' اکابر علمائے دین کا طریقہ

یہی رہا ہے۔ حضرت عمرؓ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو مجھے میرے عیوب سے آگاہ کرے' چنانچہ وہ حضرت سلمان فارسیؓ سے اپنے عیوب کے متعلق دریافت کرتے تھے' ایک مرتبہ حضرت سلمانؓ آئے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ اگر میرے متعلق کوئی غلط بات تم نے سنی ہو تو مجھے بتلاؤ تاکہ میں اپنی اصلاح کرلوں۔ شروع میں انہوں نے معذرت کی لیکن جب حضرت عمرؓ نے زور دے کر فرمایا تو انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ دسترخوان پر دو سالن بیک وقت جمع کرلیتے ہیں' اور یہ کہ آپ کے پاس دو جوڑے ہیں ایک دن کا اور ایک رات کا۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ تمہیں ان دو باتوں کے علاوہ بھی کچھ معلوم ہوا ہے جواب دیا: نہیں: فرمایا: ان دونوں باتوں کے سلسلے میں مطمئن رہو' آپ حضرت حذیفہؓ سے بھی اپنے عیوب دریافت کرتے اور ارشاد فرماتے کہ تم منافقین کے سلسلے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار ہو کیا میرے اندر بھی تمہیں نفاق کی کوئی علامت نظر آتی ہے؟ غور کیجئے کہ حضرت عمرؓ اپنی جلالتِ شان اور عُلوِ مرتبت کے باوجود اپنی ذات پر کیسی کیسی تہمتیں تراشتے اور کس کس طرح لوگوں کو اپنے عیوب بتلانے پر مجبور کرتے۔

جس کی عقل زیادہ اور منصب بلند تر ہو گا وہ خود پسندی کے مرض میں بہت کم مبتلا ہو گا' اور اپنے نفس کو پاکباز سمجھنے کی بجائے متہم اور غلط کار سمجھتا رہے گا۔ اس زمانے میں ایسے دوستوں کا ملنا دشوار ہے جو کسی رعایت کے بغیر عیب سے آگاہ کردیں' زیادہ تر دوست خوشامد پسند ہوتے ہیں کہ عیب کو ہنر کہنے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے' بلکہ اسے دوستی کا حق ادا کرنے سے تعبیر کرتے ہیں کچھ دوست حاسدانہ طبیعت رکھتے ہیں' اور بڑھا چڑھا کر عیب بتلاتے ہیں' مخلص' بے غرض' اور سچے دوست کا وجود عنقاء ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت داؤد طائی نے ایسے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی' لوگوں نے عرض کیا: کیا بات ہے؟ اب آپ ان لوگوں سے کیوں نہیں ملتے؟ فرمایا ایسے دوستوں سے مل کر کیا کروں جو میرے عیوب سے مجھے آگاہ نہ کریں۔ دین سے محبت رکھنے والوں کی اوّلین خواہش یہی ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ ان کے عیوب کی نشاندہی کردیا کریں' دنیا کی رسوائی آخرت کی رسوائی کے مقابلے میں بہت معمولی ہے لیکن اب لوگوں کی حالت اس کے برعکس ہے' ان دوستوں کو دشمنوں کی فہرست میں سب سے اوپر جگہ ملتی ہے جو ہمیں ہمارے عیوب سے آگاہ کریں' اور ہمیں نصیحت سے نوازیں یہ ایمان کی کمزوری ہے کہ ہم اپنے عیوب کی نشاندہی پر برافروختہ ہوں' اخلاقِ رذیلہ کی مثال ایسی ہے جیسے سانپ' بچھو وغیرہ اب اگر یہ موذی کیڑے تمہارے کپڑوں میں گھس جائیں اور کوئی شخص تمہیں ان کی اذیت سے آگاہ کرے اور ان سے بچنے کی تاکید کرے یا بچنے کا راستہ بتلائے تو کیا وہ تمہارا دشمن ہے؟ ہرگز نہیں! اس شخص کا ہمیں ممنون احسان ہونا چاہئے اور بچھو وغیرہ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے' حالانکہ بچھو کے زہریلے اثرات ایک دو روز رہیں گے' جب کہ اخلاقِ بد کا اثر موت کے بعد بھی باقی رہے گا' پھر کیا بات ہے کہ ہم اپنے ناصح کو دشمن تصوّر کرتے ہیں' اور اس کے بتلائے ہوئے عیوب کا ازالہ نہیں کرتے' بلکہ اُلٹا اس کے اندر عیوب تلاش کرنے لگتے ہیں تاکہ وہ آئندہ نصیحت کی جرأت نہ کرسکے۔ ناصح کو دشمن وہی لوگ سمجھتے ہیں جن کے قلوب معاصی کی کثرت سے سیاہ اور سخت پڑ چکے ہوں' یہ ضعف ایمان ہی کا شاخسانہ ہے۔ اے اللہ! ہمیں رُشد و ہدایت کا راستہ دکھلا' ہمیں ہمارے عیوب سے آگاہ فرما' اور ان عیوب کے ازالے کی قوت سے نواز' اور ہمیں ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کی توفیق عطا کر جو ہمیں ہمارے عیوب سے آگاہ کریں۔

تیسرا طریقہ : یہ ہے کہ اپنے عیوب کا علم دوستوں کے ذریعہ حاصل کرے' اس لیے کہ دشمنوں کی آنکھ عیب کے علاوہ کچھ نہیں دیکھتی اور زبان عیب کے علاوہ کوئی بات ظاہر نہیں کرتی' ہمارا خیال تو یہ ہے کہ آدمی خوشامد پسند دوستوں کی بہ نسبت عیب جو' عیب بین اور عیب گو دشمنوں سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتا ہے اس لئے کہ دوست عموماً تعریف ہی کرتے ہیں' ان کی آنکھیں صرف اچھائی دیکھتی ہیں' ان کی زبانوں پر صرف اچھائی رہتی ہے یہ صحیح ہے کہ آدمی فطرتاً دشمنوں کی تکذیب کرتا ہے اور ان کی ہر بات کو حسد پر محمول کرتا ہے لیکن اہل بصیرت دشمنوں سے بھی فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔

چوتھا طریقہ : یہ ہے کہ لوگوں سے ملے جُلے اور جو بات ان میں بُری دیکھے اسے سامنے رکھ کر اپنے نفس کا احتساب کرے اگر وہ

بات اپنے نفس میں پائے تو اسے دور کرے۔ مؤمن مؤمن کے لیے آئینے کی طرح ہوتا ہے' ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے آئینے میں اپنی تصویر دیکھے' اس کے عیوب کے ذریعہ اپنے عیوب معلوم کرے' اور یہ سمجھے کہ خواہشات کی اتباع کے معاملے میں عام طور پر طبائع قریب قریب ہیں' جو بات ایک میں ہوگی اس کا کل یا جزء دوسرے میں بھی ہوگا۔ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے عیوب ڈھونڈے اور قلب کو ان عیوب سے پاک کرے۔ اگر تادیب اور تزکیہ کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو ہر شخص کی خود بخود اصلاح ہو جائے' نہ مؤدب کی ضرورت ہے اور نہ مربّی کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ کو ادب کس نے سکھلایا ہے؟ فرمایا: مجھے ادب کسی نے نہیں سکھلایا' جاہلوں کی جہالت مجھے بری معلوم ہوئی میں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی۔ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جنہیں کمال' بصیرت' معرفت اور ذہانت جیسے اوصاف کا حامل استاذ نہ ملے۔ جو اپنے نفس کی تہذیب و تزکیہ سے فارغ ہونے کے بعد اللہ کے بندوں کی تعلیم و تہذیب میں مشغول ہو' اور از راہِ شفقت انہیں نصیحت کرے' اور اچھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کرے۔ جس شخص کو ایسے استاذ کی صحبت میسّر ہے اس کے پاس گویا چلتا پھرتا شفاخانہ ہے جہاں ہر مرض کا علاج موجود ہے۔ ایسے استاذ کا دامن تھامے رہنا چاہئے وہ اس کے مرض کا علاج کرے گا اور اسے ہلاکت سے بچائے گا۔

قلوب کے امراض کا علاج ترکِ شہوات دلائلِ نقل شواہدِ شرع

اگر آپ مذکورہ بالا تفصیلات پر غور کریں گے تو بصیرت کے دروازے کھل جائیں گے' اور علم و یقین کی روشنی سے قلوب کے امراض اور ان کے علاج کا طریقہ واضح ہو جائے گا۔ لیکن اگر آپ غور و فکر کے ذریعہ امراض اور ان کے معالجے کی معرفت حاصل کرنے سے عاجز ہوں تو تقلید اور ایمان بالغیب کے طور پر ان کی تصدیق ضرور کرنی چاہئے' کیونکہ ایمان کا درجہ الگ ہے اور علم کا درجہ الگ ہے۔ علم ایمان کے بعد حاصل ہوتا ہے' اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (پ ۲۸ ر ۲ آیت ۱۱)

اللہ تعالیٰ تم میں ایمان والوں کے (اور ایمان والوں میں) ان لوگوں کے جن کو علم دین عطا ہوا ہے (اُخروی) درجے بلند کرے گا۔

چنانچہ جس شخص نے سبب دریافت کئے بغیر اس امر کی تصدیق کی کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا واحد راستہ شہوات کی مخالفت ہے اس نے ان لوگوں کا درجہ حاصل کیا جو ایمان لائے' اور جس نے اس حقیقت کا بھید پالیا وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں ایمان کے ساتھ ساتھ علم بھی عطا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان اور اہلِ علم دونوں ہی سے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (پ ۵ ر ۱۰ آیت ۹۵)

اور سب سے اللہ تعالیٰ نے اچھے گھر کا وعدہ کیا ہے۔

شریعت کے شواہد : بہر حال اس حقیقت پر کہ ترکِ شہوات ہی اللہ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ آیات' احادیث اور علماء کے اقوال شاہد ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (پ ۳۰ ر ۴ آیت ۴۰-۴۱)

اور جس نے نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى (پ ۲۶ ر ۱۳ آیت ۳)

یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے خالص کر دیا ہے۔

اس کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے شہوات کی محبت نکال دی' سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتا ہے:

المؤمن بين خمس شدائد' مؤمن يحسده' ومنافق يبغضه' وكافر يقاتله' وشيطان يضله' ونفس تنازعه (مكارم الاخلاق۔ انسؓ)

مؤمن پانچ مصیبتوں کے درمیان ہے' مؤمن اس سے حسد کرتا ہے' منافق اس کے تئیں بغض رکھتا ہے' کافر اس سے جنگ کرتا ہے اور شیطان اسے گمراہ کرتا ہے اور نفس اس سے جھگڑا کرتا ہے۔

اس حدیث میں بتلایا گیا کہ نفس جھگڑالو دشمن ہے' اس کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ اے داؤد! اپنے رُفقاء کو شہوات کو لقمۂ تر بنانے سے ڈرا۔ کیونکہ جن قلوب کی عقلیں شہوتوں سے متعلق ہیں وہ مجھ ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اس شخص کے لیے خوش خبری ہو جو حال کی شہوت کی مستقبل کی موعودہ چیز (وعدہ کی ہوئی چیز یعنی جنت) کی خاطر چھوڑ دے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے فرمایا جو جہاد سے واپس آئے تھے:

مرحباً بكم قدمتم من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر

خوش آمدید! تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہو۔

لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جہاد اکبر کیا ہے؟ فرمایا: جہاد نفس (۱)۔ نیز ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

المجاهد من جاهد نفسه في طاعة الله عز وجل (ترمذی' ابن ماجہ۔ فضالہ بن سعیدؓ)

مجاہد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں نفس کا مجاہدہ کرے۔

ایک حدیث میں ہے:

كف أذاك عن نفسك ولا تتابع هواها في معصية الله اذ تخاصمك يوم القيامة فيلعن بعضك بعضا الا ان يغفر الله تعالى ويستر (۲)

اپنے نفس کو اپنی ایذا سے بچا' اور اللہ کی معصیت میں اس کی خواہش کا اِتباع مت کر' اس لیے کہ وہ قیامت کے روز تجھ سے خصومت کرے گا اور تیرا ایک حصہ دوسرے کو لعنت کرے گا اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ تیری مغفرت کردے اور تیری پردہ پوشی فرمادے۔

بزرگوں کے اَقوال : حضرت سفیان ثوریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ نفس کے علاج سے زیادہ کوئی علاج مجھے سخت محسوس نہیں ہوا۔ کبھی وہ میرے حق میں مُفید ہوتا اور کبھی مُضر ہوتا۔ ابو العباس موصلیؒ اپنے نفس سے کہتے کہ نہ تو شہزادوں کی طرح دنیا کے مزے لوٹتا ہے اور نہ عابدوں کی طرح مجاہدہ کرتا ہے' کیا تو مجھے جنت اور دوزخ کے درمیان قید کرائے گا' تجھے شرم نہیں آتی۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ سرکش گھوڑے کے مقابلے میں نفس کو لگام کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ یحییٰ بن معاذ فرماتے ہیں کہ نفس کے ساتھ ریاضت کی تلواروں سے لڑو اور ریاضت یہ ہے کہ آدمی کم کھائے' کم سوئے' بقدرِ ضرورت بولے اور لوگوں کی ایذا پر صبر کرے' کم کھانے سے شہوت ختم ہوجاتی ہے' کم سونے سے ارادہ و نیت میں صفائی آتی ہے' کم بولنا آفتوں اور فتنوں سے بچنے کا سبب بنتا ہے' اور لوگوں کی اذیتوں پر صبر کرنے سے منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے' آدمی کے لیے سب سے زیادہ دشوار گذار اُمراقبت کے وقت تحمّل اور معصیت کے وقت صبر ہے۔ بہرحال جب نفس میں شہوتیں جنم لیں' یا لغو گوئی کی لذّت اور حلاوت جوش میں آئے اس وقت کم خوابی کی میان سے کم خوری کی تلوار نکالے اور خاموشی کے ہاتھوں سے وہ

---

(۱) یہ روایت کتاب عجائب القلب میں گذر چکی ہے۔ (۲) اس روایت کی کوئی اصل مجھے نہیں ملی۔

کاری ضرب لگائے کہ نفس اپنے مظالم سے باز آجائے اور اس کے فتنے سرد پڑجائیں اور دل شہوت کی آلائشوں سے پاک و صاف ہوجائے' اگر نفس کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا تو وہ پاک و صاف' منوّر اور ہلکا پھلکا ہوجائے گا' خیر کے میدان اس کے راستے ہوں گے' طاعات کی وادیاں اس کی گذر گاہیں ہوں گی۔ اور وہ ان میدانوں اور وادیوں میں اس طرح دوڑے گا جس طرح گھوڑا ہموار زمین پر سرپٹ دوڑتا ہے یا اس طرح محو خرام ہوگا جس طرح بادشاہ چمن کی سیر کرتا ہے۔ یحییٰ بن معاذ رازی یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ انسان کے دشمن تین ہیں' دنیا' شیطان' نفس' دنیا سے زُہد کے ذریعہ بچو۔ اور شیطان پر اس کی مخالفت کرکے غلبہ حاصل کرو' اور نفس کو شہوتیں ترک کرکے مغلوب کرو۔ ایک پیرِ دانا کہتے ہیں کہ جس شخص پر نفس کا غلبہ ہوتا ہے وہ شہوتوں کا اسیر ہوتا ہے' اس کے پاؤں میں خواہشات کی زنجیریں پڑجاتی ہیں' اس کی باگ ڈور عقل کی گرفت سے نکل جاتی ہے' وہ اسے جدھر چاہتا ہے لیے پھرتا ہے' قلب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا پاتا۔ تمام اصحاب علم و حکمت کا اس پر اتفاق ہے کہ نعیم آخرت (جنت) نعیم دنیا کو خیرباد کہے بغیر حاصل نہیں ہوتی' ابو یحییٰ وراق فرماتے ہیں کہ جس نے شہوات کے ارتکاب سے اعضاء کو خوش کیا اس نے اپنے دل کی زمین میں ندامت کا بیج بویا' وہیب بن الورد فرماتے ہیں کہ روٹی سے زائد چیز (سالن وغیرہ) شہوتِ نفس ہے' ان ہی کا قول ہے کہ جو شخص دنیا کی شہوتوں سے محبت رکھے اسے (آخرت) ذلت کے لیے تیار رہنا چاہیے' جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے خزانوں کا امین بنایا گیا اور وہ بارہ ہزار عظمائے مصر کے عظیم الشان جلوس کی قیادت کرتے ہوئے ایک راستے سے گذرے تو زلیخا نے ان سے کہا کہ اے یوسف! حرص اور شہوات نے بادشاہوں کو غلام بنادیا اور صبر و تقویٰ نے غلاموں کو بادشاہ کردیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا کہ یہ بات باری تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ہے:۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (پ ۱۳ ر ۴ آیت ۹۰)

واقعی جو شخص گناہوں سے بچتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں بیدار رہا' اور نماز میں مشغول ہونے کی کوشش کی' لیکن مجھے وہ لذت حاصل نہ ہوئی جس کا میں عادی تھا' سونے کا ارادہ کیا تو نیند بھی نہیں آئی' بیٹھنا چاہا یہ بھی نہ ہوسکا۔ مجبوراً باہر آیا' دیکھتا کیا ہوں کہ ایک آدمی اپنے جسم سے کمبل لپیٹے ہوئے راستے میں پڑا ہے۔ جب اس نے میری آہٹ سُنی تو آواز دے کر اپنے پاس آنے کے لیے کہا' میں نے کہا: جناب! آپ نے پہلے سے مجھے اپنی آمد کی خبر نہیں دی تھی' کہنے لگا: میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ آپ کے دل کو میری طرف متوجہ کردے' میں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی' اب آپ اپنا مقصد بتلائیں' کہنے لگا: اے ابوالقاسم! یہ بتلائیں کہ نفس کے مرض کا علاج کیا ہے؟ میں نے کہا جب آدمی خواہشات کی مخالفت کرتا ہے تو نفس اس میں اذیت محسوس کرتا ہے' مگر یہی اذیت اس کا علاج اور دوا ہے' یہ سن کر وہ شخص اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا: اے نفس! سن لے میں نے سات بار تجھے یہی جواب دیا تھا' مگر تو نے میری بات نہیں سنی' اور اب جنید بھی میری تصدیق کررہے ہیں کیا تو ان کی بات بھی نہیں سنے گا۔ یزید اقاشیؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے دنیا میں ٹھنڈا پانی نہ دو' ایسا نہ ہو کہ میں آخرت میں اس سے محروم رہوں۔ ایک شخص نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے دریافت کیا کہ میں کب بولا کروں؟ انہوں نے جواب دیا: جب چپ رہنے کی خواہش ہو' اس نے دریافت کیا: اور کب خاموش رہوں؟ انہوں نے فرمایا جب طبیعت بولنے پر آمادہ نظر آئے' حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کو جنت میں جانے کا شوق ہو اسے دنیا میں شہوات سے الگ رہنا چاہیے۔ حضرت مالک بن دینارؒ بازار میں جاتے' اگر کوئی اچھی چیز نظر آتی' اور دل میں اسے حاصل کرنے کی خواہش ہوتی تو نفس کو تسلی دیتے' صبر کی تلقین فرماتے اور کہتے کہ خدا کی قسم! میں تجھے تیری عظمت اور بڑائی کی وجہ سے منع کرتا ہوں۔

<u>علماء کا متفقہ فیصلہ</u> : بہرحال تمام علماء اور دانشوروں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ آخرت کی سعادت حاصل کرنے کا صرف ایک ہی

ذریعہ ہے اور وہ یہ ہے کہ نفس کو ہوا و ہوس سے دور رکھا جائے اور خواہشات کی اتباع سے روکا جائے۔ اس اعتبار سے اس فیصلے پر ایمان لانا اور عمل کرنا واجب ہے۔ قابلِ ترک شہوات اور ناقابلِ ترک شہوات کے متعلق ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔ ریاضت کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ نفس ان چیزوں سے صرف بقدرِ ضرورت متمتع ہو جو قبر میں اس کے ساتھ نہ جائیں' یعنی لباس' نکاح' کھانا اور پینا اور مسکن وغیرہ چیزیں جو زندگی کے لیے ناگزیر ہیں' ان چیزوں میں ضرورت کی مقدار سے تجاوز کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ان سے محبت رکھتا ہے' اور مرنے کے بعد ان کی خاطر دنیا میں واپس آنے کا متمنی ہے' اور دنیا میں واپسی کی خواہش وہی شخص کرسکتا ہے جس کا آخرت کے اجر و ثواب میں کوئی حصہ نہ ہو۔ دنیا کی محبت ایک مرض ہے اور اس مرض سے نجات کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آدمی کا دل اللہ کی محبت و معرفت اور ذکر و فکر میں پورے طور پر مشغول ہو' اور دنیاوی چیزوں پر اس حد تک قناعت کرے جو اس کی مشغولیت میں مانع نہ بنیں' اور یہ صورت صرف اللہ ہی کے فضل و کرم اور اس کی بخشی ہوئی قوت و طاقت سے میسّر آتی ہے۔

لوگوں کی چار قسمیں : جو لوگ اس حقیقی ریاضت تک نہ پہنچ سکیں انہیں اس سے قریب تر درجات تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے۔ اس سلسلے میں چار طرح کے لوگ ہیں کچھ وہ ہیں جن کا دل اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مستغرق رہتا ہے معیشت کی ضرورت مستثنیٰ کرکے دنیا کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوتی' یہ لوگ صدّیقین کے زمرے میں ہیں' مگر یہ درجہ بلند طویل ریاضت' اور ایک عرصے تک شہوات ترک کئے رکھنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جن کے قلوب ہر لمحہ ہر آن دنیا میں ڈوبے رہتے ہیں' اللہ کا ذکر کرتے بھی ہیں تو بطورِ حدیثِ نفس کے کرتے ہیں' یعنی صرف زبان پر ذکر آتا ہے' دل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ لوگ زمرۂ ہالکین (ہلاک ہونے والوں) میں داخل ہیں۔ تیسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو دین اور دنیا دونوں میں مشغول ہیں' لیکن قلب پر غلبہ دین کا ہے' یہ لوگ دوزخ میں ضرور جائیں گے لیکن جتنا دین ان کے قلب پر غالب ہوگا اسی قدر جلد انہیں عذاب سے نجات مل جائے گی' چوتھی قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جنہیں دین اور دنیا دونوں نے مشغول کر رکھا ہے لیکن ان کے دلوں پر دین کی بجائے دنیا غالب ہے یہ لوگ دوزخ میں زیادہ دیر تک رہیں گے' بالآخر سزا بھگتنے کے بعد باہر آجائیں گے۔ کیونکہ اگرچہ ان کے دلوں پر دنیا غالب تھی لیکن وہ دین سے بھی محروم نہیں تھے' خدا کے ذکر کی قوت ان کی نجات کا باعث بنے گی' اے اللہ! تو ہی ہماری حفاظت کرنے والا ہے' ہمیں ذلّت و رسوائی بچا۔

مباحات سے لذّت : بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ جائز چیزوں سے لذّت حاصل کرنا جائز ہے' اس صورت میں خدا سے دوری کس طرح ہوگی۔ ان لوگوں کا یہ خیال غلط ہے' اصل حقیقت ان لوگوں پر منکشف ہوئی ہے جنہوں نے دنیا کی محبت کو تمام گناہوں کی جڑ کہا ہے' اور جن کے خیال میں تمام نیک اعمال اس محبت سے ضائع چلے جاتے ہیں ضرورت سے زائد مباح چیز مباح ہونے کے باوجود دنیا میں شامل ہے' اور آدمی کو اس کے خالق سے دور کرتی ہے۔ ابراہیم خواص کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ کوہ لکام پر مقیم تھا' میں نے وہاں ایک درخت پر انار دیکھے' کھانے کو دل چاہا' اور ایک انار توڑ لیا' اسے توڑ کر کھایا تو کھٹا تھا پھینک کر آگے بڑھ گیا' راستے میں ایک شخص ملا' اس کے جسم پر بھڑیں لپٹ رہی تھیں' اس نے مجھے دیکھا تو آواز دی اے ابراہیم! میں نے حیرت سے کہا تو کون ہے اور مجھے کیسے جانتا ہو؟ اس نے کہا جو خدا کو پہچانتا ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں رہتی' میں نے کہا آپ خدا رسیدہ بزرگ ہیں' اپنے لیے دعا کیوں نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان بھڑوں کی اذیت سے نجات دے دے' کہنے لگا: تم بھی تو خدا رسیدہ بزرگ ہو' تم نے کیوں نہ یہ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ میرے دل سے انار کی خواہش نکال دے۔ بھڑوں کی تکلیف دنیا تک ہے' شہوت کی اذیت تو مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑے گی' مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور آگے بڑھ گیا۔ سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ چالیس سال سے میرا دل چاہتا ہے کہ کھجور کے شیرے میں روٹی تر کرکے کھاؤں' لیکن میں نے اپنے دل کی بات نہیں مانی۔

مباحات سے اجتناب: بہرحال نفس کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے مباحات کی لذّت سے نہ روکا جائے اس لیے کہ آدمی مباحات کی لذّت سے تجاوز کرکے محظورات میں مبتلا ہوجاتا ہے' مثلاً اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس کی زبان غیبت اور فضول گوئی میں ملوّث نہ ہو تو اسے ذکر الٰہی' اور دینی ضروریات سے متعلق ہی کوئی کلمہ زبان سے نکالنا چاہیے' باقی معاملات میں اگرچہ وہ جائز ہی ہوں سکوت اختیار کرے یہاں تک کہ کلام کی شہوت ختم ہوجائے' اور زبان حق کی عادی ہوجائے اس صورت میں بولنا بھی عبادت ہوگا اور خاموش رہنا بھی عبادت ہوگا' یہی حال آنکھ کا ہے اگر وہ ہر اچھی چیز دیکھنے کی عادی ہے تو کسی دن بُری چیز بھی دیکھے گی' اسی پر باقی شہوتیں قیاس کی جاسکتی ہیں' اس لیے کہ جس چیز سے حلال کی شہوت ہوتی ہے اسی سے حرام کی خواہش جنم لیتی ہے۔ اس اعتبار سے شہوت ایک ہے' اور اسے حرام سے روکنا واجب ہے' اگر کوئی شخص قدر ضرورت پر اکتفا کرنے کا عادی نہ ہوا تو اس پر شہوت غالب آجائے گی' اور یہ شہوت جس کا تعلق ابتدا میں حلال سے تھا' حرام تک تجاوز کرے گی مباحات کی یہ ادنیٰ آفت ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدّد آفات ہیں' ان میں سے ایک آفت یہ ہے کہ نفس دنیا کی لذّتوں سے خوش ہوتا ہے ان لذّتوں میں وہ اپنے لیے سکون تلاش کرتا ہے' اور ان کے نشے میں اس قدر مدہوش ہوجاتا ہے کہ اسے اپنی بھی خبر نہیں رہتی یہ خوشی اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی مدہوشی اس کے لیے زہر قاتل ہے' یہ زہر قاتل اس کے رگ وپے میں پھیل جاتا ہے' اس کے دل سے اللہ کا ذکر' آخرت کے احتساب کا خوف' اور قیامت کے ہولناک مناظر کا تصوّر نکال دیتا ہے' اسی کیفیت کو قلب کی موت سے تعبیر کیا جاتا ہے' قرآن کریم کی متعدّد آیات میں دنیا کی مذمّت موجود ہے۔

وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا (پ ۱۱ ر ۶ آیت ۷)

اور وہ دُنیوی زندگی پر راضی ہوگئے ہیں اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں۔

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ (پ ۱۳ ر ۹ آیت ۲۶)

اور یہ دُنیوی زندگی آخرت کے مقابلے میں بجز ایک متاعِ قلیل کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔

اِعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ (پ ۲۷ ر ۱۹ آیت ۲۰)

تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو ولعب' زینت' ایک دوسرے پر باہم فخر کرنا اور اموال و اولاد میں ایک دوسرے سے زیادہ بتلانا ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے سلامتی اور حفاظت کے خواستگار ہیں۔

نفس کی تادیب: بعض اربابِ قلوب نے اپنے دلوں کی آزمائش کی تو دنیاوی لذّات کی خوشی میں انہیں سرکش' نافرمان اور ذکر الٰہی سے معترض پایا۔ اور غم کی حالت میں مطیع' صاف' اور ذکر الٰہی سے متأثر پایا۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دائمی حُزن کی حالت' اور خوشی کے اسباب سے دوری ہی باعث نجات ہے' چنانچہ انہوں نے اپنے نفسوں کو تمام شہوات پر صبر کرنے کا عادی بنایا خواہ وہ شہوات حلال ہوں یا حرام۔ وہ یہ بات جانتے تھے کہ جائز خواہشات کا حساب لیا جائے گا' اور ناجائز خواہشات پر عذاب دیا جائے گا' اور مشتبہ خواہشات باعثِ عتاب ہوں گی' عذاب کھلا ہوا عذاب ہے' حساب اور عتاب بھی عذاب ہی کی قسمیں ہیں' قیامت کے میدان میں جس شخص سے حساب لیا جائے گا اسے گویا ایک نوع کے عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔ ان بزرگوں نے حلال سے اجتناب کرکے اپنے نفسوں کو حساب کے عذاب سے بچانے کی کوشش کی ہے' اور انہیں شہوتوں کی قید و گرفت سے نکال کر دائمی حریت اور دونوں جہانوں کی بادشاہت دی ہے۔ یہ لوگ ذکر الٰہی کے اِشتغال سے اُنس حاصل کرتے ہیں اور اطاعت کا عادی بنانے کے لیے اپنے نفسوں کے ساتھ وہ معاملہ کرتے ہیں جو باز کو مؤدّب بنانے کے لیے کیا جاتا ہے' یعنی اوّلاً اسے تاریک کمرے میں

رکھا جاتا ہے' اور اس کی آنکھیں سی دی جاتی ہے' تاکہ وہ فضا میں پرواز کرنے کا عادی نہ رہے' پھر اسے گوشت کھلا کر مانوس کیا جاتا ہے تاکہ اپنے آقا کو پہچان لے' اور اس کی آواز پر دوڑا چلا آئے' یہی حال نفس کا ہے' نفس اس وقت تک اپنے رب سے مانوس نہیں ہوتا جب تک کہ اسے خلوت و عزلت کے ذریعہ اس کی عادتوں سے لاتعلق نہ بنایا جائے' کان کی غیر ضروری بات سننے سے' آنکھ کی غیر ضروری چیز دیکھنے سے اور زبان کی غیر ضروری لفظ ادا کرنے سے حفاظت نہ کی جائے۔ اس مرحلے سے گذرنے کے بعد نفس کو ذکر و ثناء کی غذا دی جاتی ہے تاکہ اسے اپنے آقا و مالک سے اُنس ہو جائے' اور دنیا کے تمام علائق منقطع ہو جائیں' یہ مرید کے نفس پر شاق گذرتے ہیں' لیکن جب مسلسل ریاضت کی ذریعہ نفس عادی ہو جاتا ہے تو اسی خلوت میں اس کی لذت' اور اسی لاتعلقی میں اسکی دل چسپی کا سامان پیدا ہو جاتا ہے' اس سلسلے میں مرید کی مثال اس بچے کی سی ہے جس کا دودھ چھڑا دیا جائے' شروع شروع میں وہ دودھ سے محرومی پر خوب روتا ہے' کیونکہ دو سال سے دودھ ہی غذا تھی' اب اچانک وہ اس غذا سے محروم کر دیا گیا ہے' اس لیے روتا بھی ہے' ضد بھی کرتا ہے' نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے' لیکن آہستہ آہستہ وہ دوسری غذا لینے لگتا ہے' یہاں تک کے ماں کے دودھ کا تصور بھی باقی نہیں رہتا' وہی کھانا جس سے اسے نفرت تھی اچھا لگنے لگتا ہے یہی حال سواری کے جانور کا ہے' ابتدا میں اس پر زین کسنا' لگام پہنانا اور سواری کرنا بہت زیادہ مشکل ہے' جانور اپنے سوار کو پریشان کرتا ہے لیکن اگر سوار ہوشیاری سے کام لے اور اسے عادی بنا دے تو اس کی سرکشی اطاعت میں بدل جاتی ہے' پہلے اسے زنجیروں اور رسیوں میں قید کیا جاتا ہے' مگر رفتہ رفتہ وہ ایسا مؤدّب ہو جاتا ہے کہ جس جگہ سوار اسے چھوڑ دے وہاں سے ہلتا بھی نہیں ہے خواہ بندھا ہوا ہو یا نہ ہو' بہر حال جس طرح چوپایوں اور پرندوں کی تأدیب و تربیت کی جاتی ہے اسی طرح نفس کی تأدیب بھی کی جاتی ہے' نفس کی تادیب یہ ہے کہ اسے دنیا کی نعمتوں اور لذّتوں سے خوش ہونے' انہیں دیکھنے اور استعمال کرنے سے منع کیا جائے' اور ہر اس چیز سے روکا جائے جو مرنے کے بعد ساتھ نہ دیں' اور اسے بتلایا جائے کہ ایسی چیزوں سے محبت کرنے سے کیا فائدہ جو آخرت تک ساتھ نہ دے سکیں' اور راستے کی کسی منزل پر داغِ مفارقت دے جائیں جب نفس کو اس حقیقت کا یقین ہو جائے گا کہ دنیا کی ہر چیز خواہ وہ کتنی ہی محبوب کیوں نہ ہو جدا ضرور ہوگی تو وہ ان عارضی اور غیر ثابت چیزوں سے دل لگانے کے بجائے دائمی اور پائیدار چیزوں سے دل لگائے گا یعنی ذکر الٰہی سے تعلق رکھے گا جو قبر میں بھی ساتھ رہے گا' اور اس کی وحشتوں کو دور کرے گا۔ لیکن نفس کو یہ یقین چند روز کے صبر کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے دنیاوی زندگی آخرت کی زندگی کے اعتبار سے چند روزہ ہے' ہمیں کوئی عقلمند ایسا نہیں ملتا جو حضر کی دائمی راحت کی خاطر سفر کی چند روزہ مشقت انگیز نہ کرے' یا مہینوں اور برسوں تک سکون کی زندگی بسر کرنے کے لیے زندگی کے چند ماہ و سال کسی ہنر کے حصول میں صرف نہ کرنے پر راضی ہو' دیکھا جائے تو ابدالآباد کے مقابلے میں دنیا کی زندگی اتنی بھی نہیں جتنی تمام عمر کے مقابلے میں ایک دن' جب اس چند روزہ زندگی کے لیے مشقتیں برداشت کی جاتی ہیں' اذیتیں سہی جاتی ہیں اور تکلیفیں اُٹھائی جاتی ہیں تو دائمی زندگی کے لیے یہ مشقتیں اور مصیبتیں کیوں نہیں برداشت کی جائیں گی؟

مجاہدے اور ریاضت کا طریقہ: مجاہدے اور ریاضت کا طریقہ ہر شخص کے لیے الگ الگ ہے' بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ہر شخص کو اس کے مزاج کے مطابق مجاہدہ اور ریاضت کا طریقہ بتایا جاتا ہے' لیکن اتنی بات سب کے حق میں یکساں ہے کہ دنیاوی اسباب میں سے جس شخص کو جس چیز سے خوشی ہوتی ہے اس سے اپنا تعلق منقطع کر لے مثلاً جو لوگ مال اور جاہ سے خوش ہوتے ہوں وہ مال اور جاہ کی محبت دل سے نکال دیں' جو لوگ اپنی خوش بیانی اور وعظ کی تاثیر سے خوش ہوں وہ اس کا خیال ترک کر دیں' جو ریاست و حکومت' عزّت اور تلامذہ کی کثرت سے خوش ہوں وہ اپنے دل کو ان خواہشات سے خالی کر لیں۔ اگر وہ ان چیزوں کے نہ ملنے سے ناراض ہوں یا غمزدہ اور متفکر نظر آئیں تو یہ سمجھ لو کہ قرآن کریم نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق یہ اعلان کیا ہے۔

وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا (پ ۱۱ ر ۶ آیت ۷)

اور وہ دنیاوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں۔

دنیا کے یہ اسباب مرید کے حق میں زہر قاتل ہیں' ان اسباب سے لاتعلقی اختیار کرنے کے بعد عزلت اختیار کرلینی چاہئے' اور لوگوں سے الگ ہوکر اپنے دل کی نگرانی کرنی چاہئے تاکہ وہ ہر لمحہ اللہ کے ذکر اور فکر میں مشغول رہے' اور ان تمام خواہشات اور شہوات اور وساوس پر نظر رکھے جو اس کے ذکر و فکر میں مخل ہوں' ان خواہشات اور شہوات اور وساوس کا ازالہ اس طرح کرے کہ ان کی جڑیں ختم کردے یا ان اسباب کا قلع قمع کرے جو وساس اور شہوات کے ظہور کا باعث بنتے ہیں' زندگی بھر مراقبہ و احتساب اور ازالہ و استیصال کا یہ عمل جاری رکھے نفس کا مجاہدہ موت ہی پر ختم ہوتا ہے۔

خوش خلقی کی علامات

بعض وہ لوگ جو اپنے عیوب سے ناواقف ہیں معمولی مجاہدے ہی کو اپنے سفر کی آخری منزل سمجھ لیتے ہیں' اور فواحش و منکرات سے بچنے ہی کو سلوک کی معراج تصور کرلیتے ہیں' اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ ہم نے اپنے نفس کی تہذیب کرلی ہے' اخلاق اچھے بنالئے ہیں۔ اب ہمیں نہ کسی مجاہدے کی ضرورت ہے' اور نہ سلوک و ارادت کی راہ میں کسی تگ و دو کی حاجت ہے۔ ایسے لوگوں کی خوش فہمی دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم حسن اخلاق کی علامات بیان کریں ایسے لوگوں کو مختصراً اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ خوش خلقی ایمان ہے اور بد خلقی نفاق ہے قرآن کریم میں مؤمنین اور منافقین کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں' یہ سب خوش خلقی اور بد خلقی کے نتائج و ثمرات ہیں' ذیل میں ہم مؤمنین کی صفات پر مشتمل کچھ آیات بیان کرتے ہیں:۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ (پ ۱۸ آیت ۱۔۱۰)

بالتحقیق ان مسلمانوں نے آخرت میں فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں اور جو لغو باتوں سے برکنار رہنے والے ہیں' اور جو اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں' اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت رکھنے والے ہیں' لیکن اپنی بیبیوں سے یا اپنی (شرعی) لونڈیوں سے (حفاظت نہیں کرتے) کیوں کہ ان پر اس میں کوئی الزام نہیں ہے۔ ہاں جو اس کے علاوہ اور جگہ (شہوت رانی) کا طلب گار ہو' ایسے لوگ حد (شرعی) سے نکلنے والے ہیں اور جو اپنی (سپردگی میں لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہدوں کا خیال رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں (پس) ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا:۔

اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (پ ۱۱ ر ۳ آیت ۱۱۲)

اور ایسے ہیں جو گناہوں سے توبہ کرنے والے ہیں اور (اللہ کی) عبادت کرنے والے ہیں اور حمد کرنے والے اور روزہ رکھنے والے رکوع کرنے والے (اور) سجدہ کرنے والے نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے اور بری باتوں سے باز رکھنے والے اور اللہ کی حدوں (یعنی احکام کا) خیال رکھنے والے ہیں اور ایسے مؤمنین کو آپ

خوشخبری سنا دیجئے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا ۝ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا۔ (اِلٰی اٰخِرِ السُّوْرَۃ) (پ ۱۹ ر ۴ آیت ۶۳-۶۴)

اور حضرت رحمٰن کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین میں عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب ان سے جہالت والے لوگ (جہالت کی) بات کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات کرتے ہیں' اور جو راتوں کو اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام یعنی نماز میں لگے رہتے ہیں (سورت کے آخرت تک)

یہ آیات معیار ہیں : جس شخص پر اپنا حال مشتبہ ہو جائے اسے ان آیات کی روشنی میں اپنا جائزہ لینا چاہئے' ان اوصاف کی موجودگی حسن خلق کی علامت ہے' اور ان کا فقدان بد خلقی کی علامت ہے' اگر کسی شخص میں بعض اوصاف موجود ہیں اور بعض مفقود ہیں تو موجود اوصاف کی حفاظت کرے اور جو اوصاف موجود نہیں ہیں ان کے حصول کے لیے جدوجہد کرتا رہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمنین کے بیشمار اوصاف بیان کئے ہیں اور ان سب سے محاسنِ اخلاق کی طرف اشارہ فرمایا ہے' ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:۔

لا یؤمن احدکم حتّٰی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ (بخاری و مسلم۔ انسؓ)

کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ (بخاری و مسلم۔ ابو شریح خزاعی)

جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے اپنے مہمان کا اکرام کرنا چاہئے۔

ایک روایت میں فلیکرم جارہ (اپنے پڑوسی کا اکرام کرنا چاہئے) کے الفاظ ہیں۔ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ) ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:۔

فلیقل خیرا او لیصمت (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

اسے چاہیے کہ وہ کلمہ خیر کہے یا خاموش رہے

ایک جگہ اچھے اخلاق کے حامل شخص کو مؤمن قرار دیا ہے' فرمایا:

اکمل المؤمنین ایمانا احسنھم اخلاقا (۱)

مؤمنوں میں ایمان کے اعتبار سے زیادہ کامل شخص وہ ہے جو اخلاق میں سب سے زیادہ اچھا ہے۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:۔

اذا رأیتم المؤمن صموتا وقورا فادنوا منہ فانہ یلقی الحکمۃ (ابن ماجہ۔ ابو خلاد)

جب تم مؤمن کو خاموش اور باوقار دیکھو تو اس کے قریب ہو جاؤ اس لیے کہ وہ حکمت سکھاتا ہے۔

ارشاد فرمایا:۔

من سرتہ حسنتہ وساءتہ سیئتہ فھو مؤمن (احمد' طبرانی' حاکم۔ ابو موسیٰ اشعریؓ)

جس شخص کو اپنی نیکی اچھی اور برائی بری معلوم ہو وہ شخص مؤمن ہے۔

---

(۱) یہ روایت ایک سے زائد بار گذر چکی ہے۔

اور فرمایا:

لا یحل لمؤمن ان ینظر الی اخیہ بنظرۃ تؤذیہ (ابن المبارک فی الزہد)

کسی مؤمن کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کی طرف تکلیف دہ نظر سے دیکھے۔

نیز فرمایا:۔

لا یحل لمسلم ان یروع مسلما

کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو جھڑکے۔

یہ بھی فرمایا:۔

انما یتجالس المتجالسان بامانۃ اللہ عزوجل فلا یحل لاحدھما ان یفشی علی(۱)

دو ہم نشیں خدا تعالیٰ کی امانت پر ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں' اس لیے کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کی کوئی ایسی بات (دوسروں پر) ظاہر کرے جس کا (ظاہر کرنا) اسے ناپسند ہو۔

بعض لوگوں نے اچھے اخلاق کی یہ علامات بیان کی ہیں کہ آدمی باحیا ہو لوگوں کو اذیت نہ پہنچاتا ہو' نیک اور پاکباز ہو' زبان کا سچا ہو' کثیر العمل ہو' لغزش کم کھاتا ہو' لغو گوئی سے دور ہو' باوقار' صابر' شاکر' بُردبار' مشفق اور خندہ رو ہو' بدگو چغل خور' جتلانے غیبت' جلد باز' کینہ پرور' بخیل اور حاسد نہ ہو' اللہ کے لیے بغض رکھتا اور اللہ کے لیے محبت کرے' ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مؤمن اور منافق کی علامات دریافت کی گئیں تو آپ نے ارشاد فرمایا:۔

ان المؤمن ھمتہ فی الصلاۃ والصیام والعبادۃ والمنافق ھمتہ فی الطعام والشراب کالبھیمۃ(۲)

مؤمن کی ہمت نماز' روزہ اور عبادت میں ہوتی ہے اور کافر کی ہمت چوپائے کی طرح کھانے پینے میں ہوتی ہے۔

اکابر کے اقوال: حاتم اصم فرماتے ہیں کہ مؤمن فکر اور عبرت میں مشغول رہتا ہے اور منافق حرص' اور طولِ اَمل میں مبتلا رہتا ہے مؤمن اللہ کے علاوہ ہر شخص سے مایوس ہے' اور کافر اللہ کے علاوہ ہر شخص سے امیدیں وابستہ کرلیتا ہے' اور مؤمن اللہ کے علاوہ ہر شخص سے بے خوف ہے' جب کہ کافر منافق اللہ کے علاوہ ہر شخص سے خوف زدہ ہے مؤمن اپنا دین فروخت نہیں کرتا مال اور جان قربان کردیتا ہے جب کہ منافق مال کے سامنے دین کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ مؤمن نیک عمل کرنے کے بعد بھی روتا ہے' جب کہ منافق گناہوں کے باوجود مسکراتا ہے' مؤمن خلوت اور عزلت کو پسند کرتا ہے' منافق کو ہنگامے اور جلوتیں اچھی لگتی ہیں' مؤمن بیج بوتا ہے لیکن اس کے انجام سے ڈرتا ہے' کافر کھیتی نہیں کرتا' بلکہ اسے ضائع کردیتا ہے لیکن توقعات اچھی رکھتا ہے' مؤمن امر و نہی کا فریضہ ادا کر کے مخلوق کی اصلاح کرتا ہے' اور منافق شر پھیلاتا ہے' حسن خلق کی پہلی آزمائش یہ ہے کہ دوسروں کی بدخلقی پر صابر رہے' اگر کوئی شخص کسی کی بدخلقی کا شاکی نظر آئے تو یہ سمجھ لو کہ وہ خود بداخلاق ہے' حسن خلق نام ہی ایذا پر صبر اور جفا کے تحمل کا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک روز سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک موٹی نجرانی چادر اوڑھے ہوئے کہیں تشریف لے جارہے تھے آپ کے ہمراہ حضرت انسؓ تھے' راستے میں ایک اعرابی ملا' اور اس نے آپ کی چادر کا کنارہ پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ آپ کی گردن مبارک پر چادر کا حلقہ تنگ ہوگیا' اعرابی نے آپ سے پوچھا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) یہ روایت کتاب الصحبۃ میں گذر چکی ہے۔ (۲) اس روایت کی کوئی اصل مجھے نہیں ملی۔

تمہارے پاس خدا کا جو مال ہے اس میں سے مجھے بھی دو' آپ نے اس کی طرف دیکھا' مسکرائے اور اسے کچھ دینے کا حکم فرمایا (بخاری و مسلم' بروایت انس) جب قریش نے آپ کو بہت زیادہ ستایا اور مار پیٹ بھی کی تو آپ نے شکایت کی بجائے یہ دعا فرمائی:۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (ابن حبان' بیہقی۔ سہل بن سعدؓ)

اے اللہ! میری قوم کو معاف کر دیجئے' اس لیے کہ یہ لوگ جانتے نہیں ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے یہ دعا جنگ اُحد کے موقع پر فرمائی تھی۔ آپ کے انہی اخلاقِ حسنہ کی بنا پر قرآن کریم نے یہ جامع تعریف فرمائی:۔

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ

اور بے شک آپ بڑے اخلاق پر (پیدا ہوئے) ہیں۔

روایت ہے کہ حضرت ابراہیم ابن ادہمؒ ایک روز جنگل کی طرف گئے' وہاں انہیں ایک سپاہی ملا' سپاہی نے ان سے پوچھا کہ کیا تو بندہ (غلام) ہے' انہوں نے جواب دیا ہاں' اس نے آبادی کا پتا دریافت کیا' آپ نے قبرستان کا راستہ بتلا دیا' اس نے غصہ سے کہا کہ میں آبادی کا پتا معلوم کر رہا ہوں اور تم قبرستان کا پتا بتلا رہے ہو' فرمایا: قبرستان ہی آبادی ہے' یہ سن کر سپاہی بہت زیادہ مشتعل ہوا اور اس نے کوڑے سے اتنا مارا کہ سر سے خون بہنے لگا' اسی حالت میں وہ انہیں پکڑ کر شہر میں لے آیا' لوگوں کے دریافت کرنے پر سپاہی نے تمام واقعہ بتلایا' لوگوں نے کہا یہ ابراہیم بن ادہم ہیں۔ سپاہی یہ سن کر گھوڑے سے اتر پڑا اور ابن ادہم کے ہاتھ پاؤں چومنے لگا' اور معافی مانگنے لگا' بعد میں لوگوں نے حضرت ابراہیم سے پوچھا کہ آپ نے سپاہی کو دریافت کرنے پر یہ کیوں کہا تھا کہ میں بندہ ہوں فرمایا: اس نے یہ نہیں معلوم کیا تھا کہ تو کس کا بندہ ہے بلکہ یہ پوچھا تھا کہ کیا تو بندہ ہے اور کیوں کہ میں واقعتہً بندہ ہوں اس لیے میں نے اعتراف کر لیا' جب اس نے مجھے زدو کوب کیا تو میں نے اس کے لیے جنت کی دعا مانگی۔ لوگوں نے کہا اس نے آپ پر ظلم کیا تھا۔ فرمایا: مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے اس کے ظلم پر صبر کیا تو مجھے ثواب ملے گا میں نے سوچا یہ بات کچھ اچھی نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے مجھے تو ثواب ملے اور اسے عذاب ہو۔ ابو عثمان خیری کو کسی شخص نے دعوت کے بہانے سے اپنے گھر بلایا' جب آپ اس کے گھر تشریف لے گئے تو اس نے کہا کہ اس وقت تو میں کچھ بھی انتظام نہ کر سکا' آپ واپس چلے آئے' تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ وہ شخص بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ اس وقت جو کچھ گھر میں موجود ہے اسی پر قناعت کر لیجئے' آپ دوبارہ اس کے ساتھ چل دیئے اس بار بھی اس نے معذرت کر دی' کئی بار ایسا ہی ہوا' لیکن آپ نے بُرا نہیں مانا' نہ پیشانی پر شکن آئی اور نہ لب پر شکوہ آیا۔ آخر وہ شخص خود شرمندہ ہوا اور پاؤں میں پڑ گیا اور کہنے لگا کہ میں نے آپ کو آزمانا چاہا تھا' سبحان اللہ! آپ کے اخلاق کتنے عظیم ہیں' فرمایا تم میرے جس خلق کی تعریف کر رہے ہو یہ تو کتے میں بھی ہے کہ جب تم اسے بُلاتے ہو چلا آتا ہے' اور جب دور بھگاتے ہو بھاگ جاتا ہے ان ہی بزرگ کا واقعہ ہے کہ ایک روز کسی گلی سے گذر رہے تھے' اوپر سے کسی نے ان کے اوپر راکھ ڈال دی' آپ سواری سے اُترے اور حق تعالیٰ کے حضور میں سجدہ شکر ادا کیا' کپڑوں سے راکھ جھاڑی' اور آگے بڑھ گئے' لوگوں نے کہا کہ اس مُوذی کو کچھ تو کہئے جس نے آپ پر راکھ ڈالی ہے' فرمایا: جو شخص آگ کا مستحق ہے اگر اس پر راکھ گر جائے تو اسے غصہ نہ کرنا چاہئے۔ حضرت علی بن موسیٰ رضا کا رنگ سانولا تھا کیونکہ ان کی والدہ حبشی تھیں' آپ کے دروازے پر ایک حمام تھا' جب حمام میں تشریف لے جاتے تو آپ کے لیے حمام خالی کر دیا جاتا تھا' ایک روز آپ حمام میں گئے' حمامی کہیں گیا ہوا تھا' اتنے میں ایک شخص آیا' اس نے یہ سمجھا کہ آپ حمام کے خادم ہیں' وہ کپڑے اُتار کر حمام میں چلا گیا' اور انہیں حکم دینے لگا کہ یہ کر وہ کر' آنے والا جو کچھ کہتا رہا' آپ کرتے رہے' اتنے میں حمامی آگیا' اس نے یہ صورت حال دیکھی تو ڈر کر بھاگ گیا' آپ حمام سے باہر آئے' لوگوں نے انہیں بتلایا کہ حمامی آپ کے خوف سے چلا گیا ہے' فرمایا: اس میں بیچارے حمامی کا کیا قصور' قصور تو اس شخص

کا ہے جس نے اپنا نُطفہ حبشن کے حوالے کیا۔ ابو عبداللہ خیاطؒ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ دکان پر بیٹھ کر کپڑے سیتے تھے۔ ایک مجوسی جو آپ سے کینہ رکھتا تھا اپنے کپڑے ان سے سلواتا اور اُجرت میں کھوٹے سکے دیتا' آپ انہیں لے لیتے نہ واپس کرتے اور نہ اسے بتلاتے کہ تو نے کھوٹے سکے دیئے ہیں' ایک روز وہ اُجرت دینے کے لیے آیا تو دکان پر آپ کا ایک شاگرد بیٹھا تھا' مجوسی نے حسبِ معمول کھوٹے سکے دیئے اور اپنے کپڑے طلب کیے' شاگرد نے کھوٹے سکے واپس کردیئے اور کپڑا دینے سے انکار کردیا' ابو عبداللہ آئے تو شاگرد نے انہیں واقعہ بتلایا۔ آپ نے فرمایا تو نے بُرا کیا' یہ مجوسی ایک سال سے یہی معاملہ کرتا رہا ہے اور میں خاموشی سے یہ سکے لے کر کنویں میں ڈال دیتا ہوں تاکہ وہ کسی مسلمان کو دھوکا نہ دے سکے' یوسف ابن اسباطؒ فرماتے ہیں کہ حسن خلق کی دس علامتیں ہیں مخالفت کم کرنا' حسن انصاف سے کام لینا' انتقام نہ لینا' برائیوں سے نفرت کرنا' معذرت قبول کرلینا' نفس کو ملامت کرنا' دوسروں کے بجائے اپنے عیوب پر نظر رکھنا' چھوٹے بڑے ہر شخص کے ساتھ خندہ روئی سے پیش آنا' ہر ادنیٰ و اعلیٰ سے نرم گفتگو کرنا۔ کسی شخص نے سہل تستری سے دریافت کیا کہ حسن خلق کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کسی سے انتقام نہ لے اِیذا برداشت کرے' ظالم پر رحم کرے اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کرے۔ احنف بن قیسؒ سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے حِلم کس سے سیکھا ہے؟ انہوں نے جواب دیا قیس بن عاصم سے۔ سائل نے ان کے حِلم کا واقعہ دریافت کیا' فرمایا ان کی ایک باندی ایک سیخ لے کر آئی جس پر کباب بن رہے تھے' اور باندی کے ہاتھ سے سیخ چھوٹ کر قیس بن عاصم کے ایک بچے پر گر پڑی' بچہ گرم سیخ کی تکلیف برداشت نہ کرپایا اور مرگیا' باندی اس واقعہ سے بہت گھبرائی' قیس نے اس سے کہا کہ کچھ غم نہ کر' میں نے تجھے اللہ کے لیے آزاد کردیا' حضرت اویس قرنی کی حالت یہ تھی کہ محلے کے بچے ان پر پتھروں کی بارش کیا کرتے تھے' آپ ان سے کہتے بچو! اگر مارنا اتنا ہی ضروری ہے تو چھوٹے چھوٹے پتھر مارو تاکہ میرے پاؤں سے خون نہ نکلے اور نماز میں کوئی حرج ہو۔ احنف بن قیسؒ کو ایک شخص نے گالیاں دیں' آپ نے کوئی جواب نہیں دیا' اور آگے بڑھ گئے' وہ شخص بھی پیچھے پیچھے گالیاں بکتا ہوا چلا' آپ اپنے محلے کے قریب پہنچ کر رک گئے اور اس سے کہنے لگے! اے شخص جو کچھ گالیاں باقی ہیں وہ بھی یہیں دے لے ایسا نہ ہو کہ تیری گالیاں سن کر محلے والے مشتعل ہوجائیں اور تجھے ایذا پہنچائیں۔ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے اپنے کسی غلام کو آواز دی' اس نے کوئی جواب نہیں دیا آپ نے دوبارہ بُلایا تب بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا' تیسری آواز میں بھی اس نے جُنبش نہیں کی' آپ خود اُٹھ کر اس کے پاس تشریف لے گئے' دیکھا کہ لیٹا ہوا ہے' آپ نے فرمایا: میں نے تجھے تین مرتبہ بُلایا' کیا تو نے میری آواز نہیں سنی تھی' کہنے لگا سنی تھی لیکن میں نے سوچا کہ آپ جواب نہ دینے پر خفا تو ہوں گے نہیں اس لیے سُستی کرگیا' آپ نے فرمایا: جا میں نے تجھے اللہ کے لیے آزاد کردیا۔ مالک بن دینارؒ کو کسی شخص نے ریاکار کہہ کر آواز دی' آپ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ تو نے یہ نام خوب ایجاد کیا ہے' اہل بصرہ اسے بھول گئے تھے' یحییٰ بن زیاد کے پاس ایک تند خو' بد مزاج غلام تھا' لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ اسے اس کی تند خوئی اور بد مزاجی کے باوجود رکھتے کیوں ہیں' فرمایا: تاکہ میں اس سے حِلم سیکھوں۔

ان واقعات سے پتا چلتا ہے کہ ان بزرگوں کے نفوس مسلسل ریاضت کی وجہ سے اعتدال پر آگئے تھے' اور فریب' خیانت' کینہ اور حسد وغیرہ کے عیوب سے پاک ہوگئے تھے' وہ ہر حال میں اللہ کی تقدیر پر راضی و شاکر تھے' آدمی کے نفس کا اس درجہ تک پہنچنا ہی حسن خلق کا اعلیٰ معیار ہے' بد خلقی کی انتہا یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ناراض ہو' اور تقدیر کے خلاف نبرد آزما ہو۔

بہرحال حسن خلق کی یہ چند علامات ہیں' جس شخص کا باطن ان علامات سے خالی ہو اسے اس فریب میں مبتلا نہ ہونا چاہئے کہ وہ اچھے اخلاق کا حامل ہے' اس کا نفس بیمار ہے اسے ریاضت اور مجاہدے کے ذریعہ اپنے نفس کا علاج کرانا چاہئے تاکہ وہ حسن خلق کے اس اعلیٰ درجے پر فائز ہوسکے جو مقربین اور صدیقین کو حاصل ہے۔

بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے اخلاق کی تہذیب و تحسین

جاننا چاہیے کہ بچوں کی تعلیم اور ان کی اخلاقی تربیت ایک اہم فریضہ ہے بچہ والدین کے پاس اللہ کی امانت ہوتا ہے' اس امانت کی حفاظت ضروری ہے' اور یہ حفاظت اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ اسے ضائع ہونے سے بچایا جائے' بچے کا دل صاف ستھرا' رواج کے عیوب سے پاک' سادہ و معصوم' اور ایک قیمتی موتی کی طرح نازک اور گراں قیمت ہوتا ہے' نہ اس کی سطح پر کوئی نقش ہوتا ہے' نہ اس کے آئینے میں کوئی تصویر ہوتی ہے اس کی سطح پر جو نقش بھی کردیا جائے وہ اسے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے مثلاً اگر اسے خیر کی تعلیم دی جائے' اور نیک اعمال کا عادی بنایا جائے تو اس کی نشوونما خیر اور نیک اعمال پر ہوگی' وہ خود بھی دین و دنیا کی سعادتیں سمیٹے گا اور اس کے والدین اور معلمین بھی اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے' اسی طرح اگر اسے برائی کا عادی بنایا جائے اور جانوروں کی طرح اس سے لاپروائی برتی جائے نہ اسے کوئی اچھی بات بتلائی جائے نہ کسی خیر کی طرف رہنمائی کی جائے تو وہ شر کا عادی ہوجائے گا' خود بھی دنیا و آخرت کی شقاوتیں سمیٹے گا اور والدین بھی اپنی غفلت کی سزا بھگتیں گے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (پ ۲۸ ر ۱۹ آیت ۶)

اے ایمان والو تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ۔

جب ماں باپ اپنے بچوں کو دنیا کی آگ سے بچاتے ہیں تو آخرت کی آگ سے بچانا بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے' آخرت کی آگ سے حفاظت کا طریقہ یہ نہیں کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا جائے' اس کے لیے ضروری ہے کہ بچے کو ادب سکھلایا جائے' اسکے اخلاق کی تہذیب و تحسین کی جائے' اسے بُری صحبت سے دور رکھا جائے' لذّت کوشی' آرام طلبی' اور تزئین و آرائش کی خواہش کو اس کی نظر میں حقیر بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ جادۂ حق پر گامزن رہے' اور ابدی ہلاکت سے محفوظ رہے۔

بچے کی تربیت روزِ اوّل ہی سے ضروری ہے' چنانچہ اس کی پرورش اور رضاعت کے لیے کوئی ایسی عورت متعیّن کی جائے جو نیک اور دیندار ہو' اور حلال رزق کھاتی ہو کیونکہ حرام غذا سے پیدا ہونے والے دودھ میں برکت نہیں ہوتی' حرام غذا سے پرورش پانے والا بچہ بڑا ہوکر خُبث اور بدی کی طرف مائل ہوتا ہے' جب بچے میں قوتِ تمیز اور شعور پیدا ہوجائے تو اس کی نگہداشت کی ضرورت پہلے سے بڑھ جاتی ہے' تمیز اور شعور کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب بچے میں حیا کا جوہر ظاہر ہوجائے' بچہ بعض افعال حیا کے باعث چھوڑ دیتا ہے' بعض امور کو بعض کی بہ نسبت بُرا جانتا ہے' اور بُرے افعال سے حیا کرنے لگتے ہے' بچے میں حیا کا ظہور اللہ تعالیٰ کی ایک اہم ترین نعمت ہے' اور ایک ایسی بشارت ہے جو اخلاق کے اعتدال اور قلب کے تزکیہ پر دلالت کرتی ہے' اور اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ بچہ بڑا ہوکر عقل میں کمال اور شعور میں پختگی حاصل کرے گا' حیادار بچے سے اعراض برتنا مناسب نہیں ہے' بلکہ اس کی حیاء کو اس کی تعلیم و تربیت کے باب میں مُعین و مددگار سمجھنا چاہیے۔

<u>ابتداء سے بچے کی تربیت کا طریقہ</u> : بچے پر سب سے زیادہ غلبہ کھانے کی خواہش کا ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے بچے کو کھانے کے آداب سکھلائے جائیں' اور اسے بتلایا جائے کہ کھانا دائیں ہاتھ سے کھائے' کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ کہے' اپنے سامنے سے کھائے' اگر کچھ لوگ ساتھ کھارہے ہوں تو ان سے پہلے کھانا شروع نہ کرے' کھانے کو گھور کر نہ دیکھے' نہ کسی کو کھاتے ہوئے گھورے' کھانے میں جلدی نہ کرے' اچھی طرح چبا کر کھائے' پے بہ پے لقمے نہ کھائے' اپنے ہاتھ ضرورت سے زیادہ نہ بھرے' نہ کپڑے خراب کرے۔ بچے کو کبھی کبھی روکھی روٹی بھی کھلانی چاہیے تاکہ کسی وقت سالن موجود نہ ہو تو پریشانی نہ اُٹھانی پڑے' بچے کے سامنے بسیار خوری کی مذمت کرنی چاہیے اور اسے بتلانا چاہیے کہ زیادہ کھانا بہائم کا شیوہ ہے' اچھے بچے زیادہ نہیں کھاتے' بچے کے سامنے ان بچوں کی تحسین کرتے رہنا چاہیے جو زیور ادب سے آراستہ ہیں' اور کم خور ہیں بچے کو اس کی تلقین بھی کرنی چاہیے کہ وہ کھانے کے معاملے میں ایثار سے کام لے' کم پر قناعت کرنے کی عادت ڈالے' کھانے کی

زیادہ پروانہ کرے' کھانا جیسا بھی ہو صبر و شکر سے کھائے' لڑکے کو سفید کپڑے پہننے کی عادت ڈالنی چاہیے' اسے بتلا دینا چاہیے کہ رنگین شوخ اور بھڑک دار کپڑے عورتیں پہنتی ہیں' مردوں کو اس طرح کا لباس زیب نہیں دیتا' جو لڑکے زنانہ لباس میں ملبوس نظر آئیں اپنے بچے کے سامنے ان کی برائی کرنی چاہیے اور ان کے لباس کی مذمت کرنی چاہیے' اپنے بچے کو ان لڑکوں کی صحبت و ہم نشینی سے بچائے جنہیں آرام طلبی کی عادت ہو' اور بھڑکیلے ریشمی کپڑے پہننے کا شوق ہو' ایسے لوگوں سے بھی اپنے بچے کو ملنے نہ دے جو اس کے دل میں اس طرح کے شوق کو تحریک دینے کا باعث بنیں۔

اگر ابتدا ہی سے بچے کی نگہداشت نہ کی جائے' اور اس کی اصلاح و تربیت پر خاص طور پر توجہ نہ دی جائے تو اس میں بے شمار برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں' اور جھوٹ حسد' چوری' چغل خوری' یا وہ گوئی' بے ہودہ ہنسی مذاق' اور لڑنے جھگڑنے کی عادتیں اپنا قبضہ جمالیتی ہیں۔ اس ابتدائی تربیت کا تعلق گھر سے ہے' اس کے بعد بچے کو مکتب میں بھیجنا چاہیے' تاکہ وہ کسی نیک اور ماہر استاذ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرسکے' اور اس سے قرآن کریم حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم' اکابر اولیاء اللہ کے واقعات' احوال اور حکایات کا علم حاصل کرے تاکہ اس کے دل میں صلحاء کی محبت پیدا ہو جائے' اور وہ ان کے نقش قدم پر چلنے لگے' بچے کو عشق و محبت کے فرسودہ مضامین پر مشتمل اشعار نہ پڑھنے دینے چاہئیں بلکہ ان لوگوں کے پاس بھی نہ بیٹھنے دینا چاہیے جو اس شاعری پر ظرافت اور خوش مذاقی کا ملمع کرتے ہیں' اور اسے فن سمجھتے ہیں' یہ فحش اور رکیک شاعری دلوں میں فساد کا بیج بوتی ہے' اور شر کے تخم کی آبیاری کرتی ہے۔ اگر بچہ کوئی قابل تعریف کام کرے مثلاً امتحان میں کامیاب ہو' یا کسی کے ساتھ حسن سلوک کرے' یا دیانت داری کی کسی آزمائش میں پورا اترے تو اسے انعام بھی دینا چاہیے' اس سے بچے میں اچھے اچھے کام کرنے کے جذبے کو تحریک ملتی ہے' انعام کے ساتھ لوگوں میں بچے کی تعریف بھی کرنی چاہیے' بعض اوقات قیمتی سے قیمتی انعام بھی اتنا مؤثر نہیں ہوتا' جتنا مؤثر تعریف کا ایک لفظ ہو جاتا ہے اگر بچے سے اتفاقاً کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور جانتا ہو کہ یہ غلطی اس کی عادت نہیں ہے بلکہ بچپن کے تقاضے سے ایسا ہو گیا ہے تو چشم پوشی سے کام لینا چاہیے' اور دوسرے لوگوں کے سامنے بھی اس کے راز سے پردہ نہ اٹھانا چاہیے' خاص طور پر اس وقت جب بچہ اپنی غلطی خود چھپانا چاہتا ہو' جاننے کے باوجود بھی انجان بنا رہے' بچے کو اگر یہ بات معلوم ہو جائے کہ غلطی سے واقف ہونے کے باوجود مجھے کچھ نہیں کہا گیا تو وہ اسے اپنی عادت بنا لیتا ہے' بلکہ اس سے بھی زیادہ بری حرکتوں پر جَری ہو جاتا ہے' لیکن اگر وہ اس غلطی کا اعادہ کرے تو اب خاموش رہنے کی اجازت نہیں' بچے کو تنہائی میں تنبیہہ کرے اور اسے سختی سے تاکید کرے کہ وہ آئندہ اس غلطی کا مرتکب نہ ہو' لوگوں کے سامنے کچھ نہ کہے' اور نہ بہت زیادہ سخت سُست کہے' بعض اوقات ملامت کی زیادتی سے خوف کم ہو جاتا ہے' نصیحت کا اَثر باقی نہیں رہتا' اور منکرات کی سنگینی کا احساس دل سے زائل ہو جاتا ہے' باپ کو اپنے بیٹے سے اتنا بے تکلف نہ ہونا چاہیے کہ وہ اس کی کسی بات کو اہمیت ہی نہ دے کلام کی ہیبت باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ بچے کو ہر وقت ملامت اور عتاب کا ہدف نہ بنائے رکھے' بچوں کے دلوں میں باپ کا ادب اور خوف اتنا ہونا چاہیے کہ ماں انہیں باپ کے حوالے سے ڈرا سکے' اور انہیں منکرات سے باز رکھ سکے۔

بچے کو دن میں سونے سے منع کرنا چاہیے' کیونکہ دن میں سونے سے جسم میں سُستی پیدا ہوتی ہے' اور عمل کی قوت میں اِضمحلال آجاتا ہے' البتہ رات میں سونے سے ہرگز منع نہ کرے' بچوں کو نرم اور گداز بستروں پر سلانے کی بجائے سخت اور کھُردرے بستر پر سونے کی عادت ڈالنی چاہیے تاکہ آرام طلبی پیدا نہ ہو' اور اعضاء سخت رہیں' اس کے جسم کو فربہ کرنے کی کوشش نہ کرے' کیوں کہ فربہ بدن آدمی عیش پسند ہوتا ہے' بستر' لباس اور کھانے میں سادگی ملحوظ رہنی چاہیے۔ جو کام وہ چھپ کر کرنا چاہے اس سے روکے کیونکہ بچہ وہی کام چھپ کر کرتا ہے جسے وہ اپنے خیال میں بُرا تصوّر کرتا ہے۔ اگر اسے چھپ کر کام کرنے کی آزادی دی گئی اور کوئی روک ٹوک نہ کی گئی تو وہ برے افعال کا عادی ہو جائے گا' دن کے کسی حصے میں اسے چلنے پھرنے اور ورزش کرنے کی مہلت بھی دینی چاہیے تاکہ سُستی غالب نہ ہو۔ بچے کو سمجھانا چاہیے کہ وہ اپنے اعضاء نہ کھولے' دوڑ کر نہ چلے' اگر اس کا باپ کسی

خاص چیز کا مالک ہو تو اپنے ہم عصروں میں اس پر فخر نہ کرے چاہے وہ چیز کھانے پینے سے متعلق ہو' یا پہننے اوڑھنے سے یا پڑھنے لکھنے سے بچے کو انکساری' تواضع' رُفقاء کے اکرام اور ہر شخص کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے کا عادی بنانا چاہیے بچے سے کہا جائے کہ وہ اپنے ساتھیوں کی کوئی چیز نہ لے اگر بچہ امیرزادہ ہو تو اسے سمجھانا چاہیے کہ تمہاری شان دینے میں ہے لینے میں نہیں ہے۔ کسی سے کچھ لینا ذلت کی بات ہے' اگر غریب ہے تو کہنا چاہیے کہ کسی سے کچھ لینا خودداری کے خلاف ہے' اور کتّے کا شیوہ ہے کتّا ہی ایک لقمہ کی خاطر دُم ہلاتا پھرتا ہے۔ بچوں کو سونے چاندی کی محبت اور طمع سے منع کرنا چاہیے' اور ان چیزوں سے اس طرح ڈرانا چاہیے جس طرح سانپ بچھو سے ڈرایا جاتا ہے کیونکہ ان کا ضرر زیادہ ہے' اس ضرر میں صرف بچوں ہی کی تخصیص نہیں ہے' بلکہ بڑوں کا بھی یہی حال ہے۔

بچوں کو یہ عادت ڈالنی چاہیے کہ وہ بیٹھنے کی جگہوں پر تھوکنے سے گریز کریں' دوسروں کے سامنے جمائی نہ لیں' کسی کی طرف پشت نہ کریں' مجلس میں ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں نہ رکھیں' نہ تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھیں' نہ ہاتھ کو تکیہ بنائیں' یہ سب امور سستی کی علامتیں ہیں' بچوں کو بیٹھنے کا طریقہ بتلا دینا چاہیے' زیادہ بولنے سے بھی منع کرنا چاہیے اور بتلانا چاہیے کہ زیادہ بولنا بے شرمی پر دلالت کرتا ہے' اور یہ کمینوں کی عادت ہے' بچوں کو قسمیں بھی نہ کھانے دی جائیں خواہ وہ جھوٹی ہوں یا سچی' ایسا نہ ہو کہ بچہ کم عمری میں قسمیں کھانے کا عادی بن جائے اور آخر عمر تک بات بات میں قسمیں کھاتا رہے بچوں سے کہنا چاہیے کہ وہ مجلس میں کلام کی ابتدا نہ کریں' بلکہ بہتر یہ ہے کہ ان کی گفتگو صرف جواب ہو سوال نہ ہو' اور جواب بھی سوال کے مطابق ہو۔ جب کوئی بڑا بول رہا ہو تو اس کی بات غور سے سنیں' بڑا مجلس میں آجائے تو اپنی جگہ سے اُٹھ جائیں' آنے والے کو جگہ دیں اور اس کے سامنے ادب سے بیٹھیں' بچوں کو فحش کلامی' لعن طعن اور سبّ و شتم سے روکنا چاہیے اور ان لوگوں کے پاس بھی نہ بیٹھنے دینا چاہیے جن کی زبانیں اس طرح کی غلیظ باتوں سے آلودہ رہتی ہیں' بُرے ہم نشینوں کی بری عادتیں بچوں پر بہت جلد اثر انداز ہوتی ہیں۔ بچوں کی تربیت میں اصل یہی ہے کہ انہیں بُری صحبت سے بچانا چاہیے۔

بچوں کو سمجھایا جائے کہ وہ استاذ کے مارنے پر زیادہ شور و غل نہ کریں' نہ سفارشی تلاش کریں' بلکہ صبر کریں' صبر کرنا ہی بہادروں اور مَردوں کا شیوہ ہے' واویلا کرنا عورتوں کی عادت ہے' پڑھائی سے فراغت کے بعد بچہ اگر کھیلنے کا خواہشمند ہو تو اسے منع نہ کیا جائے' بشرطیکہ وہ کھیل عمدہ ہو' اور کھیلنے والے کو کوئی اخلاقی یا جسمانی ضرر نہ پہنچاتا ہو' مکتب کی تھکن کھیل سے دور ہو جاتی ہے' لیکن اتنا بھی کھیلنے نہ دیا جائے کہ کھیل کی تھکن غالب آجائے اور پڑھنے کے قابل نہ رہے' بچے کو کھیل سے روکنا اور ہمہ وقت پڑھائی میں لگائے رکھنا اس کی صحت کے لیے سخت نقصان دہ ہے اس سے بچے کا دل مُردہ ہو جاتا ہے' ذکاوت متأثر ہوتی ہے' اور اسے زندگی بدمزہ معلوم ہونے لگتی ہے' وہ کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح اس دائمی مصروفیت (تعلیم) سے نجات حاصل کرلے۔

بچے کو اپنے ماں' باپ' اساتذہ' تربیت کرنے والوں اور بڑوں کی اطاعت اور تعلیم کا عادی بھی بنانا چاہیے' خواہ وہ بڑے اپنے ہوں یا اجنبی ہوں اسے بتلانا چاہیے کہ بڑوں کا احترام ضروری ہے' جب وہ موجود ہوں تو کھیلنا بند کردے جب بچہ سمجھدار ہو جائے تو پاکی اور نماز کے بارے میں اس سے چشم پوشی نہ کرے' رمضان کے کچھ روزے بھی ضرور رکھوائے' ریشمی کپڑے اور سونے چاندی کے زیورات پہننے سے منع کرے' شریعت کے ان احکام سے اسے مطلع کرتا رہے جن کی اسے ضرورت پیش آئے۔ اسے چوری' حرام خوری' خیانت' جھوٹ اور فواحش سے ڈرائے' اگر بچے کی تربیت ان بنیادوں پر ہوئی تو بلوغ کے قریب اسے ان امور کے اَسرار بھی بتلا دینے چاہئیں کہ غذا کی حیثیت دوا کی سی ہے' کھانے سے آدمی کا مقصود یہ ہونا چاہیے کہ اس کے ذریعہ اللہ کی اطاعت اور عبادت کرنے پر قوت حاصل ہو' دنیا بے حقیقت چیز ہے' موت پر اس کی تمام لذتیں اور نعمتیں فنا ہو جاتی ہیں' دنیا صرف ایک گذرگاہ ہے' آدمی کا مستقل ٹھکانہ آخرت ہے' موت ہر لمحہ انسان کی تاک میں ہے' عقلمند وہی ہے جو دنیا کی گذرگاہ سے آخرت کے مستقل قیام کے لیے توشہ حاصل کرلے۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑے مرتبے پر فائز ہو' اسے وسیع ترجنّات ملیں۔ اگر

بچہ کی نشوونما صالح بنیادوں پر ہوئی ہوگی تو بڑے ہونے پر یہ تمام حقائق اس کے دل پر اثر انداز ہوں گے' اور اس طرح راسخ ہوجائیں گے جس طرح پتھر پر حروف نقش ہوجاتے ہیں لیکن اگر تربیت اس کے برعکس ہوئی' بچپن ہی سے وہ کھیل کود' فواحش و منکرات' بے شرمی اور بے ہودگی' حرص و ہوس' زیبائش و آرائش کا عادی رہا تو وہ ان حقائق کو قبول نہ کرسکے گا۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ بچوں کی تربیت ابتدا ہی سے بہت ضروری ہے' بچے کا جوہر قلب ہر طرح کے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے' خیر اور شر دونوں اس پر یکساں طور پر اثر انداز ہوسکتے ہیں' اب یہ ماں باپ پر منحصر ہے کہ وہ اس کے دل کو خیر کے لیے وقف کریں' یا شر کی نذر کردیں' حدیث شریف میں ہے:-

کل مولود یولد علی الفطرة فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ(۱)

ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے' اس کے ماں باپ اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی کردیتے ہیں۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ فرماتے ہیں کہ جب میں تین برس کا تھا تو رات کو جاگا کرتا تھا اور اپنے ماموں محمد بن سوار کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کرتا تھا' ایک دن میرے ماموں نے مجھ سے کہا کہ کیا تو اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا جس نے تجھے پیدا کیا ہے' میں نے عرض کیا اس کا ذکر کیسے کروں؟ انہوں نے جواب دیا جب تو سونے کے لیے بستر پر لیٹے تو تین بار یہ کلمہ دل ہی دل میں کہہ لیا کر "اَللّٰہُ مَعِیَ' اَللّٰہُ نَاظِرٌ اِلَیَّ' اَللّٰہُ شَاہِدِیْ" (اللہ میرے ساتھ ہے' اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اللہ تعالیٰ میرا گواہ ہے) میں نے چند راتوں تک یہ وِرد جاری رکھا' اور اپنے ماموں کو اس کی اطلاع دی' انہوں نے فرمایا اب یہ کلمہ سات مرتبہ کہا کر۔ چند دنوں کے بعد گیارہ مرتبہ کہنے کے لیے کہا' میں نے اس کلمے کی لذت و حلاوت اچھی طرح محسوس کی' ایک سال بعد ماموں نے مجھ سے کہا' اس کلمہ کو یاد رکھ' اور زندگی کی آخری سانس تک اس کا وِرد کرتا رہ تجھے یہ کلمہ دنیا و آخرت میں نفع دے گا۔ میں نے چند برس تک اس کا اِلتزام کیا اور باطن میں اس کی حلاوت زیادہ پائی' ایک روز ماموں نے مجھ سے فرمایا: اے سہل! جس شخص کے ساتھ اللہ ہو' جس کی طرف اللہ دیکھتا ہو' جس کا گواہ اللہ ہو کیا وہ اللہ کی معصیت کرسکتا ہے' خبردار گناہ سے بچنا' بہر حال میں تنہائی میں اس ذکر کی پابندی کرتا رہا چند دنوں کے بعد مجھے مکتب میں بھیجا گیا تو میں نے اس ڈر سے کہ کہیں میرے ورد میں خلل نہ ہو گھر والوں سے کہا کہ پہلے استاذ صاحب سے یہ شرط کرلو کہ میں ایک گھنٹہ سے زیادہ مکتب میں نہیں رہوں گا۔ اس شرط کے ساتھ میں مکتب میں داخل ہوا' اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی' میں نے چھ یا سات برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرلیا' میں بچپن ہی سے مسلسل روزے رکھنے کا عادی تھا' بارہ سال تک میں نے جو کی روٹی پر قناعت کی' جب میں تیرہ برس کو ہوا تو ایک سوال میرے دل میں آیا میں نے گھر والوں سے کہا کہ مجھے بصرہ جانے کی اجازت دیجئے تاکہ میں وہاں کے علماء سے اپنے سوال کا جواب دریافت کرسکوں' مجھے اجازت دی گئی' بصرے پہنچ کر میں نے وہاں کے علماء کے سامنے اپنا سوال رکھا' لیکن کسی نے بھی تسلّی بخش جواب نہیں دیا' وہاں سے مایوس ہوکر میں عبادان گیا' عبادان میں ایک بزرگ ابو حبیب حمزہ بن ابی عبداللہ العباد انیؒ رہتے تھے' میں نے ان سے اپنے سوال کا جواب مانگا' انہوں نے تسلّی بخش جواب دیا' میں کئی سال تک عبادان میں مقیم رہا' اور ابو عبداللہ عبادانی سے علم و ادب کی تحصیل میں مصروف رہا۔ عبادان سے تستر آیا اور اپنی غذا کے لیے یہ نظم کیا کہ ایک درہم کے جو خرید کر پسواتا' اور ایک چھٹانک آٹے کی روٹی نمک ملائے بغیر سحر کے وقت کھالیتا' اس طرح ایک درہم مجھے ایک سال تک کے لیے کفایت کرجاتا۔ پھر میں نے تین روزے مسلسل رکھنے کا ارادہ کیا' اس کے بعد پانچ روزے مسلسل رکھے' پھر سات دن بعد افطار شروع کیا' پھر بیس راتیں بغیر کھائے پئے گزاریں' اس وقت میری عمر بیس سال تھی' پھر میں چند برس اِدھر اُدھر گھومتا رہا' پھر تستر واپس آیا' اللہ کا شکر ہے کہ میں رات بھر تہجّد

---

(۱) یہ روایت پہلے بھی گذر چکی ہے۔

کے لیے کھڑا رہتا تھا' احمد کہتے ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا کہ انہوں نے زندگی بھر کبھی نمک چکھا ہو۔

اِرادت کی شرائط' مجاہدے کے مقدمات اور راہِ سُلوک میں مرید کے تدریجی اِرتقا کی تفصیل

جاننا چاہیے کہ جو شخص دل سے آخرت کا یقینی مشاہدہ کرلیتا ہے' وہ آخرت کا ہو کر رہ جاتا ہے' اس کے لیے جدوجہد کرتا ہے' اسی کے لیے زادِ راہ جمع کرتا ہے' اسی کی طرف جانے والے راستوں پر چلتا ہے' اس کی نظروں میں دنیا کی لذتوں اور نعمتوں کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی' اگر کسی کے پاس موتی ہو' اور کسی قیمتی جوہر پر اس کے نظر پڑ جائے تو وہ موتی دل سے اُتر جاتا ہے اور وہ یہ خواہش کرتا ہے کہ کسی طرح میں اس موتی کے عوض یہ جوہر حاصل کرلوں' جو شخص نہ آخرت کا متمنی ہو' اور نہ اللہ تعالیٰ کی لقاء کا طالب ہو وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان (ایمان سے یہاں مراد اخلاص اور قلب کی صداقت کے بغیر محض زبان سے شہادت کے کلمے ادا کرنا نہیں ہے) نہ ہونے کی وجہ سے اس شخص کی طرح ہے جو معمولی موتی کو قیمتی جوہر سے افضل قرار دے' یہ حماقت وہی شخص کرسکتا ہے جس کی نظر فقط جوہر پر ہو' جوہر کی حقیقت پر نہ ہو' ظاہر ہے ایسا شخص اس معمولی موتی ہی کو بیش قیمت سمجھے گا' اس کی نظر میں جوہر کی کوئی اہمیت نہ ہوگی بہرحال اللہ کی طرف سُلوک کے بغیر پہنچنا ممکن نہیں ہے اور سُلوک (چلنا) ارادے کے بغیر نہیں ہوتا' ارادے کی راہ میں ایمان کا نہ ہونا سب سے بڑی رکاوٹ ہے' اور ایمان اس لیے مفقود ہوتا ہے کہ نہ مُذکِّر موجود ہیں' نہ مُرشد اور ہادی' اور نہ وہ علماء جو حق کا راستہ دکھلائیں' اور انسان کو بتلائیں کہ یہ دنیا حقیر ہے' اسے ثبات نہیں' آخرت ہی کی زندگی اہم ہے' اسے ہی دوام اور ثبات حاصل ہے' لوگ غفلت میں مبتلا ہیں' شہوات میں غرق ہیں' اور سود و زیاں سے بے نیاز خوابِ ناز میں مَست ہیں' ایسے علماء نہیں ملتے جو انہیں نیند سے جگادیں' شہوات سے دور کردیں' اور غفلت پر تنبیہ کریں۔ اگر کوئی شخص خوابِ غفلت سے بیدار بھی ہوجاتا ہے تو کفر و نفاق کے اندھیروں میں اسے راستہ نہیں ملتا' اور وہ اپنی جہالت کے باعث جگہ جگہ ٹھوکر کھا کر رہ جاتا ہے' علماء سے راستہ پوچھتا ہے تو وہ بتلا نہیں پاتے کیونکہ وہ خود ہوا و ہوس کے بندے اور خواہشاتِ نفس کے اَسیر ہیں' ارادے کی کمزوری' راستے سے ناواقفیت' اور رہنماؤں کی گمراہی یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے راہِ خدا سالکین سے خالی ہے' جب مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو' مقصد کی طرف رہنمائی کرنے والا غائب ہو' اور نفس پر ہوا و ہوس کا غلبہ ہو' اور طالب غفلت میں مبتلا ہو تو راستہ کس طرح ملے گا' اگر مل بھی گیا اور کسی نے قدم اٹھا بھی لیے تو وہ منزل تک کیسے پہنچ پائے گا' جب کہ اسے چلنا نہیں آتا؟

<u>اِرادت کی شرائط</u> : اگر کوئی شخص زیرک ہو اور وہ اپنے طور پر' یا کسی کی ترغیب سے آخرت کا ارادہ کرے تو اسے قدم اٹھانے سے پہلے ارادت کی شرائط معلوم کرلینی چاہئیں' ارادت سے پہلے ان شرائط کا بجالانا ضروری ہے۔

اِرادت کی اوّلین شرط یہ ہے کہ اپنے اور حق کے درمیان جو حجاب پائے اور جو رکاوٹ دیکھے اسے دور کرے' لوگ حق نگری سے اسی لیے محروم ہیں کہ درمیان میں بہت سے حجابات حائل ہیں۔ ارشادِ ربّانی ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (پ ۲۲ ر ۱۸ آیت ۹)

اور ہم نے ایک آڑ اُن کے سامنے کردی اور ایک آڑ اُن کے پیچھے کردی جس سے ہم نے (ہر طرف سے) ان کو گھیر دیا سو وہ دیکھ نہیں سکتے۔

<u>حجاب کی قسمیں</u> : مرید اور حق کے درمیان یہ حجابات چار ہیں' مال' جاہ' تقلید اور معصیت۔ مال کا حجاب اس وقت زائل ہوتا ہے جب مرید کی ملکیت سے نکل جاتا ہے' اور بقدرِ ضرورت باقی رہتا ہے' اگر ضرورت سے زائد ایک درہم بھی مرید کے پاس رہے

گا اس کا دل اسی درہم کی طرف متوجہ رہے گا' اس کے دل پر درہم کی حکمرانی رہے گی اور وہ باری تعالیٰ کی طرف ملتفت نہ ہو سکے گا' جاہ کا حجاب اس طرح اٹھتا ہے کہ مرید جاہ و منصب کی جگہوں سے دور رہے' تواضع اور انکساری کو اپنی عادت بنالے' گمنامی کی زندگی کو ترجیح دے' شہرت کے اسباب سے لاتعلق بنا رہے' اور اس طرح کے کام کرے جن سے عام لوگوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا ہو' تقلید کا حجاب اس طرح دور ہوگا کہ فقہ و کلام کے مختلف مذاہب کے لیے تعصب کی ذہنیت کو بالائے طاق رکھے صرف اس بات کی تصدیق کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں' ان الفاظ کی صداقت کے عملی اظہار کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر معبود سے قطع تعلق کرلے' خاص طور پر نفس کے معبود سے کہ اس معبود کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے' اس کے ہر ہر حکم کی تعمیل کی جاتی ہے' اور اس کے ہر اشارے پر سر تسلیم خم کیا جاتا ہے' اگر کلمۂ توحید کی اس طرح تصدیق کی گئی تو وہ تمام اعتقادات باطل ہو جائیں گے جو محض تقلید سے حاصل ہوئے ہیں' یہ صورت مجاہدے سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ مجادلے سے' اگر کسی شخص پر تعصب غالب ہو' اور وہ اپنے معتقدات کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ ہو تو یہ تقلید کی گرفت ہے' اس گرفت سے نکلنا بہت دشوار ہے۔ مرید ہونے کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ کسی خاص (فقہی) مذہب کا پابند ہو۔ بلکہ کسی بھی مذہب کا معتقد اور متبع ارادت کی راہ طے کر سکتا ہے۔ معصیت کا حجاب اس وقت تک دور نہیں ہوتا جب تک توبہ نہ کرے' مظالم سے باز رکھنے اور اعادہ نہ کرنے کا عزم نہ کرے' ماضی کے گناہوں پر ندامت ظاہر نہ کرے اور مظلوموں کو ان کا حق نہ دے' جو شخص گناہوں سے توبہ کئے بغیر مکاشفہ کے ذریعہ دین کے اسرار پر مطلع ہونے کا خواہشمند ہو وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص عربی زبان سیکھے بغیر قرآن کریم کے معانی اور مطالب سمجھنا چاہتا ہو' جب کہ قرآن پاک عربی زبان میں ہے' عربی زبان کا علم حاصل کئے بغیر قرآن کریم کی ایک آیت کے معنی بھی نہیں سمجھے جاسکتے' چہ جائیکہ اس کے اسرار اور دقائق سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اسی طرح سلوک کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے شریعت کے ظاہر کی پابندی کرنا ضروری ہے' ظاہر شریعت کی مکمل اتباع کے نتیجے میں اسرار کے دروازے کھلتے ہیں' اور حقائق کے چشمے اُبلتے ہیں۔

شیخ کامل کی ضرورت: ان چاروں شرائط کی اتباع کرنے والا اور مال و جاہ کی خواہش سے بچ کر چلنے والا ایسا ہے جیسے کوئی شخص حدث کے بعد پاک ہو جاتا ہے' اور اعضاء وضو دھونے کے بعد نماز پڑھنے کا اہل ہو جاتا ہے لیکن نماز کی ادائیگی کے لیے یہ اہلیت کافی نہیں ہے' بلکہ بعض اوقات امام کی ضرورت بھی پیش آتی ہے جس کی اقتدا میں نماز ادا کی جاسکے' اسی طرح تنہا چار شرطوں پر عمل کرلینا کافی نہیں ہے بلکہ کسی استاذ یا شیخ کی ضرورت بھی ہے جو اس کی رہنمائی کرے سیدھے راستے پر چلائے' دین کا راستہ انتہائی پیچیدہ اور دشوار گذار ہے' اس کے چاروں طرف شیطانی راستوں کی کثرت ہے' اگر کوئی شخص نہ ملا تو یہ ممکن ہے کہ شیطان قیادت اور رہنمائی کے لیے سامنے آجائے اور سیدھے راستے سے ہٹا کر اپنے راستے پر چلانے کی کوشش کرے' خطرناک راستوں پر راہنما کے بغیر چلنے کا مطلب موت کا سفر ہے' جو لوگ اپنے آپ پر اس حد تک اعتماد کرتے ہیں اور تن تنہا چل پڑتے ہیں وہ ایسے ہیں جیسے راہ میں اُگنے والے پودے' ان کی زندگی مختصر ہوتی ہے' کسی بھی لمحہ ان کی زندگی کا چراغ گل ہو سکتا ہے' اگر کسی وجہ سے رہ بھی گئے تو پھل نہیں دے سکیں گے۔

ان چاروں شرطوں کے بعد جس چیز کی مرید کے لیے زیادہ اہمیت ہے وہ کسی ایسے شیخ کامل کا وجود ہے جس کی ذات اس کے لیے انتہائی قابلِ اعتماد ہو' جس طرح اندھا اپنے ہمراہی پر بھرپور اعتماد کرتا ہے' اور راستے کے ہر نشیب و فراز کی پروا کئے بغیر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہے' یہی حال مرید کا ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو شیخ کے سپرد کردے' اور جس طرح وہ کہتا رہے کرتا رہے' اور یہ یقین رکھے کہ اگر شیخ نے غلطی بھی کی تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ وہ غلطی میرے حق میں مفید ثابت ہوگی' اور شیخ کی غلطی اس سے بہتر ہے کہ میں تن تنہا وادیٔ سلوک طے کروں' اور اتفاقاً صحیح راستے کا انتخاب کرلوں۔

مرشد کا فرض: جب کوئی مرید کسی شخص کو اپنا مرشد اور رہادی بنالے تو اس مرشد کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے مرید کو محفوظ پناہ گاہ

دے اور ایسے مضبوط قلعہ میں اس کی حفاظت کا بندوبست کرے جہاں رہزنوں اور ڈاکوؤں کے قدم نہ پہنچ سکیں۔ اس محفوظ پناہ گاہ اور مضبوط قلعے کی چار دیواریں ہیں خلوت، سکوت، بھوک اور بیداری۔ مرید کا مقصد اپنے قلب کی اصلاح ہے تاکہ ذات حق کا مشاہدہ ممکن ہو اور اس کا قرب میسّر آسکے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے مذکورہ بالا چار چیزیں ضروری ہیں۔ بھوک سے دل کا خون کم ہوتا ہے، اور اس میں سفیدی آجاتی ہے، یہی سفیدی دل کا نور ہے، بھوک سے دل کی چربی پگھل جاتی ہے اور اس میں رقت پیدا ہوجاتی ہے، رقت مکاشفہ کی کلید ہے اور سختی حجاب ہے، خون کی کمی سے دشمن (شیطان) کی راہیں تنگ ہوجاتی ہیں، کیوں کہ شہوات سے لبریز رگیں ہی اس کی گذرگاہیں ہیں او وہ انہیں رگوں میں خون کی ساتھ ساتھ پورے جسم میں گردش کرتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریین سے فرماتے ہیں: اپنے دلوں کو بھوکا رکھو شاید تم اپنے رب کا مشاہدہ کرلو۔ سہل بن عبداللہ تستریؒ فرماتے ہیں کہ ابدال چار چیزوں سے ابدال بنتے ہیں بھوک، بیداری، خاموشی اور عزلت نشینی سے۔ قلب کی نورانیت میں بھوک کی تاثیر ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے تجربے سے اس کا ثبوت ملتا ہے، کسر الشہوتین کے باب میں اس کی تفصیل آئے گی۔

بیداری سے بھی قلب میں صفائی، جلا اور نُور پیدا ہوتا ہے، بھوک کے نتیجے میں حاصل ہونے والے نُور پر جب اس نور کی زیادتی ہوتی ہے جو بیداری سے حاصل ہوا ہو تو دل ایک روشن ستارے کی طرح، یا ایک شفاف آئینے کی طرح ہو جاتا ہے جس میں حق کا جمال جھلکتا ہے اور آخرت کے بلند درجات اور دنیا کی حقارت و ذلت اور آفات کا مشاہدہ ہوتا ہے، اس مشاہدے کے بعد مرید کی نظر میں دنیا کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی، اور وہ آخرت کی طرف پوری طرح متوجہ ہوجاتا ہے۔ بیداری نیند ہی کا نتیجہ ہے اس لیے شکم سیر ہو کر جاگنا ناممکن ہے، نیند سے آدمی مردہ اور سخت ہوجاتا ہے لیکن اگر ضرورت کے مطابق ہو تو اس سے غیبی اَسرار منکشف ہوتے ہیں۔ ابدال کی صفات میں لکھا ہے کہ فاقہ ان کی غذا ہے، نیند غلبہ اور کلام بقدر ضرورت ہے حضرت ابراہیم الخواص فرماتے ہیں کہ ستر فیصد یقین اس امر پر متفق ہیں کہ زیادہ پانی پینے سے نیند زیادہ آتی ہے۔ سکوت سے عزلت آسان ہوجاتی ہے، لیکن عزلت نشین کو بہر حال ان لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے جو اس کے لیے کھانے پینے کا نظم کرتے ہیں اور اس کے امور کی نگرانی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے بھی بقدر ضرورت کلام کرنا چاہیے کیوں کہ کلام سے آدمی کا دل مشغول ہوجاتا ہے، دل کو کلام سے رغبت یوں بھی زیادہ ہے کیوں کہ ذکر و فکر کی تھکن کلام سے زائل ہوجاتی ہے۔ بہر حال سکوت سے دل کو قوت حاصل ہوتی ہے، سکوت ورع و تقویٰ کا باعث ہے۔ خلوت کا فائدہ پورے طور پر اس وقت حاصل ہوتا ہے جب آنکھ اور کان جو قلب کے دروازے ہیں بند کردیئے جائیں۔ اور قلب کی مصروفیت میں کوئی خلل انداز نہ ہو، جسم میں دل کی مثال ایسی ہے جیسے حوض کہ اس میں چاروں طرف سے گندہ پانی گرتا ہے، ریاضت کا مقصد یہ ہے کہ ان گندی نالیوں کو بند کردیا جائے اور حوض کو اتنا گہرا کھود دیا جائے کہ پانی کے لیے کسی خارجی وسیلے کی ضرورت باقی نہ رہے، بلکہ زمین کی تہہ سے خود بخود صاف شفاف پانی نکلتا رہے۔ حوض کو پانی میں خود کفیل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے گندے پانی سے پوری طرح خالی کرلیا جائے، اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کہ اس میں گرنے والی تمام نالیاں بند ہوں، اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ نالیاں بھی کھلی رہیں اور حوض میں ہروقت پاک صاف اور تازہ پانی جمع رہے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ قلب کی نالیاں حواس ہیں، حواس پر پابندی کی صورت یہی ہے کہ آدمی کسی تاریک مکان میں خلوت نشین ہوجائے اگر کوئی ایسا تاریک کمرہ میسّر نہ آسکے تو سر پر کپڑا ڈال کر ہی بیٹھ جایا کرے، خلوت میں آدمی حق کی آواز سنتا ہے، اور حضرت ربوبیت کے جلال کا مشاہدہ کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی حالت میں حق کی آواز پہنچی تھی، اور خطاب ہوا تھا:

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (پ ۲۹ ر ۱۳ آیت ۸)

اے کپڑے میں لپٹنے والے۔

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (پ ۲۹ ر ۱۵ آیت ۱)

اے کپڑے میں لپٹنے والے۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ یہ چاروں چیزیں بھوک' بیداری' سکوت اور خلوت مرید کی پناہ گاہ ہیں' اس کے لیے ڈھال کی حیثیت رکھتی ہیں' ان کے ذریعہ وہ رہزنوں اور راستے کے لٹیروں اور دشمنوں سے اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔

سلوک کی ابتدا : ان تمام شرائط کی تکمیل کے بعد اب سلوک کی راہ میں قدم رکھے' اور یہ خیال رکھے کہ راہ میں بہت سی دشوار گذار گھاٹیاں ہوں گی جنہیں عبور کیے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہو گا۔ اللہ کی راہ کی گھاٹیاں قلب کی ان صفات کے علاوہ دوسری نہیں ہیں جن سے دنیا کی رغبت پیدا ہوتی ہے ان میں سے بعض گھاٹیاں بڑی ہیں ان کا عبور کرنا مشکل ہے' اور بعض چھوٹی ہیں اور ان کا طے کرنا آسان ہے' ان گھاٹیوں کے طے کرنے میں ترتیب یہ ہے کہ پہلے آسان گھاٹی سے گذرے' پھر اس سے مشکل گھاٹی عبور کرے' پھر اس سے مشکل گھاٹی طے کرے۔ یہ صفات انہی علائق کے اسرار اور آثار ہیں جنہیں ارادات کی ابتدا میں قطع کیا تھا' یعنی مال' جاہ' مخلوق کی طرف التفات' اور معاصی۔ جس طرح ظاہر سے ان علائق کے آثار منقطع کیے گئے ہیں اسی طرح باطن سے بھی ان کا خاتمہ کردیا جائے۔ لیکن اس میں بڑے طویل مجاہدے کی ضرورت ہے۔ یہ بات ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ شہوات کی مخالفت ہی اصل مجاہدہ ہے۔ جب مرید کا دل شہوات سے خالی ہو جائے' اور دل میں شغل کے لیے مانع کوئی علاقہ باقی نہ رہے تو مرشد کو چاہیے کہ وہ مرید کے دل کی مسلسل نگرانی رکھے' اور اسے ظاہری اوراد کی کثرت سے روکے۔ بلکہ اس سے کہے کہ وہ صرف فرائض اور سُنن پر اکتفا کرے' زیادہ سے زیادہ اسے ایک ایسا وظیفہ بتلا دے جو تمام وظائف کا حاصل اور لبِّ لباب ہو' یعنی جب دل غیر اللہ سے خالی ہو جائے تو اللہ کا ذکر کرا دے' لیکن یہ ذکر اس وقت تک نہ کرائے جب تک اس کا دل دوسرے علائق کی طرف مائل اور ملتفت ہو' چنانچہ حضرت شبلیؒ اپنے مرید حصری سے فرمایا کرتے تھے کہ جس جمعہ کو تم میرے پاس آتے ہو اگر اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی خیال تمہارے دل میں گزرے تو تم میرے پاس مت آیا کرو اس طرح کا تجرد صدق ارادت اور محبت الٰہی کے غلبے کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ دل غیر اللہ سے اسی وقت خالی ہوتا ہے جب اللہ کے علاوہ کوئی خیال دل میں نہ آئے اور ایسا عاشق صادق بن جائے کہ ایک فکر کے علاوہ کوئی دوسری فکر باقی نہ رہے۔ اگر کسی مرید کا حال یہ ہو جائے تو مرشد اسے گوشۂ تنہائی میں بیٹھنے کی اجازت دے' اور ایک آدمی مقرر کردے جو اس کے پاس حلال غذا پہنچا دیا کرے۔ غذا کا حلال ہونا بہت ضروری ہے' کیونکہ دین کی اصل یہی ہے کہ حلال غذا کھائے۔ گوشۂ تنہائی کی اجازت دینے کے بعد اسے کوئی ایسا ذکر بتلا دے جس میں اس کا دل اور زبان دونوں مشغول رہیں' مثلاً اللہ' اللہ' سبحان اللہ' سبحان اللہ وغیرہ کلمات۔ اس ذکر پر وہ اتنی مُداومت کرے کہ زبان کی حرکت ساقط ہو جائے' اور ایسا معلوم ہو کہ تحریک کے بغیر زبان پر جاری ہے' یہ ورد جاری رہے یہاں تک کہ زبان کا رہا سہا اثر بھی ختم ہو جائے' اور دل میں صرف لفظ کی صورت باقی رہ جائے' ایک مرحلہ وہ آئے کہ دل سے لفظ کے حروف کی صورت بھی مٹ جائے اور اس کے معنیٰ کی حقیقت باقی رہ جائے' اس طرح کہ وہ معنیٰ دل کے ساتھ ہر وقت باقی رہیں' کبھی غائب نہ ہوں' اور نہ اس کی موجودگی میں کسی دوسرے معنیٰ کا خیال آئے۔ جب دل کسی چیز میں مشغول ہوتا ہے خواہ وہ کوئی بھی چیز ہو تو اس کے علاوہ چیز کی گنجائش باقی نہیں رہتی' چنانچہ اگر دل اللہ کے ذکر میں مشغول ہو اور وہی مقصود بھی ہے تو غیر ذکر سے یقیناً خالی ہو جائے گا۔ اس مرحلے میں پہنچنے کے بعد سالک کو اپنے قلب کی نگرانی اچھی طرح کرنی چاہیے' اور کوشش یہ کرنی چاہیے کہ کسی بھی طرح کا کوئی دوسرا تصور دل میں نہ آئے' نہ اپنی ذات سے متعلق اور نہ کسی دوسرے سے متعلق۔ اس لیے کہ اگر دل ذرا سی دیر کے لیے بھی کسی کی طرف مُلتفت ہوا ذکر سے خالی ہو جائے گا' خواہ ایک ہی لمحہ کے لیے خالی ہو دل کا ایک لمحہ کے لیے خالی ہونا بھی بڑا نقصان ہے۔ اس طرح کے نقصان سے بچنا چاہیے۔ وسوسوں کے سلسلے میں تو دل کا حال یہ ہے کہ اگر خارجی وسوسوں سے نجات پاکر اس کلمہ کی طرف دل کو متوجّہ کیا جو دل میں جاری ہے تو یہی کلمہ وسوسے کا سبب بن جائے گا کہ یہ کلمہ کیا ہے؟ اس کے کیا معنیٰ ہیں؟ اس کی عبادت کس لیے کی جاتی ہے؟ یہ وسوسہ فکر کے دروازے کھول دے گا' اور شیطان نت نئے وسوسے لے کر اندر

آجائے گا۔ ان میں ایسے وسوسے بھی ہوں گے جو آدمی کو ایمان کی سلامتی سے کفر کی ہلاکت تک' اور سنت کی نور سے بدعت کی تاریکی تک پہنچادیں گے' اگر سالک مُستعِد ہو اور ان وسوسوں کی آمد کے راستوں پر سخت نگرانی رکھتا ہو تو کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہیں ہے۔

وسوسوں کی دو قسمیں : سالک کو جن وسوسوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ دو طرح کے ہیں' کچھ وسوسے وہ ہیں جن کے بارے میں قطعیّت کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ باری تعالیٰ ان سے منزّہ اور پاک ہے' لیکن شیطان یہ وسوسے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے' اس طرح کے شیطانی طریقوں سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں لگ جائے' اور تضرّع کرے اور اللہ کی پناہ چاہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (پ ۹ ر ۱۴ آیت ۲۰۰)

اور اگر آپ کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے بلاشبہ وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔

نیز فرمایا:۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ (پ ۹ ر ۱۴ آیت ۲۰۱)

یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

دوسری قسم میں وہ وسوسے داخل ہیں جن میں تردّد اور شک ہوتا ہے' ان کے بارے میں قطعیّت کے ساتھ یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ باری تعالیٰ ان سے منزّہ ہیں' اس طرح کے وسوسے پیش آئیں تو سالک کو از خود کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے اپنے شیخ کی رائے دریافت کرنی چاہیے' یہی نہیں بلکہ شیخ سے اپنے دل کا ہر حال کے' خواہ سُستی ہو' یا نشاط ہو' کسی چیز کی طرف التفات ہو' یا صدق اِرادت ہو' غرضیکہ ہر کیفیت شیخ کو بتلادینی چاہیے تاکہ وہ علاج تجویز کرسکے' ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ شیخ کے علاوہ اپنا حال کسی کو نہ بتلانا چاہیے شیخ کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنے مرید کے حالات پر گہری نظر رکھے اور اس کی ذہانت اور ذکاوت کے مطابق فیصلہ کرے اگر یہ دیکھے کہ فکر کی اجازت دینے سے مرید خود بخود امرِ حق پر متنبّہ ہو جائے گا تو اسے فکر میں لگادے' اور یہ کہے کہ وہ اس فکر کا اِلتزام رکھے تاکہ باری تعالیٰ کی جانب سے وہ نور ظاہر ہو جس سے حقائق منکشف ہو جائیں لیکن اگر یہ خیال ہو کہ مرید اپنے ضُعفِ عقل کی بنا پر خود کوئی راستہ تلاش نہ کرسکے گا اور نہ از خود اس پر امرِ حق منکشف ہو گا تو اس کے شکوک کا اِزالہ کردے' اور وہ حقائق بتلادے جن کا تحمل کرسکے وعظ و نصیحت کرے اور اس کے معیار کو سامنے رکھ کر کچھ دلائل بھی دے' شیخ کو سمجھانے میں تشدّد سے کام نہ لینا چاہیئے' بلکہ جو کچھ کہنا ہو یا نصیحت کرنی ہو نرمی اور سہولت سے کرے۔ کیونکہ یہ راستہ نہایت دشوار گذار اور مہلک خطرات سے پر ہے۔ بعض مریدین ذکر و فکر کے شغل کے دوران فاسد خیالات کے ہجوم میں گھر جاتے ہیں' اور انہیں حقائق کے کشف پر قدرت نہیں رہتی' نتیجہ وہ لوگ بیکاری کی راہ چل پڑتے ہیں اور ہلاکت سے قریب ہو جاتے ہیں' یہ ایک عظیم تباہی ہے۔ جس شخص کا دل ذکرِ الٰہی کے لیے فارغ ہو' اور مانع ذکر علائق موجود نہ ہوں بعض اوقات وہ بھی اس طرح کے فاسد خیالات میں مبتلا ہو جاتا ہے' سالک خطرات سے پر کشتی کا مسافر ہے' اگر بچ کر نکل گیا تو دین کا بادشاہ ہے' نہ بچ سکا تو تباہ و برباد ہے۔ اسی لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

علیکم بدین العجائز (۱)

بڑھیوں کا دین اختیار کرو۔

مطلب یہ ہے کہ اصل ایمان اور ظاہری اعتقادات کی بطریق تقلید تصدیق کرنے کے بعد نیک اعمال میں مشغول ہو جانا چاہیئے۔ اس کے خلاف عمل کرنے میں بہت سے خطرات ہیں اس لیے بعض لوگوں نے شیخ کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ فراست سے اپنے مرید کا حال دریافت کرے اگر وہ ذہین فطین نہ ہو' بلکہ ظاہری اعتقادات کا حامل ہو تو اسے ذکر و فکر میں مشغول کرنے کی بجائے ظاہری اعمال اور متواتر اوراد میں لگا دینا چاہیے یا ان لوگوں کی خدمت پر متعین کردینا چاہیے جو اپنے آپ کو ذکر و فکر کے لیے وقف کیے ہوئے ہیں تاکہ ان کی برکت اسے بھی حاصل ہو جائے۔ چنانچہ جو شخص جہاد میں شریک نہ ہو سکے اسے مجاہدین کی خدمت کرنی چاہیے' مثلاً انہیں پانی پلائے' ان کے جانوروں کا دانہ پانی کرے اس خدمت کے عوض قیامت کے روز وہ بھی انشاء اللہ انہی مجاہدین کے زمرہ میں آئے گا' اگرچہ ان کے درجے کی انتہا تک نہ پہنچ سکے گا۔ بعض اوقات مسلسل ذکر و فکر میں لگے رہنے سے مرید پر خوش آئند احوال طاری ہوتے ہیں یا ان کے ہاتھوں کرامات ظاہر ہونے لگتی ہے' یہ احوال اور کرامات بعض کم ظرف مریدین کو عجب ریا اور خوشی میں مبتلا کر دیتی ہیں' یاد رہے کہ یہ کیفیتیں شغل کے لیے مانع ہیں' اگر مرید ان کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کا نفس ان کیفیتوں میں مشغول ہو گیا تو اس سے راہِ سلوک میں خلل واقع ہوگا' بلکہ اس کا امکان ہے کہ سالک آگے نہ بڑھ سکے' مناسب یہ ہے کہ آدمی زندگی بھر اس پیاسے کا حال بنائے رکھے جسے سمندر کا پانی بھی سیراب نہ کر سکے۔

سالک کا راسُ المال مخلوق سے قطع تعلق' اللہ سے وابستگی' اور خلوت ہے۔ بعض سیاح کہتے ہیں کہ میں نے ایک عزلت نشین ابدال کی خدمت میں عرض کیا کہ تحقیق کا راستہ کون سا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ تحقیق کی راہ یہ ہے کہ تم دنیا میں اس طرح رہو جس طرح کسی جگہ مسافر رہتا ہے' ایک مرتبہ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلائیں جس سے میرا دل ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رہے۔ فرمایا: مخلوق کی طرف مت دیکھو' ان کی طرف دیکھنا ظلمت ہے' میں نے عرض کیا کہ یہ تو ضروری ہے فرمایا ان کا کلام نہ سنو' اس سے دل میں قساوت پیدا ہوتی ہے' میں نے کہا یہ بھی ضروری ہے' فرمایا ان کے ساتھ کوئی معاملہ نہ کرو' ان سے معاملہ وحشت ہے' میں نے کہا یہ بھی ضروری ہے' میں ان کے درمیان زندگی گزارتا ہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی معاملہ نہ ہو' فرمایا ان کے ساتھ مت رہو' ان کے ساتھ رہنا ہلاکت ہے' میں نے عرض کیا کہ یہ بیماری بھی جانے والی نہیں ہے' فرمایا: تم غافلوں کو دیکھتے ہو' جاہلوں کا کلام سنتے ہو' بیکاروں سے معاملات کرتے ہو' اور یہ چاہتے ہو کہ تمہارا دل ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ رہے' ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

ریاضت کا انتہائی درجہ: ریاضت کی انتہا یہی ہے کہ مرید اپنا دل ہر لمحہ ہر آن اللہ تعالیٰ کے ساتھ حاضر پائے' اور یہ درجہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اس کا دل غیر خدا سے خالی نہ ہو جائے' اور دل کا غیر خدا سے خالی ہونا طول مجاہدہ کے بغیر ممکن نہیں ہے' جب آدمی کے دل میں اللہ کی یاد کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں رہتی تو اس پر جلال حضرت ربوبیت منکشف ہوتا ہے' حق کی تجلی ہوتی ہے' اور وہ تمام لطائف قدسیہ ظاہر ہوتے ہیں جن کا وصف بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال اگر کسی مرید پر اللہ کا خاص انعام ہو' اور مذکورہ بالا امور میں سے کوئی امر منکشف ہو جائے تو اس حال کی حفاظت کرے' اس درجہ پر فائز ہونے کے بعد بہت سے رہزن راستہ روکتے ہیں' ان میں سب سے بڑا رہزن یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کیفیات کو بطور پند و نصیحت بیان کرنے لگتا ہے' اور وعظ و

---

(۱) ابن الطاہر کتاب التذکرہ میں کہتے ہیں کہ اگرچہ الفاظ عام لوگوں کی زبانوں پر رائج ہیں لیکن مجھے صحیح یا ضعیف روایت سے اس کی کوئی اصل نہیں ملی' البتہ میں نے ابن عمرؓ سے محمد بن عبد الرحمٰن بن السلمان کی ایک روایت دیکھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "اذا کان فی آخر الزمان واختلف الاھواء فعلیکم بدین اھل البادی والنساء" یہ روایت ابن حبان نے کتاب الضعفاء میں نقل کی ہے۔

تذکیر کے درپے ہوجاتا ہے۔ اس مشغلے میں نفس کو ناقابل بیان لذت حاصل ہوتی ہے۔ یہ لذت نہیں نشہ ہے، آدمی اپنے نفع نقصان کی پروا کئے بغیر اس مشغلے میں منہمک رہتا ہے یہی نہیں بلکہ اپنے وعظ کو مزید مؤثر اور قابل قبول بنانے کے لیے الفاظ کے انتخاب اور عبارت کی رنگ آمیزی میں لگ جاتا ہے، اور اپنے علمی پندار کو سکون پہنچانے کے لیے حکایات و امثال، اور قرآن و حدیث کے شواہد تلاش کرتا ہے، اور انہیں سامعین کے سامنے پیش کرتا ہے، بعض اوقات شیطان اس کے کان میں یہ بات ڈال دیتا ہے کہ تمہارا یہ عمل عظیم ہے، تمہاری تقریروں سے مُردہ دلوں کو زندگی مل رہی ہے، غفلتوں کے پردے سرک رہے ہیں، تم اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ ہو، تم کسی منفعت کی خاطر نہیں محض اخلاص اور صدق لانہ جذبے سے اللہ کی مخلوق کو دعوت خیر دیتے ہو۔ شیطان کا یہ فریب اس وقت کھلتا ہے جب سالک کے ہم عصروں میں سے کوئی اور بھی دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیتا ہو، اور وہ اپنی مقررانہ صلاحیتوں کی وجہ سے لوگوں میں مقبول بھی ہو، اب اگر سالک کے دل میں اس کے لیے جذبۂ حسد پیدا ہو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کی وعظ گوئی خالص لذت کی خاطر ہے، لوگوں کی بھلائی اور اجر و ثواب کے لیے نہیں ہے۔ اگر اس کا مقصد نیک ہوتا تو وہ ہرگز اپنے ہم عصر واعظ سے حسد نہ کرتا۔ بلکہ خوش ہوتا کہ اسے اس کام میں ایک اور شخص کی اعانت حاصل ہوگئی ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کو بے گور و کفن لاوارث لاش ملے، اور اس کی تکفین و تدفین کی ذمہ داری سر پر آپڑے اور ان حالات میں اسے کوئی ایسا شخص مل جائے جو اس کار خیر میں اس کا تعاون کرے تو یہ خوشی کا مقام ہوگا یا حسد کا۔ اسی طرح غافل لوگ مردے ہیں، اگرچہ ان کے جسم چلتے پھرتے اور حرکت کرتے نظر آتے ہیں، مگر فی الحقیقت روح سے خالی ہیں، علماء اور وعاظ مُردہ رُوحوں کو زندگی دیتے ہیں، اگر ایک واعظ کو دوسرے واعظ کی اعانت اور رفاقت میسّر آجائے تو یہ اس کے لیے راحت کا باعث ہے، نہ کہ کلفت کا۔ لیکن دنیا پرست علماء اور واعظین اسے راحت سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی مملکت کی حُدود میں مداخلت تصوّر کرتے ہیں۔ مرید کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے یہ شیطان کا جال ہے، جس کے ذریعہ وہ ان لوگوں پر شب خوں مارتا ہے جو معرفت کی وادی میں قدم رکھتے ہیں، اس جال میں لوگ اس لیے پھنس جاتے ہیں کہ انسانی طبیعت پر دنیا کی محبت غالب ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (پ ۳۰ ر ۱۲ آیت ۱۶)

بلکہ تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو۔

یہ بھی فرمایا کہ طبائع پر شر کا غلبہ پہلے ہی سے ہے، سابقہ امتوں کی آسمانی کتابوں اور صحیفوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ ارشاد ہے:۔

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى (پ ۳۰ ر ۱۲ آیت ۱۸، ۱۹)

اور یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں۔

مرید کی ریاضت اور تربیت کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے، تفصیلی پروگرام اگلے ابواب میں مذکور ہوگا۔ اور یہ بتلایا جائے گا کہ کسی صفت کا ازالہ کس طرح کیا جائے۔ اور کس صفت کو قلب میں کس طرح راسخ کیا جائے۔

انسانی صفات میں اب سے زیادہ غالب پیٹ، شرمگاہ اور زبان کی شہوت ہے اس کے بعد غضب ہے، جو ان شہوتوں کی حمایت کرتا ہے، ان شہوتوں سے مانوس ہونے کے بعد انسان کے دل میں دنیا کی محبت بڑھتی ہے، اور مال و جاہ کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اس خواہش کے بطن سے کبر، عجب اور پندار کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں، اور آدمی ان میں کچھ اس طرح پھنستا ہے کہ نکلنے کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا، دین کا صرف وہی پہلو پسند کرتا ہے جس میں ریاست اور جاہ و اقتدار کا سامان ہوتا ہے۔ معاملے کی اسی نزاکت کے پیش نظر ہم ان دونوں کتابوں کے اختتام پر مہلکات پر گفتگو کریں گے اور یہ گفتگو آٹھ کتابوں میں تمام ہوگی۔ اول: پیٹ اور شرمگاہ کی شہوت، دوم: زبان کی آفات۔ سوم: غضب، حقد اور حسد۔ چہارم: دنیا کی مذمت اور اس کے فریب کی تفصیل۔ پنجم: مال کی محبت

اور بخل۔ ششم: ریاء اور حبِّ جاہ۔ ہفتم: کبر اور عجب۔ ہشتم: مواقع فریب۔ ان آٹھ کتابوں سے ہمارا وہ مقصد پورا ہو جائے گا جو احیاء العلوم جلد سوم میں ہمارے پیش نظر ہے۔ سابقہ دو کتابوں میں سے پہلی کتاب میں ہم نے قلب کی صفات کی شرح کی ہے، قلب ہی مُہلکات اور منجیات کا معدن اور منبع ہے۔ دوسری کتاب میں تہذیب اخلاق کے طریقے اور قلب کے امراض کے لیے نسخہ ہائے شفا تجویز کیے گئے ہیں، یہ گفتگو اجمالی تھی۔ آنے والے ابواب میں ہم ان کی تفصیل بیان کریں گے۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ

کتاب کسر الشہوتین

شہوتِ شکم و فرج کو توڑنے کے بیان میں

جاننا چاہیے کہ اولادِ آدم کے لیے سب سے زیادہ مہلک اور تباہ کن شہوتِ پیٹ کی شہوت ہے، اسی کی وجہ سے حضرت آدم و حوا علیہما السلام جنت سے نکالے گئے، اور اس دنیا میں بھیجے گئے، انھیں ایک خاص درخت کھانے سے منع کیا گیا تھا، مگر شہوت غالب آئی، اور انہوں نے وہ درخت کھالیا، اس نافرمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام برائیاں جو اب تک مستور تھیں کھل گئیں۔

شکم۔ تمام شہوات کا سرچشمہ : حقیقت یہ ہے کہ آدمی کا پیٹ ہی تمام شہوتوں کا سرچشمہ اور تمام آفتوں کا منبع اور معدن ہے۔ شہوتِ شکم سے شہوتِ جماع کو تحریک ملتی ہے، جب آدمی کا پیٹ بھرا ہوتا ہے تب ہی وہ یہ سوچتا ہے کہ بہت سی عورتیں نکاح میں ہوں۔ اور خوب صحبت کی لذّت حاصل کی جائے۔ کھانے اور نکاح کرنے کی شہوتیں جاہ و مال کی رغبت پیدا کرتی ہیں، جاہ و مال ہی وہ چیزیں ایسی ہیں جو منکوحات اور مطعومات میں توسّع کا ذریعہ بنتی ہیں۔ مال کی کثرت، اور جاہ کی زیادتی سے آدمی میں رعُونت، ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی خواہش اور اپنے سے بالاتر کے لیے حسد کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، ان کے بطن سے ریا، مُفاخرت، اور غرور جیسے عیوب پیدا ہوتے ہیں، کینہ، بغض اور عداوت کے جذبات کو تحریک ملتی ہے، پھر آدمی سرکشی نافرمانی، بغاوت اور تمرّد پر کمربانده لیتا ہے، منکرات اور فواحش میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ سب معدہ کو خالی نہ رکھنے کے نتائج و ثمرات ہیں، یہ پیٹ بھر کھانا ملنے کا غرور اور نشہ ہے، اگر آدمی اپنے نفس کو بھوک سے ذلیل رکھتا، اور شیطان کی آمد و رفت کے راستوں پر پہرے بٹھادیتا تو وہ ہرگز سرکشی اختیار نہ کرتا۔ بلکہ اللہ عزّوجلّ کی اطاعت کرتا، کبر و ریا، اور نافرمانی و سرکشی کی راہ نہ چلتا، نہ دنیاوی لذّات میں غرق ہوتا، نہ عاجلہ (دنیا) کو عقبیٰ (آخرت) پر ترجیح دینے کی غلطی کرتا، نہ دنیا کے مال و دولت پر اس طرح ٹوٹتا جس طرح کتے اپنے شکار پر جھپٹتے ہیں۔ بہرحال جب شہوتِ شکم کی آفت اتنی زیادہ خطرناک اور مہلک ہے تو اس کے خطرات سے اللہ کے بندوں کو آگاہ کرنا، اور ان سے بچنے کے طریقوں سے واقف کرانا ضروری ہے۔ یہی حال شہوتِ فرج کا ہے، اس لیے کہ فرج کی شہوت پیٹ کی شہوت کے تابع ہے ہم اللہ کی مدد اور اس کی توفیق سے اس گفتگو کو چند ابواب میں مکمل کریں گے۔ ان میں سے پہلے باب میں بھوک کی فضیلت اور شکم سیری کی مذمت بیان ہوگی، پھر اس کے بعد فوائد کا ذکر ہوگا، اس کے بعد کم خوری یا کھانے میں تاخیر کا ذریعہ پیٹ کی شہوت ختم کرنے کے طریقہ ریاضت کی تشریح کی جائے گی۔ بھوک کے سلسلے میں لوگوں کے احوال کا اختلاف بھی بیان کیا جائے گا، پھر شرمگاہ کی شہوت زیر بحث آئے گی، پھر یہ بیان کیا جائے گا کہ مرید کے لیے نکاح کرنا ضروری ہے یا نکاح نہ کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے فضائل ذکر کیے جائیں گے جو پیٹ، شرمگاہ، اور آنکھ کے شہوات کے مخالف ہیں۔

باب سوم

فرد، جماعت اور تزکیۂ نفس کی اجتماعی معنویت

اسلامی تعلیمات میں **تزکیۂ نفس** محض فرد کی باطنی پاکیزگی یا روحانی ارتقا کا نام نہیں،

بلکہ یہ ایک ایسا **ہمہ گیر نظامِ اصلاح** ہے جو فرد، معاشرہ اور امت — تینوں سطحوں پر عمل پذیر ہوتا ہے۔

فرد کی اصلاح، دراصل جماعت کی اصلاح کی بنیاد ہے،

اور ایک صالح جماعت ہی ایک منصف، متوازن اور پرامن معاشرہ تشکیل دیتی ہے۔

فرد کی اصلاح — تزکیہ کی پہچان

اسلام میں ہر فرد کو **ذمہ دار اور مکلف** مانا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ

(المدثر:38)

"ہر جان اپنے کیے ہوئے عمل کی گروی ہے۔"

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ انسان کی نجات یا ہلاکت کا مدار اس کی **ذاتی اصلاح** پر ہے۔

اگر فرد کا دل پاک، نیت درست، اور عمل صالح ہو تو اس کا اثر لازمی طور پر معاشرتی سطح پر ظاہر ہوتا ہے۔

اسی لیے **تزکیۂ نفس** صرف نیکی کی تعلیم نہیں، بلکہ ایک **ذمہ دارانہ طرزِ حیات** کی تربیت ہے۔

فرد اور جماعت کا تعلق — مولانا مودودیؒ کا نقطۂ نظر

مولانا **سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ** نے تزکیہ کو صرف انفرادی دائرے میں محدود نہیں رکھا،

بلکہ اسے ایک **اجتماعی و نظامی فریضہ** کے طور پر پیش کیا۔

ان کے نزدیک:

"فرد کی اصلاح دراصل جماعت کی اصلاح ہے،

اور جماعت کی درستی دراصل ایک منظم نظامِ اخلاق و عمل کی تشکیل ہے۔"

ان کا کہنا تھا کہ اگر ہر فرد اپنے نفس کو درست کر لے،

اپنی نیت کو خالص اور عمل کو صالح بنالے،

تو اس کے نتیجے میں ایک ایسی **جماعتِ صالحہ** وجود میں آتی ہے

جو اجتماعی زندگی میں عدل، تقویٰ، اور ایمان کی فضا قائم کرتی ہے۔

اجتماعیت — فرد کا امتحان گاہ

جماعت یا اجتماعیت محض افراد کا مجموعہ نہیں، بلکہ **کردار اور نیتوں کا مظہر** ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کے اخلاق، صبر، ایثار، اور اخلاص کا امتحان ہوتا ہے۔

تنہائی میں عبادت اور تقویٰ آسان ہے،

مگر اجتماع میں جب انسان دوسروں کے ساتھ جڑا ہوتا ہے تو

اس کے **صبر، برداشت، اور خلوص** کا حقیقی امتحان سامنے آتا ہے۔

اسی لیے اجتماعیت انسان کے لیے **تزکیہ کی عملی تربیت گاہ** ہے —

جہاں وہ اپنی نفسانی کمزوریوں پر قابو پاتا اور باہمی خیر کے نظام میں شامل ہوتا ہے۔

اسلام کا تقاضا — فرد سے معاشرتی تبدیلی تک

اسلام کا مطالبہ یہ نہیں کہ انسان صرف اپنے باطن کو پاک کرے،

بلکہ یہ کہ وہ اپنی پاکیزگی کو **عملی، اخلاقی، اور معاشرتی کردار** میں ظاہر کرے۔

اسلام ایک **عملی دین** ہے جو فرد کی اصلاح سے شروع ہو کر

خاندان، معاشرہ، اور ریاست تک ایک منظم اخلاقی نظام پیدا کرتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ

(الرعد: 11)

"اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلیں۔"

یعنی **اجتماعی تبدیلی** کا آغاز **فردی تبدیلی** سے ہوتا ہے۔

جب افراد اپنے نفس کو پاک کرتے ہیں تو معاشرہ خود بخود منور ہونے لگتا ہے۔

تزکیۂ نفس اور انسان کا نصب ُالعین

انسان کا اصل مقصدِ زندگی صرف دنیاوی کامیابی یا ظاہری نیکی نہیں،

بلکہ **اللہ کی رضا اور قرب** حاصل کرنا ہے۔

یہی اس کا **نصب ُالعین (Ultimate Purpose)** ہے۔

تزکیہ دراصل اسی نصب ُالعین کی طرف ایک مسلسل سفر ہے —

جس میں بندہ اپنے **نفسِ امّارہ** (برائی پر اکسانے والی قوت) کو مغلوب کر کے

نفسِ مطمئنّہ (اللہ سے راضی اور مطمئن دل) کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

قرآن اسی کو کامیابی کا معیار قرار دیتا ہے:

يَـٰٓأَيَّتُهَا ٱلنَّفْسُ ٱلْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

(الفجر: 27–28)

"اے اطمینان پانے والے نفس! اپنے رب کی طرف لوٹ چل، تو اس سے راضی، اور وہ تجھ سے راضی ہے۔"

یہی تزکیہ کی انتہا اور انسان کی حقیقی کامیابی ہے۔

تزکیۂ نفس کا سفر فرد سے شروع ہوتا ہے مگر اس کا اثر پورے معاشرے میں پھیلتا ہے۔

جب دل پاکیزہ ہوں، نیتیں خالص ہوں، اور اعمال صالح ہوں،

تو امت ایک زندہ، باشعور، اور اخلاقی معاشرہ بن جاتی ہے۔

یوں فرد کی اصلاح دراصل جماعت کی اصلاح ہے،

اور جماعت کی اصلاح دراصل امت کی تجدید۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

اسلامی نقطۂ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے۔ خدا کی عبدیت اور اطاعت کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ حقوق اور فرائض فرد پر عائد کیے گئے ہیں۔ امر و نہی کے احکام فرد کو دیئے گئے ہیں۔ طاعت پر جزا کی امید فرد کو دلائی گئی ہے اور عصیاں پر سزا کی دھمکی بھی فرد ہی کو دی گئی ہے۔ اس نظام فکر و عمل میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کی ابتداء میں عامل کی حیثیت سے اور انتہاء میں نتیجہ عمل میں پانے والے کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی کی عقل اور جذبات سے یہ اپیل کرتا ہے، اسی کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا مخاطب بناتا ہے، اسی کی فلاح کا طالب ہے اور اسی کو خسران سے بچانا چاہتا ہے۔ اگر فرد اپنی جگہ ناقص رہ جائے اور اپنی شخصیت کو پستی میں گرا دے تو آخری فیصلہ میں اس جماعت اور اجتماعی نظام کی خوبی اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتی جس سے وہ دنیا میں تعلق رکھتا تھا بلکہ اگر وہ کسی اچھی جماعت اور صالح اجتماعی نظام سے وابستہ تھا اور پھر اس نے اپنی تکمیلِ ذات اور ارتقاءِ شخصیت کے ان مواقع سے فائدہ نہ اٹھایا جو اسے حاصل تھے تو یہ چیز اس کے خلاف ایک اور قوی دلیل بن جائے گی اور اسے اور زیادہ خسران میں مبتلا کرے گی۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنی کوشش سے اس کمال کو پہنچ جائے جس کو پہنچ سکتا تھا اور اپنی شخصیت کو اتنا بہتر نشو و نما دے جتنا دے سکتا تھا تو جماعت اور اجتماعی نظام کا فساد اس کی

فلاح ونجات میں مانع نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ چیز اس کے حق میں ایک دلیل ہو گی کہ اس نے نا موافق حالات میں ترقی کے لیے اتنی کامیاب جدوجہد کی۔ یہی ہیں اس آیت کے معنیٰ جو سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوئی ہے کہ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ اور اس کے عکس کی صحت پر خود اس آیت کا مضمون دلالت کرتا ہے یعنی یہ کہ لَا يَنْفَعُكُمْ مَنِ اهْتَدٰى اِذَا ضَلَلْتُمْ۔

فرد اور جماعت

اس کا مطلب یہ نہیں کہ جماعت اور اجتماعی نظام کی اصلاح اسلام کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ فی الواقع اس کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ بجائے خود مطلوب ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کے جوہرِ ذات کی تکمیل جماعت ہی کی اصلاح اور اجتماعی نظام کی بہتری پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کو فرد فرد کی صورت میں پیدا تو ضرور کیا ہے مگر فرد فرد کی صورت میں رکھا نہیں ہے۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اجتماعی زندگی کے بہت سے اثرات جو اس کی ماں اور اس کے باپ نے اپنے اندر جذب کئے تھے، موروثی صفات وخصائص کی صورت میں اس کے اندر پیوست ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ اس کی شخصیت کے نشوونما پر اچھا خاصا اثر ڈالتے ہیں۔ اور اجتماعی زندگی اس کے پیدا ہونے کی ساعت سے لے کر موت کی گھڑی تک پیہم اس پر اثر ڈالتی اور اس سے اثر قبول کرتی رہتی ہے اگر اجتماعی ماحول کسی غلط نظام پر قائم ہو، اس کی آب وہوا اصلاح کے بجائے فساد کو پرورش کرنے والی ہو، اُس کی زمین خیر کے بجائے شر کے لیے سازگار ہو تو ان حالات میں اکثر وبیشتر افراد کی تکمیلِ ذات

دشوار بلکہ محال ہے یہاں تک کہ بسا اوقات اس ماحول میں وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر ایک جلیل القدر پیغمبر پکار اٹھتا ہے کہ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝

اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ جماعت کو درست اور اجتماعی نظام کو پاک کیا جائے تاکہ بیشتر انسانی افراد کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو جس میں ان کی شخصیتیں صحیح نشو ونما پاسکیں حرام کی روٹی جس سے پرورش پائے ہوئے گوشت پوست کے لیے جنت حرام ہے اور جس کے حق میں نبیؐ صادق و مصدوق نے خبر دی ہے کہ آتشِ دوزخ ہی اس کے لیے اولیٰ ہے، آخر کوئی فرد اس سے کیوں کر بچے اور رزقِ حلال کہاں سے پائے جب کہ ایک غلط نظامِ معیشت نے رزق کے سارے چشموں کو گندہ کر دیا ہو؟ جاہلیت کے اخلاق اور افکار و اعمال جو انسان کے لیے ابدی خسران کے موجب ہیں، آخر کوئی شخص ان سے کس طرح محفوظ رہے جب کہ تمدن، معاشرت، تعلیم سب پر جاہلیت پورے زور کے ساتھ چھائی ہوئی ہو اور اس کا زہر وبائی سمیّت کی طرح سارے اجتماعی ماحول میں سرایت کر گیا ہو؟ معصیتِ خدا اور رسولؐ جس کے ساتھ کسی کمال کے حصول اور کسی شخصیت کے ارتقاء کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، آخر کوئی شخص اس سے کہاں تک پرہیز کر سکتا ہے جب کہ ایک کافرانہ نظامِ سیاست نے کامل تسلّط حاصل کر کے پوری پوری قوموں کو کفر اور ظلم اور فساد کی خدمت پر مجبور کر دیا ہو؟ پس فرد کی نجات و فلاح بہت مشکل بلکہ محال ہے اگر اس کی ترقی اور تکمیل کے راستے سے ان موانع کو دور نہ کیا جائے جو ایک بگڑے ہوئے اور فاسد نظامِ اجتماعی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں اور ایک ایسا صالح اجتماعی نظام نہ قائم کر دیا جائے جو اس تکمیل اور ترقی میں

مددگار ہو۔

اجتماعیّت۔ فرد کی امتحان گاہ

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے اور اسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ترقی اور تکمیل کا راستہ ہی اجتماعی زندگی کے اندر رکھا ہے نہ کہ اس کے باہر۔ فرد کی وہ امتحان گاہ جس میں اسے اپنی لیاقت یا نالائقی ثابت کرنی ہے اور جس میں کامیابی یا ناکامی ہی پر آخرت میں اس کی فلاح و خسران کا مدار ہے کسی خلوت کدے یا کسی سنسان جنگل میں واقع نہیں ہے بلکہ حیاتِ اجتماعی کے عین منجدھار میں واقع ہے اس کو اکیلا نہیں رکھا گیا ہے بلکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ بے شمار تعلقات کے رشتوں میں باندھ دیا گیا ہے۔ وہ کسی کا بیٹا، کسی کا بھائی، کسی کا شوہر، کسی کا باپ، کسی کا دوست، کسی کا دشمن، کسی کا ہمسایہ، کسی کا مستاجر، کسی کا حاکم، کسی کا محکوم، کسی کا بائع، کسی کا مشتری، کسی کا امین، کسی کا مؤتمن بنایا گیا ہے۔ اور اس کا امتحان ہی اس امر میں ہے کہ ان سب تعلقات میں بندھ کر ذمہ داریوں اور امانتوں کے بوجھ سے لد کر، خوف اور لالچ محبت اور غضب، امیدوں اور مایوسیوں کے ماحول میں رہ کر وہ کس طرح اللہ کے عائد کردہ حقوق اور فرائض ادا کرتا ہے، کس طرح اس کے مقرر کردہ حدود پر قائم رہتا ہے، کس طرح خلافت کے اس منصب سے عہدہ برآ ہوتا ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے، کن صفات کا اکتساب کرتا ہے، کن خصوصیات کو اپنے اندر نشوونما دیتا ہے اور اپنی سیرت و کردار کے کیسے نقوش دنیا میں چھوڑ کر جاتا ہے۔ نیکی کا تصور جو اسلام پیش کرتا ہے وہ ہر معنیٰ سے خالی ہو جاتا ہے اگر فرد کو اجتماعی زندگی سے الگ کر لیا جائے۔ جس شخص نے تمدنی

تعلقات کے جتنے کم شعبوں میں قدم رکھا ہے اور جتنی کم ذمہ داریاں لی ہیں، اس نے گویا اسی قدر کم پرچوں میں امتحان دیا ہے اور اسی لحاظ سے اپنی شخصیت کو اتنے ہی پہلوؤں میں تکمیل کے مواقع سے محروم کر لیا ہے۔ حتیٰ کہ جس نے خلوت میں رہبانیت کی زندگی گزاری اس نے اپنے امتحان کے اکثر و بیشتر پرچے سادہ اوراق کی صورت میں بھیج دیئے جن پر وہ سرے سے کوئی نمبر پانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔

اور بات صرف اتنی ہی نہیں کہ فرد کی تکمیلِ ذات اجتماعی زندگی کے اندر ہی ہو سکتی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بیشتر اور بزرگ تر احکام سرے سے تشنۂ تعمیل رہ جاتے ہیں اگر انسانی اجتماع کی زمام کار اہلِ خیر کے ہاتھ میں نہ ہو۔ تمدن اور سیاست اور معیشت کی عنانِ اقتدار پر باغیوں کا قبضہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ خدا کی شریعت معطل رہے، اس کی زمین میں صلاح کے بجائے فساد پھیلے، اس کی خلق میں امر بالمعروف کی جگہ امر بالمنکر ہو اور نہی عن المنکر کے بجائے نہی عن المعروف ہونے لگے۔ یہ وہ حالت ہے جس سے بڑھ کر اللہ کو مبغوض کوئی چیز نہیں اور کسی شخص کا اس حالت میں رہتے ہوئے یہ توقع رکھنا کہ خلوت کے مراقبوں اور ریاضتوں سے، یا نیکی اور تقویٰ کے چند مظاہر سے یا ان احکام کی تبلیغ سے جو کفار کے لیے نامرغوب نہ ہوں، اپنی ذات اور ارتقاءِ شخصیت کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ فرماں روائی کے مقام سے خدا کے باغیوں کو ہٹانے کی کوشش کی جائے اور سعی و جہد کی ساری قوتیں اس مقصد میں صرف کر دی جائیں کہ خدا کے ملک میں اس کی شریعت جاری ہو۔ اس کی زمین فساد سے پاک ہو کر خیر و صلاح سے بھر جائے اور اس کی خلق میں حکم معروف کا چلے اور منکر ضابطہ تعزیرات میں جگہ پائے۔

اسلام کا مطالبہ ـــ فرد سے

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جماعت اور اجتماعی زندگی کی اسلام میں کتنی بڑی اہمیت ہے لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اصل اہمیت فرد ہی کو حاصل ہے کیونکہ اجتماعی اصلاح کا قیام اور اجتماعی فساد کی بیخ کنی افراد ہی کی فلاح کے لیے مطلوب ہے۔

اس کے بعد یہ کہنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی کہ تمام نظامات فکر و عمل سے بڑھ کر اسلام انفرادی اصلاح و تزکیہ کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کا نقطۂ نظر ان نظامات سے بھی مختلف ہے جو جماعت سے قطع نظر کر کے فرد کو مجرد ہونے کی حیثیت سے لیتے ہیں اور اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ رکھ کر اس کو روحانی ارتقاء کے مدارج طے کرا دینا چاہتے ہیں۔ اور ان نظامات سے بھی جو فرد کی انفرادی حیثیت کو نظر انداز کر کے اس کی ذات کو محض جماعت کی خاطر اہمیت دیتے ہیں اور افراد کو صرف اس لیے تیار کرنا چاہتے ہیں کہ کسی اجتماعی مفاد کے حصول میں ان کی تربیت یافتہ قوتوں کو استعمال کرنا ہے ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے الگ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوع انسانی کا ایک ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خدا کے سامنے جواب دہ ہے اس لیے ہر فرد کو فرداً فرداً خدا کے سامنے اس کی جواب دہی بہت بڑی حد تک اجتماعی حقوق، فرائض اور ذمہ داریوں ہی سے متعلق ہے، اور آخری امتحان کی کامیابی کے لیے اس کا تیار ہونا بجائے خود بھی اجتماعی صلاح و فلاح پر منحصر ہے۔ اور خدا کی رضا حاصل کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی حدِ استطاعت میں فساد کو مٹانے اور خدا کے احکام اس کی زمین اور اس کی خلق پر جاری کرنے کا وہ فرض انجام نہ دے جو خلیفہ ہونے کی حیثیت سے

اس پر عائد کیا گیا ہے۔ لہٰذا فرد کی تیاری محض اپنی ذاتی اصلاح ہی کی حد تک نہ ہونی چاہیئے۔ بلکہ اس درجہ کی ہونی چاہیئے کہ وہ غیر صالح اجتماعی نظاموں سے لڑ سکے اور ایک صالح اجتماعی نظام کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کا اہل ہوتا اس میں پیدا ہو جائے۔

مگر صدیوں انحطاط سے مسلمانوں کے اندر جہاں اور بہت سے تغیرات ہوئے ہیں، تزکیۂ نفس کے باب میں بھی ان کا تصوّر اصل اسلامی تصور سے بہت کچھ مختلف ہو گیا ہے۔ ان کے مقصد میں بھی تغیّر آ گیا ہے۔ نقطۂ نظر بھی محدود ہو گیا ہے اور تزکیۂ نفس کے طریقے بھی ان طریقوں سے مختلف ہو گئے ہیں، جو عہدِ نبوت میں اختیار کیے گئے تھے اس کا نتیجہ ہے کہ تزکیۂ نفس کے بڑے بڑے ادارے اور سلسلے مدتوں سے قائم ہیں لیکن ان کی موجودگی ہی میں جاہلیت اپنی تلوار سے، اپنے قلم سے، اپنے علوم و فنون سے، اپنی تہذیب اور اپنے تمدّن سے نہ صرف دنیا کو بلکہ خود مسلمان ملکوں اور قوموں کو بھی فتح کرتی چلی گئی ہے اور چلی جا رہی ہے۔ آخر اس کمزوری کا سبب تو ضرور ہے، اور جو سبب بھی ہو اس کی تحقیق میں بے جا عقیدت مانع نہ ہونی چاہیے۔

ہمارے ہاں ایک بڑے گروہ کے نزدیک تزکیۂ نفس کا مقصد یہ رہا ہے کہ اسی زندگی میں مشاہدۂ حق نصیب ہو جائے اور ایمان بالغیب کے مقام سے ترقی کر کے ایمان بالشہادت کی دولت حاصل ہو۔ ظاہر نظر میں یہ ایک بلند ترین مقصد ہے لیکن قرآن نے کہیں ہم کو یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم اسے مقصود قرار دے کر اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر دیں بلکہ اس کے برعکس اگر ہم بطورِ خود اسے مقصود قرار دے بھی لیں تو قرآن ہمیں یقین دلاتا ہے کہ یہ گوہرِ مقصود اس زندگی میں نبیؐ کے سوا کسی کے ہاتھ نہیں آ سکتا۔

"(حقایقِ غیب کا جاننے والا اللہ ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا بجز اُس

رسول کے جس کو اس نے خود منتخب کیا ہو، پھر وہ اس کے آگے اور پیچھے نگرانی کرنے والے فرشتے لگا دیتا ہے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان رسولوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے" درحقیقت انسان کو ان حقایق کے جتنے اور جس قدر علم کی ضرورت تھی، اللہ نے وہ علم اپنے رسولوں کے ذریعہ سے دیدیا ہے۔ اور یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس طرح اس نے انسان کو ان چیزوں کی تلاش و جستجو کی زحمت سے بچا دیا۔ اب انسان کا کام یہ ہے کہ وہ رسولوں کے دیئے ہوئے علم پر ایمان بالغیب لائے اور جو خدمات اس کے سپرد کی گئی ہیں انھیں اطمینان کے ساتھ انجام دے۔

اس تزکیۂ نفس کا مقصد روحانی ترقی بھی بتایا جاتا ہے۔ مگر یہ روحانی ترقی کچھ ایسی مبہم اور پُراسرار چیز ہے کہ تمام عمر اس بھول بھلیاں میں گشت لگانے کے بعد بھی آدمی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس مقام پر پہنچا۔ اس کی اصطلاحیں، اس کی منزلیں اس کے ثمرات و نتائج سب رموز ہیں جن کو ہم جیسے عامی کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں اگر کچھ نظر آتا ہے تو وہ صرف یہ کہ اس راہ میں جو منزلیں طے کی جاتی ہیں، ان میں وہ منزل کبھی نہیں آتی جسے بلالؓ اور عمارؓ اور صہیبؓ نے طے کیا تھا اور نہ وہی منزل کبھی آنے کی توقع کی جا سکتی ہے جس کو ابوبکرؓ و عمرؓ نے طے کیا۔

اسلام کے مقصد سے قریب ترین مقصد ان لوگوں کا ہے جو تزکیۂ نفس سے تقویٰ کا حصول چاہتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک دوسری مصیبت پیش آجاتی ہے اور وہ یہ کہ تقویٰ کے متعلق بالعموم لوگوں کا نقطۂ نظر بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں چند مذہبی اعمال کی پابندی کرنے اور معمول سے کچھ زیادہ عبادت کر لینے سے تقویٰ کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس محدود تصور میں وسیع تر اجتماعی مسائل کے فہم و ادراک کی کوئی گنجائش

نہیں ہوتی۔

یہ وہ دنیائے عمل ہے جہاں ہر تیاری خود مقصد کی نوعیت سے متعین ہوتی ہے

قاعدے کی بات ہے کہ انسان تیاری اس مقصد کی مناسبت سے ہی کیا کرتا ہے جو اس کے پیش نظر ہو، تیاری بجائے خود کوئی معنیٰ نہیں رکھتی وہ ہمیشہ کسی نہ کسی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ مقصد کی نوعیت ہی اس کی نوعیت متعین کرتی ہے۔ مقصد کی وسعت یا محدودیت کے لحاظ ہی سے اس کا پیمانہ وسیع یا محدود ہوتا ہے، اور مقصد ہی کا مزاج تیاری کے ممکن طریقوں میں سے مناسب تر طریقے کا انتخاب کرتا ہے۔ بسا اوقات مختلف مقاصد کے لیے بڑی حد تک ایک ہی طرح کی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر مقصد کے لیے وہ ناگزیر ہوتی ہیں۔ لیکن اس ظاہری مماثلت کے اندر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے کہ مختلف مقاصد کی ملتی جلتی تیاریوں میں بھی ہر مقصد کی روح اپنی جداگانہ شان کے ساتھ کارفرما ہوتی ہے اور ابتدائی مرحلوں سے گزر کر تکمیلی مراحل جتنے جتنے قریب آتے جاتے ہیں، ان تیاریوں کے راستے بالکل ایک دوسرے سے الگ اور دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر دیکھیے، اسلحہ سازی ایک قسم کی تیاری ہے۔ آپ خواہ کسی غرض سے اسلحہ بنائیں بہر حال صنعت کے چند طریقے آپ کو وہی اختیار کرنے ہوں گے جو کسی دوسری غرض کے لیے اسلحہ بنانے والا اختیار کرے گا۔ لیکن ابتداء ہی سے وہ مقصد جس کے لیے آپ اسلحہ بنا رہے ہیں، آپ کی اس تیاری کے پیمانے اور اس کی نوعیت اور اس کے مناہج

کو ان دوسرے لوگوں کی تیاریوں سے مختلف کر دے گا جو دوسرے مقاصد کے لیے یہی کام کر رہے ہوں۔ فرض کیجیے آپ صرف ایک فنِ لطیف (فائن آرٹ) کی حیثیت سے خوبصورت اسلحہ تیار کرنا چاہتے ہیں جس سے آپ کا مقصد محض اپنے اور اپنی سی ذہنیت رکھنے والوں کے ذوقِ جمال کو تسکین دینا ہے، ایک دوسرا شخص پیشہ ور اسلحہ ساز ہے اور ایک تیسرا شخص اس لیے اسلحہ بناتا ہے کہ اُسے ایک فوج تیار کرنی ہے اور ان ہتھیاروں سے کوئی جنگی مقصد حاصل کرنا ہے۔ ان تین مختلف مقاصد کے لیے آپ اور وہ دونوں اسلحہ سازی کے بہت سے مشترک طریقے اختیار کریں گے، لیکن تینوں کے مقاصد کا اختلاف پہلے قدم ہی سے تینوں کی راہیں الگ کر دے گا اور تکمیلی مراحل کی طرف جتنا جتنا قدم بڑھے گا یہ راہیں ایک دوسرے سے بعید اور بعید تر ہوتی چلی جائیں گی۔

فنِ لطیف ہونے کی حیثیت سے آپ جو اسلحہ سازی کریں گے، اس میں آپ کے لیے نفیس نفیس تلواریں اور بندوقیں بنانا بجائے خود مقصود ہوگا۔ کسی دوسرے مقصد کے لیے ان کو آلہ و ذریعہ بنانے کا سوال نہ ہوگا۔ آپ کی نگاہ میں اصل اہمیت اسلحہ کی نفاست، خوشنمائی اور ستھرائی کی ہوگی، خواہ وہ کارزار میں اپنی کاٹ اور مار کے اعتبار سے بالکل ناقص ہی کیوں نہ ثابت ہوں۔ آپ اسلحہ سازی کے طریقوں میں سے اختیار صرف انھیں طریقوں کو کریں گے جن سے لطیف ترین، نازک ترین، حسین ترین ہتھیار بن سکیں اور عجائب دکھا کر ہر صاحب ذوق سے داد و تحسین لیں۔ ان طریقوں کی طرف تو نظر اٹھا کر دیکھنا بھی آپ کو گوارا نہ ہوگا جن سے بھاری بھرکم، ہولناک اور بھیانک قلعہ شکن ہتھیار اور میدان مار اسلحہ بنا کرتے ہیں۔ آپ کی تلواریں اس لیے نہ ہوں گی کہ صفوں کو اُلٹ دیں بلکہ اس لیے ہوں گی کہ ہوا میں ریشمی رومال کاٹ دیں

آپ آتش بار اسلحہ آتشباری کے لیے نہیں بلکہ آتشبازی کے لیے بنائیں گے۔ آپ کی توپ اس لیے نہ ہوگی کہ میدان جیتے بلکہ اس لیے ہوگی کہ اس کا گولہ آسمان پر جا کر پھٹے اور رنگ برنگ کے پھول برسائے۔ پھر آپ کے اس کارخانے کی کشش بھی ان خریداروں کو نہ کھینچے گی جنھیں لڑنے کے لیے ہتھیار درکار ہیں بلکہ کھینچے گی ان خوش ذوق لوگوں کو جو لڑائی بھڑائی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، محض آپ کی طرح آرٹ کے دلدادہ ہیں وہ آپ کے بنائے ہوئے اسلحے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور انھیں خوبصورت غلافوں میں لپیٹ کر اپنے کمرہ کی زینت بنائیں گے۔ بہت سے بہت اگر کوئی کام انھوں نے ان ہتھیاروں سے لیا بھی تو بس یہ کہ کچھ نشانہ بازی کی مشق کر لی، کچھ تلوار کے ہاتھ صاف کر لیے، کبھی کوئی جانور مار لیا اور کبھی تماشائیوں کے مجمع میں سپہ گری کے کمالات دکھا کر خراج تحسین وصول کر لیا۔

رہا پیشہ ور اسلحہ ساز تو وہ اچھے سے اچھے اسلحہ بنا کر سرِ بازار رکھ دے گا کہ جس کا جی چاہے قیمت دے اور خرید لے جائے۔ اس کی تلوار اس کے اپنے کام کی نہ ہوگی۔ خریدار کے کام کی ہوگی۔ وہ اس پر باڑھ رکھے گا اور خریدار اس کی کاٹ سے فائدہ اٹھائے گا۔ ہر قسم کے خریداروں کی ضروریات کے لیے اس کے کارخانے میں ہر قسم کے ہتھیار ملیں گے۔ شکاری شکار کے لیے، ڈاکو ڈاکہ زنی کے لیے، جہانگیر کشور کشائی کے لیے، مجاہد راہِ حق میں جہاد کے لیے وہاں سے ہتھیار پائے گا۔ وہ خود کسی مقصد خاص کا خادم نہ ہوگا بلکہ مقاصد دوسروں کے ہوں گے۔ اس بے مقصد اسلحہ سازی کا اثر لازماً صنعتِ اسلحہ کے طریقوں پر بھی پڑے گا۔ فن کے معلوم و معروف طریقے تو پوری مہارت کے ساتھ اس کارخانے میں استعمال کیے جائیں گے، لیکن کارزار میں کام

آنے کے لیے اسلحہ میں جن علمی خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے انھیں پیدا کرنے کا طریقہ اس پیشہ ورفن کار کو سرے سے معلوم ہی نہ ہوگا۔ اس کا حال وہی ہوگا جو گذشتہ جنگ عظیم میں امریکہ کے اسلحہ ساز کارخانوں کا تھا کہ بازار کے چلتے ہوئے اسلحے تو وہ خوب بنا سکتے تھے مگر کارزار کے عملی تجربوں سے جنگ آزما قوموں نے اسلحہ سازی میں جو کمالات پیدا کیے تھے ان کی ہوا تک ان پیشہ ور اسلحہ سازوں کے مال کو نہ لگی تھی۔ جیسا کہ مسٹر لائڈ جارج نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں امریکہ کے اسلحے اپنی چمک دمک اور شان اور نفاست سے نگاہوں کو خیرہ کرتے تھے مگر میدان کی امتحان گاہ میں ناکام ثابت ہوتے تھے۔

بخلاف اس کے جو شخص اسلحہ اس لیے بناتا ہے کہ اس کے پیش نظر ایک جنگی مقصد ہے جس کے لیے وہ اپنی فوج کو اپنے ہی ہتھیاروں سے مسلح کرنا چاہتا ہے، اس کا معاملہ آپ کے اور اس پیشہ ور اسلحہ ساز کے معاملہ سے قطعاً مختلف ہوگا۔ ڈھلائی اور صیقل گری اور آتش کاری کے ابتدائی اصول اس کے ہاں بھی وہی ہوں گے جو آرٹسٹ اور پیشہ ور کے ہاں ہوں گے۔ مگر ان کا استعمال اس کے ہاں بالکل مختلف طور پر ہوگا۔ اس کو اسلحہ کی نفاست و خوشنمائی کی اتنی پروا نہ ہوگی جتنی ان کی کاٹ اور مار کی ہوگی۔ کوئی ہتھیار چاہے کتنا ہی خوشنما ہو اگر میدان کی آزمائش میں پورا نہ اتر سکے تو وہ اس کے کسی کام کا نہ ہوگا۔ البتہ بھونڈے سے بھونڈا ہتھیار بھی اس آزمائش میں پورا اتر سکے تو اس کی نظر میں نہایت پسندیدہ ٹھہرے گا۔ اسے مظہر العجائب ہتھیاروں کی حاجت نہ ہوگی۔ بس کارگر ہتھیار مطلوب ہوں گے۔ اسے وہ توپ درکار ہوگی جس کا گولہ قلعوں کو پاش پاش کر دے، چاہے اس سے پھول ایک بھی نہ جھڑے۔ اس کو وہ تلوار مرغوب

ہوگی جو دشمن کے اندر دو بش تا کمر اُتر جائے چاہے چمک کا نام بھی اس میں نہ ہو اور ہوا کے رومال کا ایک تار بھی نہ کاٹ سکے۔ ان خوبیوں کے ساتھ اگر ستھرائی اور نفاست و خوشنمائی بھی ہو تو کیا کہنے مگر مقابلتہً وہ کارگر مگر بھونڈے ہتھیار کو حسین مگر کند ہتھیار پر ہزار درجہ ترجیح دے گا پھر وہ صناعت اسلحہ سازی کے معلوم و متعارف طریقوں کا بھی غلام نہ ہوگا۔ بلکہ میدان کے تجربوں پر انھیں پرکھے گا اور ان تجربات کی روشنی میں اصول صناعت کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقوں سے استعمال کرنے کی کوشش کرے گا خواہ وہ فن کے مروجہ طریقوں کے بالکل خلاف ہی کیوں نہ ہوں پھر ان کا مقصد ہی یہ متعین کرے گا کہ صناعتِ اسلحہ سازی کے اصول پر جن اقسام کے ہتھیار بننے ممکن ہیں ان میں سے کس قسم کے ہتھیار بنائے اور کس قسم کے نہ بنائے ہوئے بہت سے وہ ہتھیار جو فن لطیف کی اغراض کے لیے یا پیشہ ور کی دوکان کے لیے عین مطلوب ہے، سرے سے اس کے کارخانہ کی اسکیم میں جگہ ہی نہ پائیں گے۔ اور بہت سے ان ہتھیاروں کو اس کے ہاں سرفہرست جگہ ملے گی جنھیں بنانے کی ضرورت نہ فن کار محسوس کرتا ہے نہ پیشہ ور پھر وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس بات کا تصور تک نہ کر سکے گا کہ اپنے بنائے ہوئے ہتھیار اپنے دشمنوں کے ہاتھ بیچ دے۔ فن کار اپنے فن میں مگن ہوتا ہے اس کا کسی کارزار سے تعلق ہی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کا دوست یا دشمن ہو۔ پیشہ ور ہر خریدار کا نیازمند ہوتا ہے، اس کو اس سے کیا بحث کہ خریدنے والے اس کا بنایا ہوا مال کس غرض سے خرید رہے ہیں۔ مگر یہ جنگ آزما اسلحہ ساز تو میدان میں دوست بھی رکھتا ہے اور دشمن بھی، اس کے لیے تو نا ممکن ہے کہ اپنا ایک تیر بھی دشمن کے ترکش میں جاتا دیکھ سکے۔ جب اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کا کارخانہ دشمن کے ہاتھ پکڑ کر اس کے لیے اسلحہ بنائے گا تو یہ

خود اسے اپنے ہاتھ سے ڈائنامیٹ لگا کر اُڑا دیتا ہے اور اس بات کی کچھ پروا نہیں کرتا کہ میں نے برسوں کی محنت اور اربوں روپے کے صرف سے یہ کارخانہ بنایا تھا۔

جس طرح اسلحہ سازی ایک قسم کی تیاری ہے اسی طرح تزکیۂ نفس بھی ایک قسم کی تیاری ہی ہے۔ تزکیہ کے دو معنٰی ہیں پاک صاف کرنا اور نشو و نما دینا۔ ان دونوں معنوں کے لحاظ سے تزکیۂ نفس کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو غیر مطلوب صفات سے پاک کیا جائے اور مطلوب صفات کی آبیاری سے اس کو پروان چڑھایا جائے پس درحقیقت تزکیۂ نفس اور اخلاقی تیاری دونوں ہم معنٰی ہیں اب یہ ظاہر ہے کہ جس طرح دوسری تمام تیاریوں کے معاملہ میں "تیاری بجائے خود" ایک مہمل چیز ہے، اسی طرح یہ اخلاقی تیاری بذات خود مہمل ہے تاوقتیکہ یہ بات واضح طور پر معین نہ ہو کہ تیاری کس مقصد کے لیے ہے۔ مقصد ہی اس امر کا فیصلہ کرنے والی چیز ہے کہ کون سی صفات اس کے حصول میں مددگار ہیں جن کو نشو و نما دینے کی سعی کی جائے۔ مقصد ہی اس بات کا تعین کرتا ہے کہ کس پیمانے کا انسان درکار ہے جسے بنانے کی کوشش کی جائے اور کس پیمانے کے انسان غیر مفید یا ناکافی ہیں جن کے بنانے کی یا تو کوشش ہی نہ ہو، یا جن کے بن جانے پر اکتفا نہ کیا جائے۔ مقصد ہی کی نوعیت پر اس سوال کا فیصلہ بھی منحصر ہے کہ تزکیۂ نفس کے طریقوں میں سے کون سا طریقہ پیمانۂ مطلوب کے انسان تیار کرنے کے لیے مناسب تر ہے اور تزکیہ کی تدابیر میں سے کن کن تدبیروں کو کس تناسب کے ساتھ استعمال کیا جائے کہ اس پیمانے کے انسان ڈھل سکیں۔

تزکیۂ نفس اور انسان کا نصب العین

یہ مقصد کا سوال اس تزکیۂ نفس کے مسئلہ میں اتنا اہم ہے کہ نہ صرف تزکیہ کی نوعیت اور اس کے پیمانہ اور اس کی منہاج ہی کا اس پر انحصار ہے، بلکہ فی الحقیقت

یہ سب کچھ قرآن کے منشاء کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ مؤلف نے یہ نہیں سمجھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کے بنائے ہوئے امیر نہیں تھے نہ خود بن گئے تھے بلکہ خدا کے مقرر کیے ہوئے امیر تھے۔ آپؐ کی امارت آپؐ کی رسالت سے الگ نہ تھی۔ دراصل آپؐ رسولِ خدا کی حیثیت ہی سے امیر تھے بلکہ صحیح یہ ہے کہ آپؐ امیر نہیں بلکہ مامور من اللہ تھے۔ مؤلف نے اسی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ اسی لیے رسول اللہ کی حیثیت امارت کو عام امراء کی سی حیثیت امارت سمجھ لیا۔

اپنے اس خیال کی تائید میں مؤلف نے قرآن کی جن آیات سے استدلال کیا ہے ان کو بھی وہ ٹھیک نہیں سمجھے ہیں۔ بلا شبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا مگر وہ اس لیے تھا کہ آپ اپنی امت کے لیے مشاورت کا نمونہ پیش کریں اور خود اپنے عمل سے جمہوریت (DEMOCR ACY) کے صحیح اصول کی طرف رہنمائی کریں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ آپ کی حیثیت دوسرے امراء کی سی ہے۔ دوسرے امراء کے لیے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مشورہ سے کام کریں۔ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (الشوریٰ:۔۴) اور یہ کہ اگر شوریٰ میں نزاع ہو تو وہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کریں۔ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ (النساء:۔۸) لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جب آپ کسی چیز کا عزم فرمالیں تو خدا پر بھروسہ کر کے عمل کا اقدام فرمائیں فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران:۔۱۷)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے، بلکہ آپ کو شوری کا حکم صرف اس لیے دیا گیا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرز حکومت کی بنیاد پڑ جائے۔

رہی یہ بات کہ امیر کی حیثیت سے آنحضرت صلعم کی اطاعت صرف آپ کے عہد تک تھی، تو یہ بھی غلط ہے کہ جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اس سے یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ مؤلف نے۔ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ سے یہ سمجھا ہے کہ اطاعت رسول کا حکم صرف ان لوگوں کو دیا گیا تھا جو اس وقت اس حکم کو سن رہے تھے۔ لیکن اگر وہ سورۂ انفال کو ابتدا سے پڑھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ وہاں مقصود ہی کچھ اور ہے۔ ابتداء میں فرمایا گیا ہے کہ۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ہ" اگر ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو"۔ پھر ان لوگوں کو ڈانٹا گیا ہے جو رسول اللہ کی دعوتِ جہاد پر دلوں میں کڑھتے تھے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ۔

وَمَنْ یُّشَاقِقِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ہ (الانفال-۲)	اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول سے جھگڑا کرتا ہے اسے معلوم ہو جائے کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

اس کے بعد یہ ارشاد ہوا ہے :۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ہ (الانفال -۳)	اے ایمان لانے والو اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور رسول کے حکم سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔

اس آیت میں اور پچھلی تمام آیات میں رسول کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا ذکر بار بار کیا گیا جس سے یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ رسول اللہ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے پھر ہر جگہ لفظ رسول آیا ہے ، امیر کا لفظ کسی جگہ بھی استعمال نہیں کیا گیا اور نہ کوئی مخفی سے مخفی اشارہ ایسا موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہاں رسول سے مراد رسول کی ایسی امیرانہ حیثیت ہے جو رسالت سے مختلف ہو پھر رسول کے حکم سے منہ موڑنے کو منع کیا گیا ہے جس پر سخت عذاب کی دھمکی اوپر دی جا چکی ہے اس کے بعد وَاَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ کہنے کا منشاء صاف یہ ہے کہ تم ہمارے ان تاکیدی احکام کو سنتے ہوئے ہمارے رسول کی اطاعت سے کبھی منہ نہ موڑو ، اس وَاَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ کے مخاطب صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس وقت موجود تھے ۔ بلکہ قیامت تک جو لوگ ایمان کے ساتھ قران کو سنیں گے ان سب پر لازم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم ان کو پہونچے اس کے آگے سر تسلیم خم کریں ۔

اور یہ جو مؤلف نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض امارت اسی طرح ہنگامی ہیں جس طرح دوسرے امراء کے ہوا کرتے ہیں ۔ کیوں کہ آج ہم جہاد میں بدر و احد کی طرح نیزہ و شمشیر سے نہیں لڑ سکتے ۔ تو یہ بہت ہی عجیب بات ہے ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں جن اسلحہ سے کام لیا وہ اسلحہ تو ضرور ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتے تھے لیکن حضورؐ نے اپنی لڑائیوں میں جو اخلاقی ضوابط برتے تھے اور جن ضوابط کو برتنے کی ہدایت فرمائی تھی وہ کسی عہد کے لیے مخصوص نہ تھے بلکہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک

دائمی قانونِ جنگ بنا دیا ہے۔ شرعی نقطۂ نگاہ سے یہ سوال اہمیت نہیں رکھتا کہ آپ تلوار استعمال کرتے ہیں یا بندوق یا توپ، بلکہ اہمیت اس سوال کی ہے کہ آپ اپنے اسلحہ کس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور کس طرح ان سے خونریزی کا کام لیتے ہیں۔ اس باب میں جو نمونہ آنحضرت صلعم نے اپنے غزوات میں پیش فرمایا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اسلامی جہاد کا ایک مکمل نمونہ ہے اور معنوی حیثیت سے سرور عالمؐ قیامت تک کے لیے ہر مسلمان فوج کے سپہ سالارِ اعظم ہیں۔

مؤلف نے امارت اور رسالت میں ایک فرق اور بھی بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے امراء سے نزاع اور اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے اب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امیرانہ حیثیت ویسی ہی ہے جیسی دوسرے امراء کی ہے تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کسی مسلمان کو نزاع کا حق حاصل تھا؟ جس امیر کے مقابلے میں آواز بلند کرنے تک کی اجازت نہ تھی اور جس کے مقابلہ میں محض اونچی آواز سے بولنے پر تمام عمر کے اعمال غارت ہو جانے کی دھمکی دی گئی تھی (حجرات۔ ۱) اور جس سے جھگڑا کرنے والے کو دوزخ میں جھونک دیئے جانے کا خوف دلایا گیا تھا (النساء ۔ ۱۷) کیا اس امیر سے منازعت کرنے کا حق کسی مسلمان کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو کہاں اس امیر کی امارت اور کہاں ان امراء کی امارت جن سے منازعت کا حق مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

مؤلف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت امارت اور عام امراء کی حیثیتِ امارت میں قطعاً کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے حتیٰ کہ ان تمام احکام

کو جو اطاعت رسول سے متعلق ہیں۔ اطاعت امیر کے احکام قرار دے دیا ہے۔
صفحہ ۱۵۷ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

"اللہ اور رسول کے الفاظ قرآن میں اکثر جہاں جہاں ساتھ آئے ہیں ان سے مراد امارت ہے جس کا قانون کتاب اللہ ہے اور جس کے نافذ کرنے والے رسول اللہ یا ان کے جانشین ہیں۔ مثلاً : یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ہ (۸-۱) مال غنیمت کا حکم صرف عہد رسالت تک محدود نہ تھا بلکہ آئندہ کے لیے بھی ہے جس کی تعمیل خلافت کا فریضہ ہے۔"

پھر فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کے متعلق صفحہ ۱۵۸ پر حاشیہ لکھتے ہیں:-

"آخری اختیار اللہ ورسول یعنی امارت ہے اس لیے رسول اللہ کا جو منصب بحیثیت امیر کے ہے وہی ان کے خلفاء کا بھی ہوگا۔"

یہ حق سے صریح تجاوز ہے۔ قرآن مجید میں اطاعت خدا، اطاعتِ رسول اور اطاعت اولی الامر کے تین مراتب بیان کیے گئے ہیں۔ اطاعتِ خدا سے مراد قرآن مجید کے احکام کی اطاعت ہے۔ اطاعت رسول سے مراد رسولِ مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل کی پیروی ہے اور اطاعت اولی الامر سے مراد مسلمانوں کے امراء اور اربابِ حل وعقد کی اطاعت ہے۔ پہلے دونوں

مراتب کے متعلق قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ خدا اور رسول کے احکام میں کسی چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔ مسلمانوں کا کام سننا اور اطاعت کرنا ہے خدا اور رسول کے فیصلہ کے بعد کسی مسلمان کو یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرے۔ رہا تیسرا مرتبہ تو اس کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت خدا اور رسول کے احکام کے تابع ہے اور نزاع کی صورت میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔ ایسے صاف اور کھلے ہوئے احکام کے موجود ہوتے ہوئے اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا اور رسول سے مراد امارت لی جائے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب امارت کو اس امارت کے ساتھ ملا دیا جائے جو مسلمانوں کے عام امراء کو حاصل ہے۔ اس معاملہ میں قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ "اموال غنیمت خدا اور رسول کے لیے ہیں" کہنے کا مدعا یہ ہے کہ خدا اور رسول نے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کیا ہے اس کے مصالح میں یہ غنائم صرف کیے جائیں اس سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد امارت ہے۔

حدیث کے متعلق مؤلف کا مسلک

حدیث کے متعلق مولف نے قریب قریب وہی مسلک اختیار کیا ہے جو منکرین حدیث کے ایک بڑے گروہ کا مسلک ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "تعلیم کتاب کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ رسول اس کے احکام پر عمل کر کے دکھا دے تاکہ امت اسی نمونہ پر عامل ہو جائے۔

باب چہارم

محاسبۂ نفس، مجاہدۂ نفس، اور تعلق باللہ

تزکیۂ نفس کا سفر محض علم و مطالعہ سے مکمل نہیں ہوتا،

بلکہ یہ ایک مسلسل **روحانی محاسبہ**، **نفس کے خلاف جدوجہد**، اور **اللہ سے وابستگی** کا عملی راستہ ہے۔

یہی وہ راہ ہے جس پر چل کر انسان باطنی طہارت، قلبی سکون، اور روحانی کمال حاصل کرتا ہے۔

محاسبۂ نفس — اصلاحِ باطن کی بنیاد

محاسبۂ نفس کا مطلب ہے کہ انسان اپنے نفس، نیت، اور اعمال کا روزانہ جائزہ لے۔

یعنی یہ دیکھے کہ اس نے دن بھر میں کیا نیکیاں کیں اور کہاں لغزش ہوئی۔

حضرت عمرؓ بن الخطاب فرمایا کرتے تھے:

"حاسِبوا أنفسَكُم قبلَ أن تُحاسَبوا"

"اپنے نفس کا محاسبہ خود کرو، اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے۔"

یہی وہ احساسِ احتساب ہے جو انسان کو گناہ سے بچاتا اور خیر کی راہ پر استقامت عطا کرتا ہے۔

محاسبۂ نفس ایک **روحانی آئینہ** ہے،

جس میں بندہ اپنے اخلاق، نیت، اور ایمان کی کیفیت دیکھ سکتا ہے۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے:

بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ *(القیامۃ: 14)*

"بلکہ انسان خود اپنے نفس پر خوب باخبر ہے۔"

یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ کوئی انسان اپنے باطن سے غافل نہیں.

اللہ نے اس کے اندر وہ روشنی رکھی ہے جو اسے اپنی غلطی کا احساس دلاتی ہے،

بس شرط یہ ہے کہ وہ سچائی سے اپنا جائزہ لے۔

قرآن کی روشنی میں مجاہدۂ نفس

مجاہدۂ نفس سے مراد ہے اپنے نفس کی خواہشات، غصہ، حسد، اور حرص کے خلاف **مسلسل** جد وجہد۔

یہی وہ میدان ہے جہاں انسان کی روحانی قوت پروان چڑھتی ہے۔

قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَٱلَّذِينَ جَٰهَدُوا۟ فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا *(العنکبوت: 69)*

''اور جو لوگ ہمارے راستے میں جہاد کرتے ہیں، ہم ضرور انہیں اپنی راہیں دکھاتے ہیں۔''

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ جو بندہ اپنے نفس سے لڑتا ہے،

اللہ تعالیٰ خود اس کے دل کو ہدایت، سکون، اور استقامت عطا فرماتا ہے۔

مجاہدۂ نفس — افضل الجہاد

وَمَن جَاهَدَ فَإِنَّمَا يَجْهَدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ

(سورۃ عنکبوت:6)

اور جو شخص جہاد کرے تو در حقیقت وہ اپنے ہی فائدے کے لئے جہاد کرتا ہے، بے شک اللہ سب عالموں سے بے نیاز ہے۔"

جد وجہد کرنا اور اپنے نفس پر قابو پانا سب سے پہلے اس کے اپنے فائدے میں ہے۔

اللہ تعالیٰ اس جہاد کے ذریعے انسان کو نیکی اور تقویٰ کی راہ پر لے جاتے ہیں۔ بلکہ **خواہشاتِ نفس پر قابو پانے** سے شروع ہوتا ہے۔
جب بندہ اپنے دل کی بغاوت کو مطیعِ الٰہی بنالیتا ہے، تو یہی اس کا سب سے بڑا روحانی غلبہ ہوتا ہے۔

حبِّ الٰہی — تزکیہ کا مقصودِ اعلیٰ

تزکیہ اور مجاہدہ کا مقصد صرف گناہوں سے بچنا نہیں، بلکہ **اللہ کی محبت** حاصل کرنا ہے۔
حبِّ الٰہی وہ روحانی قوت ہے جو انسان کو بندگی میں لذت اور قربِ الٰہی میں تسکین عطا کرتی ہے۔

قرآن فرماتا ہے:

وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ *(البقرۃ: 165)*
"اور جو لوگ ایمان لائے، وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔"

جب دل میں اللہ کی محبت راسخ ہو جاتی ہے، تو انسان کی ترجیحات، خواہشات، اور مقصدِ زندگی سب بدل جاتے ہیں۔
وہ اپنے ہر عمل میں اللہ کی رضا تلاش کرتا ہے. یہی محبت بندگی کو عبادت، اور عبادت کو معرفت میں بدل دیتی ہے۔

اللہ کی راہ میں استقامت و ایقان

اللہ کی محبت کا تقاضا صرف جذبات نہیں بلکہ **استقامت، صبر، اور ایقان** ہے۔
راہِ الٰہی میں آزمائشیں آتی ہیں — کبھی محرومی، کبھی مخالفت، کبھی تنہائی۔
مگر جو بندہ ان حالات میں بھی اپنے ایمان پر قائم رہے، وہ اللہ کا سچا محبوب بن جاتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

إِنَّ ٱلَّذِينَ قَالُواْ رَبُّنَا ٱللَّهُ ثُمَّ ٱسْتَقَـٰمُواْ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ *(الاحقاف: 13)*
"یقیناً جنہوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ اس پر قائم رہے، ان پر نہ کوئی خوف ہے نہ غم۔"

یہی استقامت دراصل محبتِ الٰہی کی علامت اور تزکیۂ نفس کا حاصل ہے۔

دعا — دعا ایمان کی روح اور بندگی کی علامت ہے۔

یہ وہ رشتہ ہے جو بندے کو براہِ راست اپنے رب سے جوڑتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ

(جامع الترمذی)

"دعا دراصل عبادت ہی ہے۔"

دعا نہ صرف حاجت کا وسیلہ ہے بلکہ روح کی غذا بھی ہے۔ یہ دل کو انکسار، امید، اور یقین سے بھر دیتی ہے۔

جب بندہ اللہ کے حضور عاجزی سے جھکتا ہے تو اس کے دل کی میل دھل جاتی ہے اور روح تازہ ہو جاتی ہے۔

ہر حال میں دعا اور انابت

سچا مومن ہر حال میں اللہ کی طرف **انابت (رجوع)** کرتا ہے . چاہے خوشی ہو یا غم، آسانی ہو یا آزمائش۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَفِرُّوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ *(الذاریات: 50)*

"اللہ ہی کی طرف دوڑو (رجوع کرو)۔"

یہی "انابت" دراصل بندگی کی معراج ہے۔

جب بندہ اپنی ہر کامیابی اور ناکامی میں اللہ کو یاد رکھتا ہے، تو اس کے دل میں شکوہ نہیں، شکر پیدا ہوتا ہے۔

دعا اور انابت کا تسلسل ہی انسان کو روحانی پختگی عطا کرتا ہے. یہی تعلق باللہ کا جوہر، اور تزکیۂ نفس کا حاصل ہے۔

یہ باب ہمیں سکھاتا ہے کہ تزکیۂ نفس کا سفر تین بنیادی ستونوں پر قائم ہے:

1. **محاسبۂ نفس** — اپنے اعمال کا روزانہ جائزہ

2. **مجاہدۂ نفس** —خواہشات پر قابو اور صبر کی مشق

3. **تعلق باللہ** —دعا، محبت، اور انابت کے ذریعے قربِ الٰہی

جب یہ تینوں پہلو انسان کی زندگی میں جمع ہو جائیں، تو دل منور، عمل مخلص، اور زندگی بامعنی بن جاتی ہے۔

ایسا بندہ نہ صرف خود سنورتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے روشنی کا مینار بن جاتا ہے۔

محاسبہ

دینی اور شرعی اصطلاح میں محاسبہ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے کیے ہوئے اعمال کا جائزہ اور سختی کے ساتھ ان کا حساب لے، یہ حساب اعمال کی کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے لینا ضروری ہے۔ کمیت کے معنی یہ ہیں کہ اس پر کتنے کاموں کی ذمہ داری تھی اور اس نے کتنے کام انجام دیئے اور کیفیت کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح انھیں انجام دینا چاہیے تھا اسی طرح انجام دیئے ہیں یا کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ یہ جائزہ اور محاسبہ روزانہ ہونا چاہیے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے شریکِ تجارت سے حساب لینے کی مثال سامنے رکھ کر محاسبۂ نفس کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہم یہاں اس کی تلخیص پیش کرتے ہیں:

"اللہ کے بندوں کو دن کے آخری کسی حصے میں اپنے ان اعمال اور حرکات و سکنات کا نفس سے حساب لینا چاہیے جو دن بھر میں انھوں نے کیے ہیں جس طرح دنیا کی تجارت میں، تاجر لوگ اپنے شرکائے تجارت سے حساب لیتے ہیں خواہ وہ سال کے آخر میں حساب کتاب کرتے ہوں یا ہر ماہ یا ہر روز۔ وہ یہ حساب اس اندیشے سے لیتے ہیں کہ کہیں شرکائے تجارت انھیں نقصان نہ پہنچا دیں اور دوسرا محرک یہ ہوتا ہے کہ اپنے نفع کا اندازہ

ہوتا رہے۔ جب اس فانی اور عارضی دنیا کے نفع و نقصان کا حساب ضروری سمجھا جاتا ہے تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ عاقل انسان اس حساب سے جان چرائے جس کے نفع و نقصان سے اس کی ابدی سعادت یا بدبختی وابستہ ہے، کسی شریکِ تجارت سے محاسبہ کے معنی یہ ہیں کہ راس المال یعنی اصل پونجی اور پھر تجارت میں نفع و نقصان کا جائزہ لیا جائے۔ اگر نفع ہوا ہو تو شریک سے نفع وصول کیا جائے اور اس کا شکریہ ادا کیا جائے اور اگر نقصان ہوا ہو تو شریک کو تاوان ادا کرنے پر مجبور کیا جائے اور آئندہ کے لیے تلافیٔ مافات کا مطالبہ کیا جائے۔ اس مثال کو سامنے رکھ کر سمجھو کہ دین میں بندۂ خدا کا راس المال فرائض ہیں اور نوافل و فرائض کی حیثیت نفع کی اور معصیت و نافرمانی کی حیثیت نقصان کی ہے۔ پورا دن اس تجارت کا زمانہ یا موسم ہے اور خود اس کا اپنا نفس اس کا وہ شریک ہے جس سے حساب لینا ہے۔ سب سے پہلے فرائض کا حساب لینا چاہیے۔ اگر تمام فرائض اس نے ٹھیک ٹھیک ادا کیے ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور نفس کو ترغیب دینی چاہیے کہ اسی طرح وہ آئندہ بھی ادا کرتا رہے، اگر کوئی فرض چھوٹ گیا ہو تو اس سے قضا کا مطالبہ کرنا چاہیے اور اگر کسی فرض کو ناقص طور پر ادا کیا ہو تو اس کو مکلف بنانا چاہیے کہ نوافل سے اس کمی کو پورا کرے اور اگر اس سے کوئی معصیت ہو گئی ہو تو صرف ملامت پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ اس کی تلافی پر اس کو مجبور کرنا چاہیے جس طرح انسان نقصان کی صورت میں شریک کو تاوان ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے اور جس طرح تجارت میں دمڑی اور چھدام تک کا حساب کیا جاتا ہے اسی طرح یہاں بھی تمام جزئیات

اور چھوٹی چھوٹی باتوں کا حساب لینا چاہیے تاکہ نفس آئندہ کے لیے چوکنا رہے اور غفلت نہ کرے۔ اس حساب میں انسان کو میدانِ حشر کا نقشہ سامنے رکھنا چاہیے اور وہاں کے نفسی نفسی کا عالم اس کے روبرو ہونا چاہیے۔ دن بھر کے تمام اعمال، حرکات وسکنات، نشست و برخاست، سکوت اور گفتگو غرض جو کچھ بھی اس نے کیا ہو سب کا حساب اور جائزہ ضروری ہے (۱)

قرآن میں محاسبے کا حکم

امام غزالی رحمہ اللہ نے سورۂ الحشر کے آخری رکوع کی یہ آیت نقل کی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور ہر متنفس کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کل (قیامت) کے لیے کیا بھیجتا ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

یہ دیکھنا اور اس پر غور کرنا کہ انسان نے کل قیامت کے لیے کیا بھیجا ہے اور کیا بھیج رہا ہے، محاسبۂ نفس ہے، اس محاسبے سے پہلے بھی تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے اور بعد کو بھی، پہلے حکم کا اشارہ اس طرف ہے کہ جب تک انسان کے دل میں اللہ کا خوف نہ ہو وہ محاسبۂ نفس پر آمادہ ہی کب ہوگا؟ اگر خدانخواستہ دل، خوفِ خدا اور محاسبۂ آخرت سے خالی ہو تو محاسبۂ نفس کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ محاسبے کے بعد تقویٰ کے حکم کا اشارہ اس طرف ہے کہ محاسبہ اللہ سے ڈرتے ہوئے کرنا چاہیے ورنہ انسان کا نفس اتنا بڑا مکار ہے کہ طرح طرح کے بہانے اور عذر تراش کر انسان کو مطمئن کرنے

---

(۱) احیاء العلوم ج ۴ ص ۲۵۳

..... کی کوشش کرتا ہے۔ امامِ موصوف نے دوسری آیت یہ پیش کی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝
(الاعراف ع ۲۴)

جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال اگر انھیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لیے صحیح طریقۂ کار کیا ہے۔

"چوکنا ہو جانا" محاسبۂ نفس ہی کا اثر ہے۔

محاسبۂ نفس کا ذکر احادیث و آثار میں

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے اور عاجز وہ ہے جو اپنی خواہش نفس کے پیچھے چلے اور اللہ پر تمنا کرے (۱)

(۲) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ازالۃ الخفا میں ابوبکر بن شیبہ، ابو طالب مکی، شہاب الدین سہروردی اور ایک جماعت کے حوالے سے جس میں امام غزالی بھی داخل ہیں حضرت فاروقِ اعظمؓ کا قول محاسبۂ نفس کے بارے میں نقل کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

اس سے پہلے کہ قیامت میں تمہارا احساب کیا جائے اپنے نفس سے محاسبہ کرو اور اس سے پہلے کہ میزانِ حشر میں تمہارے اعمال تولے جائیں یہاں دُنیا میں اپنے اعمال کو تولو اور اللہ کے سامنے اس بڑی پیشی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرو جب تم خدا کے سامنے پیش کیے جاؤ گے، اور تمہاری کوئی چیز مخفی نہیں

---

(۱) ریاض الصالحین

رہے گی (۱)

کوتاہیوں کا کفارہ

بعض صحیح حدیثوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ عہدِ رسالت میں صحابۂ کرامؓ نے اپنی کوتاہیوں کا کفارہ بطورِ خود ادا کیا ہے۔ یہ کفارہ مالی بھی ہوتا تھا اور بدنی بھی، مالی کفارہ کے معنی یہ ہیں کہ اپنا مال صدقہ کر کے کوتاہیوں کی تلافی کی جائے، اور بدنی کفارے کے معنی یہ ہیں کہ تنبیہ کے لیے جسم کو ایسی سزا دی جائے جو حدودِ شرع کے اندر ہو یا بطورِ تلافی کوئی مزید بدنی عبادت وطاعت اپنے اوپر لازم کی جائے۔ صحابہؓ اور دیگر بزرگوں کے سوانح حیات میں اس طرح کے کفاروں کا ذکر ملتا ہے۔ عقلاً بھی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ انسانی نفس کی مثال سرکش گھوڑے کی ہے، اس کے منہ میں جب تک خاردار لگام نہ ڈالی جائے وہ بمشکل سیدھا ہوتا ہے۔

(۱) حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا واقعہ

ایک دن ابوطلحہؓ اپنے ایک باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتنے میں ایک پرندہ اڑا اور باغ سے نکلنے کی جگہ تلاش کرنے لگا، باغ اتنا گھنا تھا کہ اسے نکلنے کی جگہ نظر نہیں آرہی تھی ابوطلحہ کو یہ منظر بہت اچھا لگا اور وہ تھوڑی دیر تک پرندے کو اِدھر اُدھر پرواز کرتے دیکھتے رہے پھر جب وہ اپنی نماز کی طرف متوجہ ہوئے تو یہ بھول چکے تھے کہ انھوں نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔ اب انھیں احساس ہوا کہ وہ اپنے باغ کی وجہ سے ایک فتنے میں مبتلا ہو گئے، نماز سے فارغ ہو کر وہ نبی صلی اللہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اس کے بعد کہا، یا رسول اللہ

---

(۱) ازالۃ الخفاج ۳

وہ باغ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے، آپ جہاں چاہیں اسے صرف فرمائیں (۱)

(۲) قبیلۂ انصار کے ایک اور شخص کا واقعہ

کھجور کے درختوں میں پھل آنے کا زمانہ تھا اور مدینے کی وادیوں میں سے ایک وادی قُف ہے اس میں قبیلۂ انصار کے ایک شخص کا باغ تھا ایک دن وہ اس باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ان کی نظر کھجور کے درختوں پر پڑی، درخت کھجوروں سے لدے ہوئے تھے اور ایسا نظر آتا تھا کہ انھیں پھلوں کے طوق پہنا دیئے گئے ہیں۔ اس منظر سے ان کا دل بہت خوش ہوا۔ اب جو نماز کی طرف متوجہ ہوئے تو رکعتیں بھول چکے تھے۔ انھوں نے دل میں کہا کہ میرے اس مال نے مجھے فتنے میں مبتلا کردیا۔ وہ حضرت عثمانؓ بن عفان کے پاس گئے جو اس زمانے میں خلیفہ تھے۔ انھوں نے واقعہ سنایا اور کہا کہ وہ باغ صدقہ ہے آپ اسے خیر و صلاح کے کاموں میں صرف فرمائیں، حضرت عثمانؓ بن عفان نے اس کو پچاس ہزار میں فروخت کیا اس کے بعد اس باغ کا نام ہی خمسین الف (پچاس ہزار) پڑ گیا (۲)

اب میں احیاء العلوم ج ۴ ص ۲۵۵ سے چند مزید واقعات کے ترجمے پیش کرتا ہوں

(۳) ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نماز عصر کی جماعت فوت ہوگئی اس کے کفارے میں انھوں نے اپنی ایک بہت قیمتی زمین صدقہ کردی۔

(۴) ہر شب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے قدموں پر دُرّہ مارتے اور کہتے کہ آج

---

(۱) موطا امام مالک باب سیرۃ جمع من الصحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین
(۲) موطا مالک باب ترک ما یشغلہ عن ذکر اللہ

دن بھر تم نے کون سے کام انجام دیئے ہیں

(۵) اگر کبھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی نمازِ عشاء کی جماعت چھوٹ جاتی تو وہ رات بھر عبادت کرتے رہتے

(۶) ایک بار حضرت ابن عمرؓ اتنی دیر میں نمازِ مغرب ادا کر سکے کہ ستارے نکل آئے تھے اس کے کفارے میں انھوں نے دو غلام آزاد کیے

(۷) عبداللہ بن قیس کہتے ہیں کہ ہم ایک غزوے میں تھے، جب دشمن کی فوج سامنے آئی تو مقابلے کا اعلان کیا گیا۔ اس دن تیز و تند ہوا چل رہی تھی، میرے سامنے ایک شخص تھے جو اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے، اے میرے نفس کیا فلاں غزوے کے موقع پر میں حاضر نہ تھا اور کیا تو نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ اپنے اہل و عیال کا خیال کرو، میں نے تیری اطاعت کی، جنگ میں شریک نہیں ہوا اور واپس چلا گیا۔ پھر یاد کر ایک دوسرے غزوے کے موقع پر بھی کیا یہی واقعہ پیش نہیں آیا تھا؟ میں اس دفعہ بھی تیرے بہلاوے میں آگیا تھا، یاد رکھ آج میں تجھے اللہ کے سامنے پیش کروں گا یا تو وہ تجھے قبول کرے یا نہ قبول کرے۔ عبداللہ بن قیس کہتے ہیں کہ یہ بات چیت سن کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ آج میں اس شخص کی نگرانی کروں گا۔ دیکھوں یہ کیا کرتا ہے ـــــ ہماری فوج کے لوگوں نے دشمنوں پر حملہ کیا اور وہ شخص ان کی صفِ اوّل میں تھا، پھر دشمنوں نے اسلامی فوج پر حملہ کیا اور تھوڑی دیر کے لیے ان کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن وہ شخص اپنی جگہ جما رہا اور لڑتا رہا، کئی بار اس طرح ہوا کہ دشمنوں نے حملہ کیا، لوگ پیچھے ہٹے اور وہ اپنی جگہ جما رہا اور لڑتا رہا۔ خدا کی قسم وہ جم کر لڑتا رہا یہاں تک کہ میں نے دیکھا وہ شہید

ہو کر گر گیا، میں نے اس کے جسم اور اس کے گھوڑے پر زخموں کے نشان شمار کیے تو صرف نیزے کے ساٹھ بلکہ اس سے زیادہ زخم شمار میں آئے۔

(۸) حضرت تمیم داری کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار ان کی تہجد کی نماز قضا ہو گئی تو وہ سال بھر تک زیادہ جاگ کر اس کی تلافی کرتے رہے۔

مُجاہدہ

مجاہدہ اور جہاد کے لغوی معنی ہیں پوری محنت و مشقّت کے ساتھ کوشش کرنا، اس کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کے لیے محنت و مشقت کے ساتھ ایسے اعمال اختیار کیے جائیں جن سے بُرے اخلاق دُور ہوں اور اچھے اخلاق حاصل ہوں۔ چونکہ اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی بُرے اخلاق و کردار کے ازالے اور اچھے اخلاق و کردار کے حصول پر موقوف ہے اس لیے مجاہدہ شرعاً مطلوب ہے اور اسی لیے اسلامی تصوف میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ رسالہ قشیریہ میں باب توبہ کے بعد مجاہدے ہی کا باب ہے۔ اس ترتیب کا اشارہ غالباً اس طرف ہے کہ توبہ پر استقامت مجاہدے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ امام قشیری نے مجاہدے کے شرعاً مطلوب ہونے پر ایک آیت اور ایک حدیث پیش کی ہے۔ آیت سورہ العنکبوت کی آخری آیت ہے:

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ ع ۷	جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکو کاروں ہی کے ساتھ ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیرِ مظہری میں لکھا ہے کہ "وَالَّذِیْنَ

جَاهَدُوْا" سے مُراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفار سے محاربہ اور نفس کی مخالفت میں اپنی پوری قوت صَرف کر دی ہو اور "فِیْنَا" سے مُراد یہ ہے کہ اللہ کی مرضیات کے حصول، اس کے دین کی نصرت و حمایت، اس کے اوامر کی تعمیل اور اس کے نواہی سے اجتناب میں مجاہدہ کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی "صوفی" کفار سے محاربہ اور دین اللہ کی نصرت و حمایت کو اپنے مجاہدے سے خارج کر دے تو اس کا مجاہدہ ناقص ہوگا بلکہ بعض حالات میں اس کی کوششوں پر "مجاہدہ" کا اطلاق ہی صحیح نہ ہوگا۔ "لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" کی تفسیر میں انھوں نے متعدد اقوال نقل کیے ہیں، حضرت سہل بن عبداللہ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ "جو لوگ اقامتِ سُنّت میں کوشش کریں گے ہم انھیں جنّت کے راستے دکھائیں گے" "وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دُنیا میں مجاہدین کی مدد کرے گا اور آخرت میں انھیں ثواب اور مغفرت عطا فرمائے گا۔

بطورِ دلیل جو حدیث امام قشیری نے پیش کی ہے وہ یہ ہے:

عَنْ ابی سعید الخدری	ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے
رضی اللہ عنہ قال سئل	ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
رسول اللہ صلی اللہ علیہ	سے افضل جہاد کے بارے میں
وسلم عن افضل الجہاد	سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا انصاف
فقال کلمۃ عدل عند	کا کلمہ جو ظالم اقتدار کے سامنے کہا
سلطان جائر فدمعت عینا	جائے یہ سُن کر حضرت ابو سعیدؓ کی
ابی سعید (۱)	آنکھوں میں آنسو آگئے

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۱۲۴

تصوّف کی کتاب میں بطورِ دلیل اس حدیث کو پیش کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تصوّف میں مجاہدے کی نوعیت کیا ہے؟ خواہ اب کوئی صوفیٔ وقت اس کو سمجھے یا نہ سمجھے اور اس پر عمل کرے یا نہ کرے۔ امام قشیری نے اصل اور بنیادی مجاہدے پر جو کچھ لکھا ہے ہم ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

"اچھی طرح جان لو کہ اصل مجاہدہ یہ ہے کہ نفس کو اس کی خواہشات سے محروم کر دیا جائے، خواہشاتِ نفس کے خلاف عمل کیا جائے نفس میں دو صفتیں ایسی ہیں جو اسے خیر سے روک دیتی ہیں، خواہشات و شہوات میں انہماک اور طاعات سے امتناع و انحراف، لہٰذا جب وہ کسی ممنوع و مکروہ کے ارتکاب کے لیے سرکشی دکھائے تو اس کے منہ میں تقویٰ کی خاردار لگام ڈال دینی چاہیے اور جب وہ کسی عملِ خیر کی طرف بڑھنے سے رُکے تو اس کی خواہش کے خلاف ایڑ لگا کر اسے بڑھنے پر مجبور کرنا چاہیے اور اگر کبھی وہ اپنی بے قدری اور تذلیل کے احساس کی وجہ سے غضب ناک ہو تو حُسنِ خُلق سے اُس کے غصّے کی قوت کو توڑ دینا اور نرمی و ملاطفت سے اس کی آگ کو بُجھا دینا چاہیے اور اگر کبھی وہ خود پسندی کی وجہ سے اپنے فضائل و مناقب ظاہر کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ اس کی خواہش کو کچل دیا جائے اور اُسے بتایا جائے کہ وہ اپنی اصل کے لحاظ سے کس قدر حقیر اور اپنے افعالِ بد کی وجہ سے کس قدر ذلیل ہے"

شیخ الاسلام زکریا انصاری نے اپنی شرح میں اس پر یہ اضافہ کیا ہے:

امام غزالی نے لکھا ہے کہ سرکش نفس پر قابو تین باتوں سے حاصل ہوتا ہے ایک یہ کہ اس کی خواہش سے اسے محروم کیا جائے اس لیے کہ

سرکش جانور کے چارے میں کمی کر دی جائے تو وہ نرم پڑ جاتا ہے
دوسری یہ کہ اس پر مشقت والی عبادات کا بوجھ ڈالا جائے کیونکہ جب
سرکش جانور کے چارے کو کم کر کے اس پر بوجھ زیادہ لاد دیا جاتا ہے
تو وہ مطیع و فرماں بردار ہو جاتا ہے، تیسری یہ کہ اس معاملے میں اللہ
تعالیٰ سے استعانت طلب کی جائے کیونکہ اس کی مدد کے بغیر نفس
سرکش پر قابو حاصل نہیں ہو سکتا، کیا تم نے حضرت یوسف علیہ السلام
کا یہ قول نہیں سنا ہے ان النفس لامارة بالسوء الا ما رحم
ربی (۱) (نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب
کی رحمت ہو)

ذوالنون مصریؒ نے کہا ہے کہ چھ اسباب ہیں جن کی وجہ سے خلق خدا میں فساد رونما ہو گیا ہے:

(۱) الاوّل ضعف النیة بعمل الآخرة: پہلا سبب یہ ہے کہ عمل برائے آخرت کی نیت میں ضعف آگیا ہے

کھلی بات ہے کہ جب کسی چیز کے لیے عمل کی نیت اور اس کا ارادہ ہی کمزور ہو جائے تو لامحالہ اس میں اس کی رغبت کم ہو جائے گی۔

(۲) والثانی صارت ابدانهم رهنية لشهواتهم دوسرا یہ کہ ان کے اعضا و جوارح ان کی خواہشات کے قیدی بن گئے ہیں

یہ دوسرا سبب پہلے سبب کا ثمرہ اور اس کا نتیجہ ہے کیونکہ انسان اپنی خواہشات نفس کو اسی وقت ترک کرتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی بندگی و اطاعت کی نیت اور

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۱۳۰

عزم قوی ہو اور جب یہ چیز فوت ہو جاتی ہے تو اس کا بدن اس کی خواہشات کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے

(۳) والثالث غلبهم طول الامل مع قرب الاجل تیسرا یہ کہ قربِ اجل کے باوجود طولِ امل نے ان پر غلبہ پالیا ہے

اَمَل کے معنی لغت میں امید کے ہیں لیکن احادیث اور تصوف کی کتابوں میں یہ لفظ دنیوی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس جملے کا مطلب یہ ہوا کہ موت قریب ہونے کے باوجود لوگوں پر دُنیا کی لمبی امیدوں اور تمناؤں نے غلبہ پالیا ہے۔

(۴) والرابع اثروا رضا المخلوقین علی رضا الخالق چوتھا یہ کہ انھوں نے مخلوق کی خوشنودی کو خالق کی خوشنودی پر ترجیح دے رکھی ہے

یہ چیز قلتِ دین اور ضعفِ یقین سے پیدا ہوتی ہے، جب انسان کا یہ یقین کمزور ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی نفع اور نقصان پہنچانے والا نہیں ہے تو وہ ہر اس مخلوق کی رضا تلاش کرنے لگتا ہے جسے وہ نفع یا نقصان پہنچانے والا سمجھتا ہے اور پھر اسے اللہ کو خوش رکھنے کی فکر باقی نہیں رہتی۔

(۵) والخامس اتبعوا اهواءهم ونبذوا سنة نبيهم وراء ظهورهم پانچواں یہ کہ انھوں نے اپنی ایجاد کردہ بدعتوں کی پیروی کی اور اپنے نبی کی سنت کو پس پشت ڈال دیا

یہ پانچواں سبب دراصل چوتھے سبب کا لازمی نتیجہ ہے۔ انھوں نے مخلوق کو خوش کرنے اور دُنیوی فوائد حاصل کرنے کے لیے دین میں طرح طرح کی بدعتیں رائج کیں اور اپنے عقیدہ وعمل کو بگاڑ کر رکھ لیا۔

(۶) والسادس جعلوا قليل زلات السلف حجة لانفسهم و

دفنوا کثیر مناقبھم (۱) چھٹا یہ کہ انھوں نے سلف کی قلیل لغزشوں کو اپنے لیے دلیل بنالیا اور ان کے کثیر فضائل ومناقب کو دفن کر دیا۔

خواہشِ نفس کی پیروی کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اگر کسی بدعت یا غلطی پر ٹوکا جائے تو وہ جھٹ سے کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم کیا ہیں ہم سے بہت زیادہ افضل فلاں بزرگ نے ایسا کیا ہے۔ یہ لوگ بزرگوں کے بہترین اعمال اور ان کی قابلِ رشک عبادات وطاعات میں ان کی پیروی نہیں کرتے لیکن اگر ان سے کوئی لغزش ہوگئی ہو تو اسے اپنے لیے دلیل اور حجت بنانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ امام قشیری نے باب المجاہدہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنے نفس کو کچلنے کے لیے تیار نہ ہو وہ بندگیٔ رب میں مجاہدے پر آمادہ نہیں ہو سکتا ——

سورۃ العنکبوت ہی کی ابتدائی آیتوں میں فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا	اور جو شخص بھی مجاہدہ کرے گا
يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ	اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا،
لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝	اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے
عنکبوت ع ۱	بے نیاز ہے

قاضی ثناء اللہؒ اور دوسرے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں جہاد سے اس کی تمام قسمیں مراد ہیں خواہ وہ کفار سے ہو یا نفس سے یا شیطان سے —— اس آیت میں نہ صرف یہ کہ مجاہدے اور جہاد کی ترغیب ہے بلکہ اس میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ انسانوں سے مجاہدے کا مطالبہ خود ان کے اپنے فائدے

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۱۳۶

کے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کو کسی کے مجاہدے کی ضرورت نہیں، اس کی ذات بے نیاز ہے ـــــــ سورۂ مائدہ رکوع ۶ میں ہے:

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرتے رہو اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ اور مجاہدہ کرو اس کی راہ میں تاکہ تمھیں کامیابی نصیب ہو

سورہ الحج کے آخری رکوع میں حکم دیا گیا ہے

"اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ حق ہے جہاد کرنے کا"

جہاد اور مجاہدہ ایک ہی معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان آیتوں میں حکم یہ دیا گیا ہے کہ مومن اپنی پوری طاقت سے ہر اُس دشمن کا مقابلہ کرے جو بندگیٔ رب کی راہ میں مزاحم ہو خواہ وہ دشمن کوئی انسان ہو یا شیطان ہو یا خود اس کا اپنا نفس ہو۔

چند احادیث

امام محی الدین ابوزکریا نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ریاض الصالحین کے باب المجاہدہ میں ۱۷ حدیثیں نقل کی ہیں ان سب کو یہاں پیش کرنا موجب طوالت ہے، میں ان میں سے چند احادیث کے ترجمے پیش کرتا ہوں:

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جس کسی نے میرے کسی ولی سے عداوت کی تو میں اسے آگاہ کرتا ہوں کہ اس کے خلاف میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ بندہ جن چیزوں سے میرا تقرب حاصل کرتا ہے ان میں مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ فرائض ہیں جو میں نے اس پر عائد کیے ہیں اور بندہ مسلسل نوافل کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ

وہ میرا محبوب بن جاتا ہے اور جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے
تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی
آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا
ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے
وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے تو میں اسے دیتا ہوں
اور اگر مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔

(بخاری شریف)

یہ حدیث تصوف کا ایک بنیادی ماخذ ہے اور ائمہ صوفیہ نے اپنی کتابوں کے مختلف ابواب میں اس سے استدلال کیا ہے۔ اس حدیثِ قدسی میں تمثیل کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے، کان، ہاتھ، پاؤں بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ فرائض کی ادائگی اور نوافل کی کثرت سے اللہ کی محبت اتنی غالب آجاتی ہے کہ بندے کی مرضیات، اللہ کی مرضیات میں گم ہو جاتی ہیں پھر وہ اپنی آنکھوں سے وہی کچھ دیکھتا اور کانوں سے وہی کچھ سنتا ہے جو اللہ کو پسند ہو، ہاتھوں سے وہی کچھ پکڑتا ہے جس کا پکڑنا جائز ہو اور اس کے قدم اسی طرف اٹھتے ہیں جہاں جانے کی اللہ نے اجازت دی ہو، گویا اس کے تمام حرکات وسکنات اپنے محبوبِ حقیقی کے اشارۂ چشم و ابرو کے ماتحت ہو جاتے ہیں۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ یہ تصوف کا سب سے اونچا مقام ہے۔ امام نوویؒ نے باب المجاہدہ میں اسے پیش کر کے اس حدیث کے صحیح مطلب کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ فرائض کی ادائگی اور نوافل کی کثرت وہ مجاہدہ ہے جو شرعاً مطلوب ہے اور نفسِ سرکش پر قابو پانے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہے۔ ہر نوعِ عبادت کے نوافل

اسی نوع کے ہوتے ہیں۔ نوافل سے مُراد صرف نماز کے نوافل نہیں ہیں بلکہ ہر فرض عبادت کے نوافل مُراد ہیں۔

(۲) "حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرا بندہ جب میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جب وہ میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں اور جب وہ میری طرف معمولی چال سے چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں" (بخاری شریف)

اس حدیثِ قدسی میں بھی تمثیل کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ ایک بالشت بڑھنا، ایک ہاتھ بڑھنا اور معمولی چال سے چل کر جانا، اس مجاہدے کو ظاہر کرتا ہے جو بندہ اپنے مالک سے تقرب حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے۔ ایک بالشت کے جواب میں ایک ہاتھ بڑھنا اور ایک ہاتھ کے جواب میں دو ہاتھ بڑھنا اور معمولی رفتار کے جواب میں دوڑ کر آنا، اللہ تعالیٰ کے اس بے نہایت کرم کو ظاہر کرتا ہے جو وہ اپنے مجاہد بندے پر کرتا ہے۔ اس حدیث میں بھی تقرب الی اللہ کے لیے مجاہدے کی ایسی ترغیب و تشویق موجود ہے جس سے بہتر کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) حضرت انس ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں بہت لوگ گھاٹا اٹھاتے ہیں صحت اور فراغت (بخاری شریف)

اس حدیث میں صحت و فراغت کو سرمایۂ حیات سے تشبیہ دی گئی ہے، جس طرح وہ تاجر سخت احمق اور گھاٹا اٹھانے والا ہے جو نفع کمانے کا

بہترین موقع ملنے کے باوجود اپنے سرمایے کو تجوری میں بند رکھتا ہے اور اسے تجارت میں نہیں لگاتا، اسی طرح وہ لوگ بہت بے وقوف ا در نقصان اٹھانے والے ہیں جو صحت و فراغت کے باوجود خدا کی بندگی میں سرگرمی نہیں دکھاتے اور آخرت کا اجر و ثواب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے، صحت و فراغت ہوتے ہوئے عملِ خیر نہ کرنے کے لیے آخر کون سا عذر باقی رہتا ہے۔ صحت کی قدر بیماری میں معلوم ہوتی ہے اور فراغت کی قدر مشغولیت میں۔ بیماری اور مشغولیت میں مومن نیکی کے بہت سے کام کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا اور پچھتاتا ہے کہ اس نے صحت اور فراغت کی قدر کیوں نہ کی۔

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوزخ شہوات سے اور جنت مکارہ سے ڈھانک دی گئی ہے (بخاری و مسلم)

"شہوات" شہوت کی جمع ہے ان سے مُراد وہ نفسانی خواہشات ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے اور "مکارہ" مکروہ کی جمع ہے، مکروہ پُرمشقت اور ناگوار شے کو کہتے ہیں۔ مکارہ سے مُراد یہاں وہ مشقت بھرے اعمال ہیں جو نفس پر شاق اور اُسے ناگوار ہوتے ہیں لیکن وہی حصولِ جنت کے ذرائع بھی ہیں۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور دوزخ کے درمیان نفسانی خواہشات کو پردہ بنا دیا گیا ہے اگر انسان اس پردے کو اٹھا دے یعنی منہیات و ممنوعات کا ارتکاب کرنے لگے تو وہ دوزخ میں داخل ہو جائے گا۔ اسی طرح انسان اور جنت کے درمیان پُرمشقت اعمالِ خیر، پردہ بنا دیئے گئے ہیں اگر وہ یہ پردہ اٹھا دے یعنی ان اعمالِ خیر کی تعمیل شروع کر دے تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا، یہ حدیث اپنے ظاہری الفاظ ہی سے حصولِ جنت

کے لیے مجاہدے کو ضروری قرار دے رہی ہے۔

مجاہدے میں اتباعِ سُنّت

وہ تمام اعمال جو تقربِ الٰہی، خوشنودئ رب اور حصولِ جنّت کے لیے ضروری ہیں، اسی طرح وہ تمام اعمال جو انسان کو خدا سے دُور کرتے اور اسے غضبِ الٰہی اور دوزخ کا مستحق بناتے ہیں، قرآن و حدیث میں بیان کر دیئے گئے ہیں اس لیے اب کسی کو کوئی نیا عمل ایجاد کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجاہدے میں بھی ہمارے لیے اُسوہ اور نمونہ ہیں کیونکہ آپؐ کی زندگی توازن و اعتدال کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ تصوّف کی کتابوں اور بزرگانِ دین کے سوانح میں ہمیں بہت سے ایسے مجاہدے ملتے ہیں جو اتباعِ سُنّت سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں اس لیے ہمیں خود تصوّف ہی کے مسلّمہ اصول کی بنیاد پر انھیں نظر انداز کر دینا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے آپ کو اس مجاہدے پر آمادہ بھی کرنا چاہیے جو کتاب و سنّت میں موجود ہے۔

اہم ترین مجاہدہ ممنوعات سے اجتناب ہے

شریعت کے احکام اوامر و نواہی میں منقسم ہیں، کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جن سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ممنوعات سے اجتناب مجاہدے کی اہم ترین قسم ہے یہ بات کتاب و سنت سے بھی ثابت ہے اور صوفیہ کے اقوال میں بھی یہ بات ملتی ہے۔ "عبادات" کی کثرت آسان ہے لیکن اپنے آپ کو بُرے اخلاق سے پاک صاف کرنا مشکل ہے، اگر کوئی شخص اپنے آپ کو ممنوعات و محرمات سے بچا کر صرف فرائض و واجبات انجام دے رہا ہو وہ اُس شخص سے بڑا "صوفی"

ہے جو رات بھر جاگ کر عبادت کرتا ہے لیکن ساتھ ہی کبر، غصّہ، عجب نفس، حسد، غیبت، دُنیا کی محبّت، بدگوئی اور اسی طرح کے دوسرے محرمات و ممنوعات میں مبتلا ہے، امام قشیری لکھتے ہیں:

"بھوک برداشت کرنا اور شب بیداری اختیار کرنا آسان ہے لیکن پست اخلاق سے اپنے آپ کو نکال کر اچھے اخلاق کی بلندی تک پہنچنا سخت مشکل ہے" (۱)

کتاب و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ "عبادات" کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کو ممنوعات و محرمات سے پاک صاف کریں، اگر عبادات سے یہ مقصد حاصل نہ ہو رہا ہو تو وہ عبادتیں بے رُوح ہیں۔ نماز جیسی اعلیٰ ترین عبادت کے بارے میں کہا گیا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ (۲) (یقیناً نماز فحش اور بُرے کاموں سے روکتی ہے) رمضان کے روزوں کا مقصد بتایا گیا ہے لعلکم تتقون (۳) (تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو)

انسان کا نفس دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو "اچھا" اور "بڑا" سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔ غیبت اور بے ہودہ گوئی سے دلچسپی لیتا ہے۔ دُنیا کی محبت اس کے اندر سرایت کیے ہوئے ہے، حسد سے اسے مسرت ہوتی ہے، دوسروں کا مال ہڑپ کر کے پھولا نہیں سماتا، دوسروں کو تکلیفیں پہنچا کر ڈینگیں مارتا ہے، یہ تمام چیزیں اس کی مرغوبات و مطلوبات ہیں، ان سے اسے روکنا اور اس کے منہ میں تقویٰ کی خاردار لگام ڈالنا کس قدر مشکل اور پُرمشقت کام ہے لیکن یہی مجاہدہ انسان کو دُنیا اور آخرت دونوں ہی جگہ

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۱۳۱ (۲) عنکبوت ع ۶ (۳) البقرہ ع ۲۳

کامیاب کرے گا اور یہی مجاہدہ تقرب الٰہی کے بند دروازے کھولے گا
توبہ اور مجاہدہ دو ایسے مقامات ہیں جو زندگی کے آخری لمحے تک جدا نہیں
ہوتے وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (۱) (اپنے رب کی بندگی
کیے جاؤ یہاں تک کہ تمھیں موت آجائے) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ
اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۲) (اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر اور اس سے
استغفار کر وہ بہت معاف کرنے والا ہے)
اس آیت میں حمد، تسبیح اور استغفار کا یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کو دیا گیا تھا، جب حضورؐ اپنا کارِ رسالت مکمل کر چکے تو وفات سے کچھ پہلے
سورہ اذا جاء نصر اللہ نازل ہوئی اور اس میں آپؐ کو یہ حکم دیا گیا۔ حمد، تسبیح
اور استغفار آپ پہلے بھی کر رہے تھے۔ اس حکم کا مطلب یہ ہوا کہ اب
اس میں اور اضافہ کیجیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی مومن زندگی کے آخری
لمحے تک مجاہدے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

---

(۱) سورہ الحجر کی آخری آیت (۲) النصر

محبّت

اللہ تعالیٰ کی محبت، تمام مقامات کی غایت اور تمام درجات میں سب سے بلند چوٹی ہے، محبتِ الٰہی پا لینے کے بعد، ہر مقام اس کے ثمرات میں سے ایک ثمرہ اور اس کے توابع میں سے ایک تابع ہے، جیسے شوق، انس، رضا، مناجات۔ اور محبتِ الٰہی کے ادراک سے پہلے ہر مقام اس کے مقدمات میں سے ایک مقدمہ ہے، جیسے توبہ، صبر، زہد اور اس طرح کے دوسرے تمام مقامات (۱)

امام غزالی نے محبتِ الٰہی کے بارے میں جو بات لکھی ہے، یہی دوسرے الفاظ میں علامہ حمید الدین فراہی نے بھی لکھی ہے:

> "جس طرح ہر ایک کام کی ایک غرض اور انتہا ہوتی ہے جس پر وہ کام ختم ہو جاتا ہے اسی طرح ایمان اور تعلیمِ قرآن کی انتہا محبتِ الٰہی ہے، تمام نبیوں کی تعلیم کا مرکز اور مغز یہی تھا اور روحانی زندگی اسی کا نام ہے، قرآن تو اس تعلیم سے لبریز ہے مگر توریت و انجیل میں بھی یہ حکم صاف صاف سنا دیا گیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ توریت کے احکام میں سب سے اعلیٰ حکم کیا ہے تو

---

(۱) احیاء علوم الدین ج ۴

فرمایا: خدا کی محبت تمام دل تمام روح تمام عقل سے کرنا ہی سب سے اوّل اور اعظم حکم ہے (متی ۲۲) جس طرح محبتِ الٰہی دین کی غایت ہے اسی طرح اس محبت کی جان اخلاص ہے۔ منہ سے محبت کا دم بھرنا اور چیز ہے اور اخلاصِ محبت اور

خلقے زباں بدعویٔ عشقش کشادہ اند　　اے من غلام آنکہ دلش با زباں یکے است (۱)

محبت کے باب میں بھی علماء و صوفیہ کی کتابوں میں مختلف قسم کی بحثیں کی گئی ہیں میں نے اس کتاب میں فلسفیانہ بحثوں سے احتراز کا ارادہ کیا ہے اس لیے یہاں صرف وہ باتیں پیش کروں گا جو قرآن واحادیث سے ثابت ہیں اور صوفیہ کے وہ احوال واقوال نقل کروں گا جو کتاب وسنّت سے آگے نہیں بڑھتے۔

محبتِ الٰہی قرآن میں قرآنِ کریم میں حُب اور مَحَبّۃ اور اس کے ہم معنی وُدّ اور مَوَدّۃ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ میں آگے جو کچھ لکھ رہا ہوں اس میں حُب، محبت اور وُدّ کی آیتیں نقل کروں گا۔ مَوَدّۃ کا لفظ متعدد آیتوں میں آیا ہے۔ مثلاً سورہ الشوریٰ میں ہے:

قُلْ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی (الشوریٰ ر۳)

اے نبی ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں البتہ قرابت کی محبت ضرور چاہتا ہوں۔

سورہ الروم میں ہے:

وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ط (الروم ر۲)

اور تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔

---

(۱) تفسیر سورۂ اخلاص ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی

اللہ تعالیٰ سے بندے کی محبت یہ ہے کہ وہ اس کی والہانہ اطاعت میں سرگرم، اس کی رضا و قرب کا طالب اور اس کی نگاہِ لطف و کرم کا آرزومند ہو جائے اور بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت کے معنی یہ ہیں کہ دُنیا میں وہ اس کا حامی، ناصر اور کارساز ہو اور آخرت میں وہ اس پر اپنے رضوان کی نعمت انڈیل دے اور اس کو اپنے دیدارِ جاں نواز سے سرفراز فرمائے اور اس کا دیدار جنت اور اس کی تمام نعمتوں سے بڑی نعمت ہے۔

دنیا میں محبت، صرف محبوب کے دیدار ہی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ محبت، دل لُبھانے والی گفتار سے بھی جاگ اُٹھتی ہے۔ جامی نے کہا ہے:

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد

عشق صرف دیدار ہی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات گفتگو سے بھی جاگ اُٹھتا ہے

شاید حضرت موسیٰ علیہ السلام، دلربا، شیریں و سرمدی آواز ہی سُن کر پکار اُٹھے تھے رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ ۔ سورۂ اعراف کی اس پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے:

> اور جب وہ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی "اے رب مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں" فرمایا تو مجھے نہیں دیکھ سکتا، ہاں ذرا سامنے پہاڑ کی طرف دیکھ اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا چنانچہ اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی کی اور اسے پارہ پارہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا جب ہوش آیا تو بولا "پاک ہے تیری ذات، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں۔
>
> (الاعراف آیت ۱۴۳)

یہ وہ مقام ہے جس کی حقیقت ہم نہیں جان سکتے بس اتنی بات سمجھ میں آتی ہے کہ محبوب

حقیقی کی باتیں سُن کر حضرت موسیٰ کے دل میں محبت کا سمندر جوش مارنے لگا اور وہ بے اختیار دیدارِ الٰہی کی التجا کر گزرے (۱) محبوبِ حقیقی نے اپنے شیفتۂ جمال کو پہاڑ پر تجلی کرکے یہ بات سمجھائی کہ انسان کی آنکھیں دُنیا میں اس کے جمالِ جہاں سوز کا نظارہ نہیں کر سکتیں، دیدارِ الٰہی کی جنت سے بڑی نعمت آخرت میں نصیب ہوگی، شبِ انتظار کی صبح صادق وہاں طلوع ہوگی۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ (القیامۃ: ۲۲-۲۳)

اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ ان کے لیے صراحت کے ساتھ "محبت" کا ذکر کیا گیا ہے

وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ (طٰہٰ: ۳۹)

اور ہم نے تجھ پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی

اس کا متبادر مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں حضرت موسیٰؑ کی محبت ڈال دی، اسی کا اثر تھا کہ فرعون بھی اپنے محل میں ان کی پرورش پر راضی ہوگیا تھا اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی کسی خاص محبت سے نوازا تھا۔ الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں کہ یہ دونوں مفہوم مُراد لیے جا سکتے ہیں۔

محبتِ الٰہی کا ذکر بصیغۂ خبر

اللہ تعالیٰ کی محبت ایمان اور جذبۂ شکر و سپاس کا ثمرہ ہے اس لیے قرآن میں بصیغۂ امر اللہ سے محبت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے بلکہ بصیغۂ خبر بتایا گیا ہے کہ ایمان والے لوگ اللہ سے

---

(۱) کوہِ طور کے واقعات قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں بیان کیے گئے ہیں ان میں محبتِ الٰہی کی بجلیاں بھی کوندرہی ہیں ان واقعات کو قرآن کی سورتوں میں تلاش کرکے پڑھنا اور سمجھنا چاہیے۔

شدید محبت رکھتے ہیں وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ۔ سورہ البقرہ کی اس پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے:

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے۔ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں ــــــ کاش جو کچھ عذاب کو سامنے دیکھ کر انھیں سوجھنے والا ہے آج ہی ان ظالموں کو سوجھ جائے کہ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے۔

(البقرۃ : ۱۶۵)

اس آیت نے پوری طرح کھول کر یہ بتادیا ہے کہ محبت کا اصلی حق دار صرف اللہ ہے اور کسی مخلوق کی ایسی محبت جیسی اللہ سے ہونی چاہیے، شرک ہے، نیز یہ کہ اللہ پر ایمان لانے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ ہی سے محبت رکھتے ہیں ہر دوسری محبت اللہ کی محبت پر قربان کی جاسکتی ہے لیکن مومن یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اللہ کی محبت کو کوئی آنچ پہنچے۔ انبیاء و اولیاء تک کی محبتیں محبتِ الٰہی کے تابع ہیں ان میں سے کسی کی محبت میں اتنا غلو کہ اللہ کی محبت کے برابر ہو جائے یا اس سے بڑھ جائے، شرک اور شر کا اعمال کی جڑ ہے، مومن کو اس سے پناہ مانگنی چاہیے ــــــ تمام محبتیں، محبتِ الٰہی کے تابع ہیں! اس جملے کا مفہوم کیا ہے؟ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی مخلوق کے ساتھ کوئی ایسا عقیدہ رکھا اور کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جاسکتا جو محبوبِ حقیقی اللہ رب العزت کی مرضی اور اس کے حکم کے خلاف ہو۔

محبتِ الٰہی کے ذکر میں سورہ المائدہ کی آیات ۵۴ تا ۵۶ قابلِ مطالعہ ہیں۔ ان آیات میں واضح کیا گیا ہے کہ اللہ اپنے فرماں بردار بندوں سے محبت کرتا ہے اور

فرماں بردار بندے اپنے مالکِ حقیقی سے محبت کرتے ہیں ۔ اللہ سے محبت رکھنے والوں کی چند اہم صفات کا بھی ذکر کیا گیا ہے ۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے محبت کرنے والے فرماں بردار بندوں کو "حزب اللہ" کے جاں نواز لقب سے نوازا ہے ۔ ہم یہاں ان تین آیتوں کے ترجمے نقل کرتے ہیں ۔

اے ایمان لانے والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ، اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے، جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے ۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے ۔

تمھارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسولؐ اور وہ اہلِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں ۔

اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اہلِ ایمان کو اپنا رفیق بنا لے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے ۔

(المائدہ ۵۴ تا ۵٦)

مہربان مالک کا کرم یہ ہے کہ پہلے اس نے اپنے فرماں بردار بندوں سے اپنی محبت کا اظہار فرمایا ہے، اس کے بعد یہ خبر دی ہے کہ فرماں بردار بندے بھی اس سے محبت کرتے ہیں ۔ اللہ سے محبت کرنے والوں کی جن بنیادی اور اہم صفات کا ذکر ان آیات میں ہے وہ یہ ہیں :

(الف) مومنوں پر نرم (ب) کافروں پر سخت (ج) اللہ کی راہ میں جہاد کرنے

والے (د) کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈرنے والے (ہ) نماز قائم کرنے والے (و) زکوٰۃ دینے والے (ز) خدا کے سامنے جھکے رہنے والے۔

یہاں ان صفات کا ذکر اس بات کا کھلا اشارہ ہے کہ اگر کسی مُدّعیٔ محبت میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ اللہ سے محبت کے دعوے میں سچا نہیں ہے۔

"مومنوں پر نرم" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اہلِ ایمان کے مقابلے میں اپنی طاقت کبھی استعمال نہ کرے، اس کی ذہانت، اس کی ہوشیاری، اس کی قابلیت، اس کا رسوخ واثر، اس کا مال، اس کا جسمانی زور، کوئی چیز بھی مسلمان کو دبانے اور ستانے اور نقصان پہنچانے کے لیے نہ ہو، مسلمان اس کو اپنے درمیان ایک نرم خو، رحم دل، ہمدرد اور حلیم انسان ہی پائیں۔ "کفار پر سخت" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک مومن آدمی اپنے ایمان کی پختگی، دین داری کے خلوص، اصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست کی وجہ سے مخالفینِ اسلام کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کے مانند ہو کہ کسی طرح اپنے مقام سے ہٹایا نہ جا سکے، وہ اسے کبھی موم کی ناک اور نرم چارہ نہ پائیں۔ انھیں جب بھی اس سے سابقہ پیش آئے ان پر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اللہ کا بندہ مر سکتا ہے مگر کسی قیمت پر بک نہیں سکتا اور کسی دباؤ سے دب نہیں سکتا (۱)

"اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے"، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے یا غالب رکھنے کے لیے تمام مخالفینِ حق سے یہ جو کبھی لڑائی لڑیں گے خواہ یہ مخالف ان کا اپنا نفس ہو یا شیطان یا کفار۔

---

(۱) تفہیم القرآن ج ۱

"کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈریں گے"، اس کا مطلب یہ ہے:

یعنی اللہ کے دین کی پیروی کرنے میں، اس کے احکام پر عمل درآمد کرنے میں، اور اس دین کی رُو سے جو کچھ حق ہے اسے حق اور جو کچھ باطل ہے اسے باطل کہنے میں انھیں کوئی باک نہ ہوگا، کسی کی مخالفت، کسی کی طعن و تشنیع، کسی کے اعتراض اور کسی کی پھبتیوں اور آوازوں کی وہ پروا نہ کریں گے۔ اگر رائے عام اسلام کی مخالف ہو اور اسلام کے طریقے پر چلنے کے معنی اپنے آپ کو دُنیا بھر میں نکّو بنا لینے کے ہوں تب بھی وہ اُسی راہ پر چلیں گے جسے وہ سچّے دل سے حق جانتے ہیں (۱)

اللہ کی محبت پر غیر اللہ کی محبت کو غالب کر دینا اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے سے جی چُرانا کسی مومن مخلص کو زیب نہیں دیتا۔ یہ چیز ایمان کی عین ضد ہے یہی وجہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیت ۲۳۔۲۴ میں اس پر سخت وعید سُنائی گئی ہے۔ ان دونوں آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔

اے نبیؐ! کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارے عزیز و اقارب اور تمھارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمھارے وہ کاروبار

---

(۱) تفہیم القرآن ج ۱

جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمھارے وہ گھر جو تم کو
پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ کی جدوجہد
سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمھارے
سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا ۔
(التوبہ: ۲۳-۲۴)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ، اس کے رسولؐ اور اس کی راہ کی جدو جہد کے مقابلے میں کسی اور کو محبوب تر رکھنا مومنوں کا کام نہیں بلکہ فاسقوں کا کام ہے تقریبًا اسی مضمون کی آیت سورۃ المجادلہ میں بھی ہے :

تم کبھی یہ نہ پاؤگے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے
والے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنھوں نے اللہ اور
اس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہے خواہ وہ ان کے باپ ہوں ، یا
ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی یا ان کے اہلِ خاندان یہ وہ لوگ ہیں
جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے
ایک رُوح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل
کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے،
اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، وہ اللہ کی
پارٹی کے لوگ ہیں ۔ خبردار رہو، اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے
پانے والے ہیں (المجادلہ آخری آیت)

یہ آیت نہ صرف ایمان بلکہ تصوّف کے لیے بھی ایک کسوٹی ہے، جو ایمان اس کسوٹی پر کھرا اُترے وہ حقیقی ایمان اور جو تصوّف اس پر کھرا ثابت ہو وہی اسلامی تصوف ہے اور جو تصوف اس پر کھوٹا ثابت ہو وہی غیر اسلامی تصوف ہے ۔

اللہ کے محبوب و مبغوض

اللہ کن لوگوں سے محبت کرتا ہے اور کن لوگوں کو ناپسند کرتا ہے اس کا اعلان و اظہار قرآنِ عزیز کی بہت سی آیتوں میں کیا گیا ہے۔ اللہ سے محبت رکھنے والے لوگوں کے لیے ان تمام آیتوں کا مطالعہ بے حد مفید ہوگا۔ ان آیتوں سے ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا صفات ہیں جن سے آراستہ ہونا محبوبِ حقیقی کی نگاہِ لطف و کرم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں اور دُوسری طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا صفات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے۔ اللہ سے محبت رکھنے والوں کو ان کے قریب بھی پھٹکنا نہیں چاہیے۔ یہاں ان تمام آیتوں کو نقل کرکے ان کی تشریح کرنا موجبِ طوالت ہے۔ میں یہاں آیتوں کے حوالوں کے ساتھ صرف فہرست پیش کرتا ہوں، قرآنِ کریم اور اس کی تفسیروں میں ان آیتوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

وہ لوگ جن سے اللہ محبّت کرتا ہے

(۱) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ
(البقرہ رکوع ۲۴ آیت ۱۹۵)

بے شک اللہ محسنوں سے محبت کرتا ہے۔

جس شخص میں "احسان" کی صفت ہوتی ہے وہ "محسن" ہوتا ہے۔ اللہ صفتِ احسان کو پسند فرماتا ہے اور جن لوگوں میں یہ صفت ہو اُن سے محبّت کرتا ہے۔

(۲) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝
(البقرہ ر ۲۸ آیت ۲۲۲)

بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

توبہ اور پاکیزگی، اللہ کو پسند ہے اور وہ ان سے متصف لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

(۳) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝
(آل عمران ر ۱۷ آیت ۱۵۹)

بے شک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

توکل اللہ کو پسند ہے اور وہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

(۴) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔
(المائدہ ر ۶ آیت ۴۲)

قسط یعنی انصاف اللہ کو پسند ہے اور وہ منصفوں کو دوست رکھتا ہے۔

(۵) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○ بے شک اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے
(التوبہ آیت ۴)

تقویٰ اللہ کو پسند ہے اور وہ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔

(۶) وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ○ اور اللہ صابروں سے محبت کرتا ہے
(آل عمران ر ۱۵ آیت ۱۴۶)

صبر اللہ کو پسند ہے اور وہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

(۷) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ (الصف) بے شک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔

"قتال فی سبیل اللہ" یعنی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے دشمنانِ حق سے جنگ کرنا اللہ کو پسند ہے۔

احسان۔ توبہ۔ پاکیزگی۔ توکل۔ عدل وانصاف۔ تقویٰ۔ صبر۔ قتال فی سبیل اللہ۔ یہ وہ صفات ہیں جو رؤف و رحیم اللہ کو پسند ہیں اور جو لوگ ان صفات سے متصف ہوں وہ ان سے محبت کرتا ہے۔

وہ لوگ جن کو اللہ پسند نہیں کرتا

(۱) فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ○
(آل عمران ر ۴ آیت ۳۲)

بے شک اللہ ایسے لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو اس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔

جس طرح "ایمان"، تمام صفاتِ حسنہ کی اصل ہے۔ اس کے بغیر کوئی صفت اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب نہیں اسی طرح "کفر و شرک" تمام "صفاتِ سیئہ" کی جڑ اور ناقابلِ معافی ہیں، اللہ تعالیٰ کفر و شرک کو سخت ناپسند کرتا ہے اور وہ منکرینِ حق کا دشمن ہے۔

(۱) فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ○ — بے شک اللہ کافروں کا دشمن ہے۔

(البقرۃ: ۹۸)

(۲) فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ — بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔

(البقرۃ ر۲۴ آیت ۱۹۰)

"اعتداء" یعنی زیادتی و سرکشی اللہ کو ناپسند ہے اور وہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

(۳) اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ○ — یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص سے محبت نہیں رکھتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے

(النساء ر۶ آیت ۳۶)

"اختیال اور فخر" یعنی اترانا اور ڈینگیں مارنا اللہ کو ناپسند ہے اور وہ ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔

(۴) اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ○ (النساء ر۶ آیت ۱۰۷) — بے شک اللہ ایسے شخص کو ناپسند کرتا ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔

خیانت کار اور معصیت پیشہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے خیانت اور گناہ کو عادت بنا لیا ہو، اللہ ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔

(۵) اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ○ — بے شک اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔

(انفال: ۵۸)

(۶) اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ ○ (الحج ر۵ آیت ۳۸)	یقیناً اللہ کسی خائن، کافرِ نعمت کو پسند نہیں کرتا۔
(۷) اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ ○ (القصص ر۸ آیت ۷۶)	یقیناً اللہ گھمنڈ میں پھولے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
(۸) اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ○ (لقمان : ۱۸)	بے شک اللہ کو نہیں بھاتا کوئی اترانے والا، بڑائیاں کرنے والا۔
(۹) اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ○ (القصص : ۷۷)	بے شک اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔
(۱۰) لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء ر۲۱ آیت ۱۴۸)	اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔
(۱۱) اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ○ (الانعام ر۱۷ آیت ۱۴۱)	اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
(۱۲) اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ ○ (النحل ر۳ آیت ۲۳)	اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو غرورِ نفس میں مبتلا ہوں۔
(۱۳) اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ○ (الشوریٰ : ۴۰)	بے شک اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

ان آیتوں میں جن صفات کا ذکر ہے وہ یہ ہیں:

کفر۔ زیادتی۔ غرور۔ خود پسندی۔ خیانت۔ گناہوں پر اصرار۔ کفرانِ نعمت۔ بدگوئی۔ فساد۔ اسراف۔ ظلم۔ یہ وہ صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں اور یہ انسان کو اللہ کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں اس لیے اللہ سے محبت کرنے والے اور اللہ کی محبت کے طلب گار ہر مومن کو ان سے دُور بھاگنا چاہیے۔

محبتِ الٰہی کی کسوٹی

اللہ کی محبت کا دعویٰ کرنے والے بہت ہیں، یہود و نصاریٰ بھی خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور عہدِ رسالت میں منافقین بھی اس کے مدّعی تھے اس لیے یہ جاننے کی سخت ضرورت تھی کہ محبتِ الٰہی کی کسوٹی کیا ہے۔ وہ کیا چیز ہے جس پر جانچ کر یہ معلوم کیا جا سکے کہ اللہ سے کہ محبت کا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا؟ یہی بتانے کے لیے یہ دو آیتیں نازل ہوئیں

تو کہہ، اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو تاکہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمھارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

تو کہہ، حکم مانو اللہ کا اور رسولؐ کا پھر اگر اعراض کریں تو اللہ کو محبت نہیں ہے کافروں سے (آل عمران ر ۴ آیت ۳۱ - ۳۲)

اتباعِ رسولؐ اور اطاعتِ خدا و رسولؐ وہ کسوٹی ہے جس پر جانچ کر یہ دیکھا جائے گا کہ اللہ سے محبت کے دعوے میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟

صوفیہ اور علماء کے امام حضرت حسن بصریؒ نے ان آیتوں کی یہ تفسیر کی ہے:

زعم اقوام علی عھد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انھم یحبون اللّٰہ فاراد ان یجعل لقولھم تصدیقًا من عمل فمن ادعی محبتہ وخالف سنۃ رسولہ فھو کذاب وکتاب اللّٰہ یکذبہ (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چند گروہوں نے گمان کیا کہ وہ بھی اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ اللہ نے ان کے قول کی عملی تصدیق کے لیے ان کے سامنے یہ کسوٹی رکھ دی پس جو شخص اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا اور اس کے رسولؐ کی سنّت کی مخالفت کرتا ہے وہ بڑا جھوٹا ہے اور اللہ کی کتاب اس کے دعوے کی تکذیب کرتی ہے۔

---

(۱) حاشیہ تفسیر جلالین

دوسری آیت کا آخری ٹکڑا ایک لرزا دینے والا ٹکڑا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اتباعِ محمدی اور اطاعتِ خدا و رسولؐ سے اعراض کرتے ہوئے محبتِ الٰہی کا دعویٰ تو دُور کی بات ہے ایسا شخص مومن ہی نہیں ہے۔ اس کی روش کافروں کی روش ہے۔ اسی کے ساتھ پہلی آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اتباع و اطاعت مومن کو مقامِ محبوبیت پر فائز کر دیتی ہے۔ یہ مژدۂ رُوح پرور مومن کے لیے وجد آور ہے۔ یہ دونوں آیتیں، انذار و تبشیر اور ترغیب و ترہیب کا لازوال خزانہ ہیں۔

دُنیا میں محبتِ الٰہی کا ایک صلہ

اللہ رب العالمین سے سچی محبت رکھنے والے خوش نصیب جب مقامِ محبوبیت پر فائز ہو جاتے ہیں یعنی جب ان کا مالکِ حقیقی ان سے محبت کرنے لگتا ہے تو ایسے خوش نصیب لوگوں کو آخرت میں جو صلے اور انعامات ملیں گے ان کا تو ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے، دُنیا میں اللہ تعالیٰ انھیں جو صلے عطا کرتا ہے ان میں کا ایک صلہ دیندار لوگوں کے درمیان ان کی مقبولیت ہے۔ ہزاروں لاکھوں دین دار و صالح اشخاص ان سے محبت کرتے، ان سے عقیدت رکھتے اور ان کا احترام کرتے ہیں، اس صلے کا بیان قرآن میں بھی ہے اور احادیث میں بھی۔ سورۂ مریم کے آخری رکوع میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ○

یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عملِ صالح کر رہے ہیں عنقریب رحمٰن ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔

یہ آیت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی تھی اور اس کے اوّل مصداق صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے لیکن ایمان اور عملِ صالح کا یہ اجر ان کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ قیامت تک جو لوگ بھی ایمان اور عملِ صالح کے اعلیٰ درجات پر پہنچے اور پہنچیں گے انھیں

اچھے لوگوں کے درمیان حُسنِ قبول حاصل ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس آیت کی تفسیر میں ذیل کی حدیث بھی پیش کی گئی ہے:

حضرت ابوہُریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ بندے سے محبّت کرتا ہے تو جبریلؑ کو پکار کر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تو بھی اس سے محبّت رکھ، پھر جبریلؑ اس سے محبت کرتے ہیں اور آسمان والوں میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم لوگ بھی اس سے محبت رکھو تو اہلِ آسمان اس سے محبّت کرتے ہیں پھر اس شخص کے لیے زمین میں حُسنِ قبول پیدا کر دیا جاتا ہے (۱)

جب آسمان سے کسی بندے کے لیے حُسنِ قبول نازل ہو جاتا ہے تو پھر اس شخص کے حاسدوں کی کوئی تدبیر اس حُسنِ قبول کو زک نہیں پہنچا سکتی ایسے حاسد خود ہی دُنیا میں ذلیل ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی خائب و خاسر ہوں گے۔

محبتِ الٰہی کے بارے میں صوفیہ کے اقوال واحوال

(۱) حضرت ابویزید بسطامی نے کہا:

"محبت یہ ہے کہ تم اپنی کثیر خدمت کو قلیل، اور محبوب کے قلیل انعام کو کثیر سمجھو"

اس کی شرح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبّت اور اس کی معرفت کے کمال کا ثمرہ یہ ہے کہ بندہ، اس کی عظمت وجلال کے پیشِ نظر اپنی کثیر عبادتوں اور اطاعتوں کو بھی بہت ہی قلیل سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے لیے کسی معمولی سے معمولی انعام کو اپنی حقارت و ذلت کے پیشِ نظر کثیر و عظیم قرار دیتا ہے۔

---

(۱) ریاض الصالحین بحوالہ بخاری ومسلم باب علامات حب اللہ العبد

(۲) حضرت سہل تستری نے کہا:

"اللہ تعالیٰ کی علی الدوام اور مسلسل اطاعت اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے ہمیشہ کے پرہیز و اجتناب کا نام محبت ہے"

(۳) حضرت ابو عبداللہ القرشی نے کہا:

"محبت کی حقیقت یہ ہے کہ تم جس سے محبت کرو اس کو اپنا سب کچھ دیدو، اپنی کسی چیز کو بچا کر نہ رکھو۔

(۴) حضرت ابو علی روذباری نے کہا:

"محبوب کے امر و نہی میں اس کی موافقت کا نام محبت ہے"

مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے محبوبِ حقیقی کے ہر حکم کی تعمیل اور اس کی منع کی ہوئی ہر چیز سے پرہیز کرے۔

(۵) حضرت سمنون نے کہا:

"اللہ سے محبت کرنے والوں نے دنیا و آخرت دونوں کا شرف حاصل کر لیا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "المرء مع من احبّ" (انسان اس کے ساتھ ہے جس سے محبت کرتا ہے) لہٰذا انھیں اللہ کی معیت حاصل ہے"

شیخ الاسلام زکریا انصاری اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ جس طرح محبت کرنے والے ہمیشہ اس کے ساتھ ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی ہمیشہ ان کے ساتھ ہے، اس نے خود فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝ (سورہ النحل کی آخری آیت)	اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو متقی ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ ہے جو محسن ہیں

"تقویٰ" تمام طاعات کے لیے ایک جامع اسم ہے اور "احسان" یہ ہے کہ

تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

(۶) حضرت یحییٰ بن معاذ نے کہا:

"جس نے اللہ کی محبت کا دعویٰ کیا اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی حفاظت نہ کی وہ اپنے دعوے میں سچا نہیں ہے۔"

"حدود" سے مُراد اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی ہیں۔

(۷) حضرت حارث محاسبی نے کہا:

"محبت یہ ہے کہ تم اپنے تمام وجود کے ساتھ کسی کی طرف مائل ہو جاؤ پھر تم اس کو اپنے نفس، اپنی رُوح اور اپنے مال پر ترجیح دو، پھر جلوت و خلوت میں اس کے امر و نہی میں اس کی موافقت کرو اور اسی کے ساتھ ساتھ تمھیں اس کا احساس رہے کہ تم اس کی محبت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہو"

حاشیہ میں سیّد مصطفیٰ عروسی نے یہ دو مشہور اشعار نقل کیے ہیں

تعصی الالہ و انت تظھر حبه هذا العمری فی القیاس بدیع

لو کان حبك صادقا لاطعته ان المحب لمن یحب مطیع

تم معبود کی نافرمانی کرتے اور اس کی محبت کا اظہار کرتے ہو، قسم بجاں یہ بات عقلاً نرالی ہے اگر تمھاری محبت سچی ہوتی تو یقیناً تم اس کی اطاعت کرتے کیونکہ محب اپنے محبوب کا مطیع ہوتا ہے۔

(۸) کہا گیا ہے کہ:

"محبت وہ آگ ہے جو دل میں بھڑکتی ہے اور مُرادِ محبوب کے ماسویٰ سب کچھ جلا دیتی ہے۔"

(۹) یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

"محبت محبوب کے اشاروں پر چلنے کا نام ہے اور محبوب اپنے مُحب کے بارے میں جو چاہے کرے"

مطلب یہ ہے کہ محبوب اپنے مُحب پر کرم کرے یا ستم، اسے اس کا اختیار ہے لیکن مُحب ہمیشہ اس کی اطاعت ہی کرتا ہے۔

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

(۱۰) قال عبد الله المبارك من اعطى شيئا من المحبة ولم يعط مثله من الخشية فهو مخدوع

عبد اللہ بن مبارک نے کہا جس کو محبت کا کچھ حصّہ دیا گیا اور اسی کے برابر خوف نہیں دیا گیا وہ بتلائے فریب ہے۔

شیخ الاسلام نے اس کی یہ شرح کی ہے کہ نعمت کوئی بھی ہو اگر اس کے زوال کا خوف دل میں موجود نہ رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ صاحبِ نعمت، اس نعمت پر مغرور ہے اور ایسا شخص فریب خوردہ ہوتا ہے۔

(۱۱) حضرت یحییٰ بن معاذ نے کہا:

"محبت کی ایک رائی مجھے محبوب تر ہے ستر سال کی اس عبادت سے جو محبت کے بغیر ہو"

ظاہر ہے کہ جس عبادت کی محرک محبت ہو اس کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

صُوفیہ کا متفقہ قول

"صوفیہ کرام کے اقوال تقریباً اس پر متفق ہیں کہ محبت، محبوب کی موافقت کا نام ہے اور موافقتوں میں سب سے بڑی موافقت، دل کی موافقت ہے"

مطلب یہ ہے کہ کامل شرحِ صدر اور دل کی گہرائی سے اللہ کی مرضیات پوری کرنے اور اس کے احکام کی تعمیل کا نام محبت ہے۔

(۱) حضرت فضیل بن عیاض کے خادم ابو العباس نے بیان کیا کہ ایک بار حضرت فضیل کو حبسِ بول (پیشاب بند ہونے) کی شکایت ہو گئی، انھوں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور دُعا کی "اے اللہ، مجھے تجھ سے جو محبت ہے اس کے صدقے میں مجھے شفا دے"۔ یہ دُعا مانگتے ہی حبسِ بول کی شکایت دُور ہو گئی ـــــ اس طرح یہ بشارت بھی مل گئی کہ ان کی محبت، سچی محبت تھی (۱)

(۲) حضرت ابراہیم بن ادہمؒ ایک بار سیاحت کر رہے تھے، راستے میں کہیں کسی پہاڑ پر ایک شخص نے دو شعر پڑھے۔ شاعر نے اپنے محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "تیری ہر بات ہم نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن ہم سے تیری بے رُخی ناقابلِ برداشت ہے"۔ یہ سُن کر ابراہیم بن ادہمؒ پر اضطراری کیفیت طاری ہو گئی یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گئے اور ایک رات دن بے ہوش رہے جب ہوش آیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے پہاڑ کی طرف سے یہ آواز سُنی "یا ابراہیم کن عبداً" (اے ابراہیم بندہ بن کر رہو) یہ سنتے ہی مجھے ہوش آگیا اور اضطراب دور ہو گیا (۲)

حضرت جنید بغدادیؒ سے روایت ہے کہ ایک بار ہمارے استاذ سری سقطیؒ بیمار پڑ گئے۔ ہمیں اس کا کوئی سبب معلوم نہیں ہو سکا اور نہ یہ جان سکے کہ کون سی دوا دی جائے۔ لوگوں نے ایک طبیبِ حاذق کا پتہ بتایا۔ ہم اپنے استاذ کا قارورہ لے کر ان کے پاس گئے، انھوں نے تھوڑی دیر غور سے قارورہ دیکھا اور مجھ سے کہا، میرا خیال ہے کہ یہ کسی عاشق کا قارورہ ہے۔ حضرت جنیدؒ نے کہا کہ یہ سُن کر میں نے چیخ ماری، قارورہ میرے ہاتھ سے گر گیا اور میں بے ہوش ہو گیا ہوش

---

(۱) تمام اقوال رسالہ قشیریہ اور اس کی شرح سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔

(۲) احیاء العلوم ج ۴ ص ۲۰۹ مطبع مجتبائی میرٹھ

آیا اور واقعہ سُنایا، وہ مسکرائے اور طبیب کی مہارت و حذاقت کی تعریف کی (۳)

(۳) حضرت سہل تستری کا حال یہ تھا کہ جب کسی شخص سے گفتگو کرتے تو کہتے یا حبیب (اے دوست) کسی نے ان سے کہا کہ آپ ہر شخص کو اے دوست سے کیوں خطاب کرتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ دوست نہ ہو، انھوں نے اس کے کان میں کہا،

دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ شخص مومن ہوگا یا منافق ـــــ اگر مومن ہوگا تو اللہ کا حبیب ہے اور منافق ہوگا تو شیطان کا دوست ہے۔ (۴)

---

(۳) ایضاً (۴) ایضاً

استقامت

الرسالۃ القشیریہ اور بعض دوسری کتابوں میں صوفیہ کرام نے "استقامت" پر مستقل ایک باب لکھا ہے اور اس باب میں قرآن کریم کی وہ آیتیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات نقل کیے ہیں جن میں استقامت کا حکم دیا گیا ہے اور صاحبِ استقامت بندگانِ حق کی توصیف کی گئی ہے اور ان کا اجر بھی بیان کیا گیا ہے میں پہلے اس تحریر کی تلخیص پیش کرتا ہوں جو السید مصطفیٰ العروسی نے لکھی ہے:

بعض صوفیہ سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والا راستہ کون سا ہے؟ اس سوال کا انھوں نے یہ جواب دیا:

اچھی طرح سمجھ لو کہ تمام امور کی ابتدا جس چیز سے ہوتی ہے اور جس کے بغیر کسی دوسری شے سے نفع حاصل نہیں کیا جا سکتا وہ عقل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عقل عطا کی ہے۔ جو اُن کے لیے نور بھی ہے اور زینت بھی، اسی سے بندوں کو یہ معرفت حاصل ہوتی ہے کہ اللہ ان کا خالق ہے اور وہ مخلوق ہیں، وہ مدبّر ہے اور بندوں کے تمام معاملات اسی کی تدبیر سے وابستہ ہیں، وہ باقی ہے اور بندے فانی ہیں اسی عقل کی دلیل سے انھیں حُسن و قبح کا علم حاصل ہوتا ہے

اور وہ اچھے اور بُرے میں تمیز پیدا کرتے ہیں اسی کے ذریعے وہ جانتے ہیں کہ جہل تاریکی ہے اور علم نور ہے اسی سے انھیں معرفت حاصل ہوتی ہے کہ اللہ نے انسانوں کو محض کھیل کے طور پر عبث پیدا نہیں کیا ہے۔ یہی عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ خالق کو بعض چیزیں پسند ہیں اور بعض چیزیں ناپسند ہیں۔ کچھ چیزیں اس کی اطاعت و فرماں برداری میں داخل ہیں اور کچھ اس کی معصیت اور نافرمانی میں ۔ یہاں تک عقل انسان کو پہنچا دیتی ہے لیکن وہ چیزیں کیا ہیں جن سے خدا خوش یا ناخوش ہوتا ہے اور اس کی اطاعت کن چیزوں میں ہے؟ اور نافرمانی کن چیزوں میں؟ یہ بات عقل بطورِ خود نہیں جان سکتی۔ یہاں آکر اس کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا ذریعۂ علم صرف وہ وحی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں پر نازل فرماتا ہے اسی سے اللہ کے امر و نہی اور وعدہ و وعید کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب تک ایمان نہ لائے وحیِ الٰہی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ایمان لائے بغیر وہ حق و باطل کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ مومن کی عقل ہی اسے یہ بتاتی ہے کہ صبر کا بوجھ اس وقت تک ہلکا نہیں ہو سکتا جب تک انسان اللہ کے افعال سے اپنے آپ کو راضی نہ کرلے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ رضا بالقضا سے صبر کی تلخی کم ہو جاتی ہے۔ عقل ہی مومن کو زہد و تقویٰ اور صدق و یقین کے مقامات تک رہنمائی کرتی ہے۔

اس تفصیل سے ہمیں معلوم ہوا کہ عبادت کی باگ عقل کے ہاتھ

میں ہے۔ وحیِ الٰہی دلیل راہ اور ایمان چراغِ راہ ہے، عمل سے راہ طے ہوتی ہے اور صبر اللہ سے قریب کرنے والی قوت ہے۔ جو صبر نہیں کر سکتا وہ کمزور ہو جاتا ہے اور جو کمزور ہو جاتا ہے وہ عمل نہیں کرتا اور جو عمل نہیں کرتا اس کا نور مکمل نہیں ہوتا اور جس کی روشنی غائب ہو جاتی وہ اندھا ہو جاتا اور سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے خوش نصیب بندے ہوتے ہیں جو ابتدائے شعور سے موت تک اللہ کی اطاعت پر ثابت قدم رہتے ہیں، گنہگاری اور معصیت کاری کا کوئی دور ان کی زندگی میں نہیں آتا لیکن اکثر لوگ وہی ہوتے ہیں جنھیں اپنے گناہوں سے توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے اور پھر استقامت کی دولت سے نوازے جاتے ہیں۔ بہر حال، استقامت سعادت کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے دوستوں کو استقامت عطا فرمائے۔ (۱)

یہ تحریر باب استقامت کی ایک اچھی تمہید ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ انسان جب تک انصاف کے ساتھ اپنی عقل استعمال نہ کرے کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

"استقامت"، عربی میں کجی اور ٹیڑھے پن کی ضد کو کہتے ہیں یعنی کسی چیز کا سیدھا اور درست ہونا۔ طریقِ مستقیم اس راستے کو کہتے ہیں جو خطِ مستوی کی طرح سیدھا ہو، اسی مناسبت سے دینِ اسلام کو صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے یعنی وہ دین جس میں کوئی کج و پیچ، بے اعتدالی اور انحراف نہیں۔

---

(۱) نتائج الافکار القدسیہ ج ۳ ص ۱۲۳

انسان کی استقامت کے معنی یہ ہیں کہ وہ زندگی کے آخری لمحے تک اسلام کی صراطِ مستقیم پر چلتا رہے اور اس سے منحرف نہ ہو۔ تصوف کی اصطلاح میں استقامت سلوک الی اللہ کی راہ میں اعتدال کی روش اختیار کرنے کو کہتے ہیں ایسا اعتدال جس میں کسی دوسری طرف جھکاؤ نہ پایا جائے (۱) تصوف میں "سلوک" کی اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ مومن اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اس راستے پر چلے جس پر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم چلے تھے، وہ بدعت اور ہر اس چیز سے بچے جس سے سنتِ رسولؐ کی مخالفت لازم آتی ہو۔ (۲) "استقامت" کا سبب شرعی احکام سے کامل واقفیت اور خواہشاتِ نفس کی مخالفت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص شرعی احکام کی کامل واقفیت نہیں رکھتا یا خواہشاتِ نفس کی مخالفت نہیں کرتا تو اسے استقامت نصیب نہیں ہو سکتی۔ استقامت کا ثمرہ اور اس کا نتیجہ آخرت میں مناقشۂ حساب اور عذاب سے سلامتی اور دنیا میں شریفانہ اور اچھے اخلاق سے آراستگی ہے (۳) استقامت کے مطلوب ہونے کی دلیل کے طور پر رسالہ قشیریہ اور اس کی شرح میں قرآن کی یہ دو آیتیں پیش کی گئی ہیں:

(۱) إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝
(حٰمٓ السجدہ ع ۴)

جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو، نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

---

(۱) شرح رسالہ قشیریہ ج ۲ (۲) نتائج الافکار ج ۳ ؛ (۳) شرح رسالہ ج ۳

اس آیت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں "استقامت"، کی تفسیر اور اس کی شرح خود حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ امام قشیری نے اپنے رسالے میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہما کی تفسیر نقل کی ہے۔ میں یہاں اس آیت کی وہ تفسیر نقل کرتا ہوں جو مولانا مودودی مدظلہ، نے تفہیم القرآن جلد ۴ میں کی ہے وہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

> جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں، یعنی محض اتفاقاً کبھی اللہ کو اپنا رب کہہ کر نہیں رہ گئے اور نہ اس غلطی میں مبتلا ہوئے کہ اللہ کو اپنا رب کہتے بھی جائیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کو اپنا رب بناتے بھی جائیں بلکہ ایک مرتبہ یہ عقیدہ قبول کر لینے کے بعد پھر ساری عمر اس پر قائم رہے اس کے خلاف کوئی دوسرا عقیدہ اختیار نہ کیا نہ اس عقیدے کے ساتھ کسی باطل عقیدے کی آمیزش کی اور اپنی عملی زندگی میں بھی عقیدۂ توحید کے تقاضوں کو پورا کرتے رہے۔

توحید پر استقامت کا مفہوم کیا ہے اس کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ رضؓ نے اس طرح کی ہے:

حضرت انس رضؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "قَدْ قَالَهَا النَّاسُ ثُمَّ كَفَرَ أَكْثَرُهُمْ فَمَنْ مَاتَ عَلَيْهَا فَهُوَ مِمَّنْ اسْتَقَامَ" بہت سے لوگوں نے اللہ کو اپنا رب کہا مگر ان میں سے اکثر کافر ہو گئے، ثابت قدم وہ شخص ہے جو مرتے دم تک اس عقیدے پر جما رہا۔ (ابن جریر، نسائی، ابن ابی حاتم)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں: لم یشرکوا

باللہ شیئًا لم یلتفتوا الی الہ غیرہ پھر اللہ کے سوا کسی کو شریک نہ بنایا، اس کے سوا کسی دوسرے معبود کی طرف توجہ نہ کی (ابن جریر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ منبر پر یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا "خدا کی قسم استقامت اختیار کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے لومڑیوں کی طرح اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑتے نہ پھرے۔" (ابن جریر)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اپنے عمل کو اللہ کے لیے خالص کر لیا۔" (کشاف)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اللہ کے عائد کردہ فرائض فرماں برداری کے ساتھ ادا کرتے رہے۔" (کشاف) (۱)

مصطفی عروسی نے مفسر ابوالسعود کے حوالے سے آیت کے پہلے ٹکڑے کی جامع تفسیر چند جملوں میں یہ کی ہے:

"جن لوگوں نے اللہ کی ربوبیت کا اعتراف اور اُس کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے یہ کہا کہ "اللہ ہمارا رب ہے" پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے یعنی اس اقرار اور اس کے تقاضوں پر قائم رہے باقی رہی خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی تشریح، ایمان پر ثبات، اخلاصِ عمل اور ادائے فرائض تو یہ اسی کلی معنی کی جزئیات ہیں۔" (۲)

اس آیت میں ثابت قدم بندگانِ حق پر فرشتوں کے نزول کا بھی ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے اللہ کے صاحبِ استقامت بندوں کے دینی و دُنیوی امور میں بطریقِ الہام ان کی مدد کرتے، ان میں شرحِ صدر کی کیفیت پیدا کرتے اور ان کے دل و

---

(۱) تفہیم القرآن جلد ۴ ص ۴۵۴ (۲) نتائج الافکار ج ۳ ص ۱۲۶

دماغ سے خوف وحزن دور کرتے ہیں۔ جس طرح کافروں کے ساتھی شیاطین ہوتے ہیں جو برائیوں کو مزین کر کے اُن کے سامنے پیش کرتے ہیں اسی طرح اللہ کے ثابت قدم بندوں کے ساتھی فرشتے ہوتے ہیں جو ہر آڑے وقت پر ان کو ڈھارس دیتے ہیں۔ (۱)

استقامت کے سلسلے میں اس معنی کی آیت سورہ الاحقاف ع ۲ میں بھی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (آیت ۱۳)

یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، پھر اس پر جم گئے اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

امام قشیری نے دوسری یہ آیت پیش کی ہے:

(۲) فَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ (سورۂ ہود آیت ۱۱۲)

پس اے محمدؐ! تم اور تمھارے وہ ساتھی جو کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف پلٹ آئے ہیں ٹھیک ٹھیک راہِ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمھیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمھارا رب نگاہ رکھتا ہے۔

مصطفی عروسی نے اپنے حاشیے میں مفسر ابوالسعود کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس استقامت کا حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق عقائد سے بھی ہے، اُن اعمال سے بھی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کے درمیان مشترک ہیں اور اُن اعمال سے بھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھے جیسے احکامِ شرعیہ کی تبلیغ، فرائضِ نبوت کی ادائگی اور

---

(۱) نتائج الافکار ج ۳ ص ۱۲۶

رسالت کی ذمہ داریوں کا تحمل، مختصر یہ کہ استقامت کا یہ حکم تمام اصلی و فرعی احکام اور تمام نظری و عملی کمالات کو شامل ہے اور اس بات کو بھی شامل ہے کہ احکام کی تعمیل سے اس طرح عہدہ برآ ہونا جیسا کہ حکم دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا (۱)

مسلمانوں کو جس استقامت کا حکم دیا گیا ہے اس کی حقیقت اس کے بعد والی آیت سے واضح ہوتی ہے، اس میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ:

"ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمھیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمھیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی" (سورۂ ہود آیت ۱۱۳)

یہ شیر کا زہرہ آب کرنے والی استقامت ہے اس میں ظالموں سے یارانہ تو دُور کی بات ہے ان کی طرف میلان پر بھی عذاب جہنم اور اللہ کی نصرت، حمایت چھن جانے کی دھمکی دی گئی ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے تفسیر مظہری میں واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے جب امام نے یہ آیت پڑھی تو انھیں غش آگیا، جب بے ہوشی سے افاقہ ہوا تو لوگوں نے وجہ پوچھی، انھوں نے جواب دیا: "جب ظلم کی طرف میلان کی یہ سزا ہے تو ظالم کی سزا کیا ہوگی"۔

حدیث:

ریاض الصالحین کے باب استقامت میں امام نووی نے مسلم کے حوالے سے حضرت سُفیان ابن عبداللہ کی وہ حدیث نقل کی ہے جس میں انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اِسلام کی ایک جامع تعلیم کے بارے میں سوال کیا تھا اور

---

(۱) نتائج الافکار ج ۳ ص ۱۲۶

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جواب میں فرمایا تھا قل اٰمنت باللہ ثم استقم (کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر ثابت قدم رہو)

بزرگوں کی تصریحات

امام قشیری لکھتے ہیں کہ "استقامت وہ درجہ ہے جس سے شرعی امور کی تکمیل ہوتی اور جس کے وجود پر تمام خیرات وحسنات کا حصول موقوف ہے جس شخص کو استقامت نصیب نہیں ہوئی اس کی تمام کوششیں ضائع ہوئیں اور اس کا حال اس عورت جیسا ہوا جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (النحل ع ۱۳)

اور اس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے محنت سے سوت کاتا پھر اس کو توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

امام قشیری لکھتے ہیں کہ میں نے استاذ ابو علی دقاق کو کہتے ہوئے سنا کہ استقامت کے تین درجے ہیں" اس قول کا حاصل اجمال کے ساتھ یہ ہے کہ پہلا درجہ اصلاحِ ظاہر کا ہے یعنی اپنے ظاہری اعضا وجوارح کو شرعی احکام کے مطابق ٹھیک کیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے جن اعمال کا مکلف قرار دیا ہے ان کی تعمیل پر انھیں آمادہ کیا جائے۔ دوسرا درجہ اصلاحِ باطن کا ہے یعنی قلب کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ شرعی احکام کی تعمیل میں اخلاص پیدا کرے تاکہ ہر نیک کام کا مقصد اللہ کی رضا ہو۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ تمام واردات قلبی کو سنّتِ محمدی کی ترازو میں تولا جائے اگر وہ اس کے مطابق ہوں تو ان پر عمل کیا جائے ورنہ رُک جایا جائے (۱)

ابو علی جوزجانی کہتے تھے کہ صاحبِ استقامت بنو، طالبِ کرامت نہ بنو کیونکہ

---

(۱) نتائج الافکار القدسیہ ج ۳

تمہارا نفس کرامت کا خواہاں ہے اور تمہارا رب تم سے استقامت کا مطالبہ کرتا ہے۔ تم ثابت قدم رہو اس طرح تم اپنے رب کا مطالبہ پورا کرو گے بخلاف اس شخص کے جو حصولِ کرامت کے لیے عمل کرتا ہے اس کا عمل اللہ کے لیے نہیں ہوتا اس لیے وہ مخلص نہیں ہے حالانکہ اسے اخلاص کا حکم دیا گیا ہے:

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ (البینہ)

اور ان کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاصِ عمل کے ساتھ خدا کی عبادت کریں یکسو ہو کر۔

شیخ الاسلام زکریا انصاری لکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو استقامت حاصل نہ ہو اور وہ مدعیِ کرامت ہو تو دو صورتیں ہوں گی یا تو وہ جھوٹ بول رہا ہو گا یا استدراج کے فتنے میں مبتلا ہو گا جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ ۝ (الانعام ع ۵)

پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو جو انھیں کی گئی تھی فراموش کر دیا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب اُن چیزوں سے جو اُن کو دی گئی تھیں خوب خوش ہو گئے تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اس وقت مایوس ہو کر رہ گئے۔

استدراج:۔ استدراج کے لغوی معنی کسی کو کسی چیز سے بتدریج قریب کرنے کے ہیں۔ صوفیہ اور علماء استدراج ان خارق عادت چیزوں کو کہتے ہیں جو ایسے شخص سے صادر ہوں جو معصیت پر اصرار کر رہا ہو یا صاحب استقامت نہ ہو مثلاً اگر کوئی جوگی یا گناہوں میں مبتلا کوئی انسان ہوا میں اُڑتا یا پانی پر چلتا ہو تو اس واقعہ کو استدراج کہیں گے۔ یہ لفظ کتبِ تصوف میں "کرامت" کے مقابلے میں استعمال

ہوتا ہے۔ "کرامت" ان خارق عادت واقعات کو کہتے ہیں جو اللہ کے فرماں بردار اور صاحب استقامت نیک بندوں سے صادر ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی مومن متقی ہوا میں اڑتا یا پانی پر چلتا ہو تو اسے کرامت کہیں گے۔

استدراج کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نافرمان بندوں کو پہلے مصائب میں مبتلا کرتا ہے تاکہ وہ متنبہ ہوں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں جب وہ اس سے متنبہ نہیں ہوتے تو وہ ان پر خوش حالیوں اور نعمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے، وہ ان نعمتوں کو مزید نافرمانیوں اور معصیتوں کا ذریعہ بناتے ہیں اور اس طرح بتدریج خدا کے غضب اور اس کے عذاب کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جب ان کی مدتِ مہلت ختم ہو جاتی ہے تو قدرت کا دستِ انتقام ان کی گردن دبوچ لیتا ہے۔ سورہ الاعراف میں فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝	اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ان کو بتدریج اس طریقے سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہوگا۔ اور میں ان کو مہلت دیے جاتا ہوں۔ میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔
(الاعراف ع ۲۳)	

استدراج کا لفظ ایک حدیث میں بھی استعمال ہوا ہے:

عقبہ بن عامرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا: جب دیکھو کہ دنیا میں بندے کو گناہوں پر اصرار کے باوجود اس کی محبوب و مطلوب چیزیں دی جا رہی ہیں تو سمجھ لو کہ یہ استدراج ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ والی آیت تلاوت فرمائی۔ (تفسیر مظہری ج ۳)

سورہ الاعراف کی آیت اور اس حدیث ہی سے "استدراج" کی وہ اصطلاح اخذ کی گئی ہے جو کتبِ تصوف میں مستعمل ہے۔

صوفیۂ کرام کے دو قول | متبعِ شریعت صوفیۂ کرام نے استقامت کو سب سے بڑی کرامت کہا ہے اور ان کا یہ قول صدفی صد صحیح ہے کیونکہ شیطان اور نفس پر قابو پائے بغیر استقامت حاصل نہیں ہوتی اور ان دو سرکشوں پر قابو حاصل کرنے سے بڑی کرامت اور کیا ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کی خانقاہ میں ایک شخص آکر مقیم ہوا اور مہینوں وہاں رہا لیکن اس نے ان سے نہ کوئی تعلیم حاصل کی اور نہ ان سے اپنی کسی ضرورت کا اظہار کیا۔ جب وہ خانقاہ سے واپس جانے لگا تو انھوں نے خود اس سے پوچھا کہ تم یہاں بہت دنوں رہے اور اب واپس جا رہے ہو لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ کیوں آئے تھے اور اب کیوں واپس جا رہے ہو؟ اس نے کہا، میں نے سُنا تھا کہ آپ بہت بڑے بزرگ آدمی ہیں، میں بہت دنوں یہاں رہا لیکن میں نے آپ سے کوئی کرامت صادر ہوتے ہوئے نہیں دیکھی اس لیے اب مایوس ہو کر واپس جا رہا ہوں۔ حضرت جنیدؒ نے اس سے سوال کیا یہ بتاؤ کہ اتنے دنوں میں تم نے مجھے کوئی ایسا کام کرتے ہوئے دیکھا جو سُنّت کے خلاف ہو؟ اس نے کہا میں نے آپ کو شریعت کے خلاف کوئی کام کرتے نہیں دیکھا۔ تب انھوں نے اس سے کہا کہ بھائی! اس سے بڑی کرامت اور کیا دیکھتے، ـــــ ایک شاعر نے دوسرے انداز سے یہی بات کہی ہے:؎

بیرونِ قبر لاف کرامت چہ میزنی ! ایماں اگر بگور بری صد کرامت است[1]

---

(۱) قبر سے باہر کرامت کی ڈینگ کیا مارتا ہے، اگر تو قبر میں اپنے ساتھ ایمان لے جائے تو یہ سب سے بڑی کرامت ہے۔

صوفیۂ کرام کا دوسرا قول یہ ہے: الاستقامۃ فوق الکرامۃ (استقامت، کرامت سے اونچے درجے کی چیز ہے) جب تک تصوف کا یہ صحیح تصور قائم رہا وہ علوم شریعت ہی میں سے ایک علم تھا لیکن جب اس میں کشف و کرامت اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کو اصل کی حیثیت دے دی گئی تو وہ اختلاف اور بحث و نزاع کی آماجگاہ بن گیا۔

دعا

قرآن اور احادیث کی روشنی میں

دعا کی حقیقت

دعا کے لغوی معنے ہیں پکارنا، بلانا، مانگنا اور سوال کرنا اور شرعی اصطلاح میں دعا کے معنے ہیں اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں استغاثہ اور عرض معروض کرنا۔ دعا کی حقیقت دو چیزوں سے مرکب ہے۔ اللہ کے حضور اپنی عبودیت، غلامی، احتیاج، عاجزی اور ضعف و ذلت کا اظہار اور اس کی الوہیت، ربوبیت، قدرت، رحمت اور عظمت وجلال کا اقرار۔ انسان جب اپنی بندگی و پستی اور اللہ رب العالمین کی آقائی و بالادستی کے زندہ شعور و احساس کے ساتھ اس کی بارگاہ میں عرض نیاز کرتا اور اس سے کچھ مانگتا اور کچھ چاہتا ہے تو دعا کی حقیقت وجود میں آتی ہے۔ وہ اپنے مالک کو کبھی دل ہی دل میں پکارتا ہے اور اکثر اس کی زبان بھی اس کے دل کا ساتھ دیتی ہے۔ کبھی ہاتھ پھیلائے بغیر اس سے مانگتا ہے اور اکثر دست سوال

دراز کر کے اس کے حضور گڑگڑاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کا اظہار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کو مغز عبادت بلکہ عین عبادت قرار دے کر کیا ہے۔

عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الدعاء مخ العبادۃ (ترمذی ج ۲ ابواب الدعوات)	انس بن مالک سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دعا مغز عبادت ہے۔

حضورؐ نے دعا کو مغز عبادت یا روح عبادت اس لئے فرمایا ہے کہ دعا کرنے والا ماسویٰ اللہ سے اپنی تمام امیدیں منقطع کر کے اللہ کو پکارتا ہے اور یہی توحید اور اخلاص کی حقیقت ہے اور توحید و اخلاص سے بلند تر کوئی عبادت نہیں ہے۔ محی الدین ابن عربی کہتے ہیں کہ جس طرح جسم کے تمام اعضاء ہڈیوں کے مغز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح دعا وہ مغز ہے جس سے عابدوں کی عبادت کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ایک دوسری حدیث میں حضورؐ نے قرآن کی آیت سے استدلال کرتے ہوئے دعا کو عین عبادت بھی کہا ہے۔ ہم یہ حدیث آگے "دین میں دعاء کی اہمیت" کے تحت نقل کریں گے۔ ظاہر ہے کہ دعا کو عبادت یا مغز عبادت اسی وقت قرار دیا جا سکتا ہے جب دونوں کی حقیقت ایک ہو۔ کتاب و سنت کے بیسیوں دلائل و شواہد سے ثابت ہے کہ عبادت کی حقیقت بھی وہی ہے جو دعا کی ہے یعنی یہ کہ انسان اپنی عبودیت کا اظہار اور اللہ کی معبودیت کا اعتراف و اقرار کرے۔ تمام عبادتیں اسی اظہار و اقرار کے مظاہر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم اللہ کی پرستش کریں یا اس کی اطاعت، ہماری ہر پرستش اور ہر اطاعت اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کی معبودیت کا اقرار ہے۔

دین میں دعا کی اہمیت

دین میں دعا کی اہمیت یہ ہے کہ اس کائنات کے معبود برحق نے اپنی کتاب قرآن مجید میں جس طرح بہت سے احکام و اوامر نازل فرمائے ہیں اسی طرح دعا کا حکم بھی نازل فرمایا ہے، اس کا اپنے بندوں سے مطالبہ ہے کہ وہ اس سے اور صرف اسی سے دعا مانگیں اور مدد کے لئے اسی کو پکاریں اس لئے کہ سب کچھ اسی کے دست قدرت میں ہے اور اس کائنات میں اس کی مشیت کے بغیر ایک پتّا بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ اور اس لئے بھی کہ دعا عبادت ہے اور عبادت کسی دوسرے کی جائز نہیں ـــــ سورہ المومن ر ۶ آیت ۶۰ میں حکم دیا گیا ہے:۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ	اور تمہارا رب کہتا ہے
اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ اِنَّ الَّذِيْنَ	مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں
يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ	قبول کروں گا۔ بے شک جو لوگ
سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ	میری عبادت سے گھمنڈ کرتے ہیں
دَاخِرِيْنَ ۝	وہ عنقریب ذلت و خواری کے
(المومن ۶۰)	ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔

اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کو عین عبادت قرار دیا ہے۔

عن النعمان بن بشير عن النبي	نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ
صلى الله عليه وسلم قال الدعاء	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دعا
هو العبادة ثم قرأ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ	عین عبادت ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت
اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ	تلاوت فرمائی اور تمہارا رب کہتا ہے

عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ۔

(ترمذی ابواب تفسیر القرآن ابن حبان۔ احمد۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ حاکم)

مجھے پکارو میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔ بے شک جو لوگ میری عبادت سے گھمنڈ کرتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔

یہ حدیث امام ترمذی نے ابواب الدعوات میں بھی روایت کی ہے۔ اس آیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے دین میں دعا کی اہمیت پوری طرح واضح ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ سے دعا کا صرف حکم ہی نہیں دیا گیا ہے بلکہ ترکِ دعا پر شدید وعید بھی سنائی گئی ہے۔

سورہ الاعراف میں کچھ تفصیل سے دعا کا حکم دیا گیا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ

۵۵-۵۶

اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے یقیناً وہ حد سے گذرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔

ان دو آیتوں میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) اپنے رب سے دعا کرو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ اس ہدایت میں دعا کی حقیقت اور اس کے ادب کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔ ہم آگے دعا کے آداب ایک مستقل عنوان کے تحت لکھیں گے۔

(۲) اس کو پکارو خوف اور امید کے ساتھ۔ خوف اس کے عذاب کا اور امید

اس کے فضل وکرم کی نیز ڈر اس بات کا کہ دعا میں کسی کوتاہی کی وجہ سے وہ رد نہ کردی جائے اور امید اس بات کی کہ اللہ اپنے بندے کے عجز وقصور کو دیکھتے ہوئے اسے قبول فرمائے گا۔

(۳) دوسرے اعمال کی طرح دعا میں بھی حد سے تجاوز نہ کرو۔ اس لیے کہ اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ دعا میں حد سے تجاوز کی صورتیں ہم آئندہ آداب دعا کے تحت بیان کریں گے۔

(۴) اصلاح کے بعد زمین میں فساد نہ مچاؤ۔ سب سے بڑا فساد یہ ہے کہ اللہ سے منھ موڑ کر دوسروں کو اپنا ملجا وماوی بنایا جائے، ان کو مدد کے لیے پکارا جائے اور ان کے نام کی دہائی دی جائے۔

(۵) جو لوگ خوف اور امید کے ساتھ صرف اللہ کو پکارتے اس سے دعائیں کرتے ہیں وہ محسن ہیں۔ اور اللہ کی رحمت محسنوں سے قریب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی دعا بندے کو درجۂ احسان تک پہنچا دیتی ہے۔ سورۂ اعراف ہی میں دوسرے مقام پر کہا گیا ہے :-

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا (ر۲۲ — ۱۸۰)

اللہ کے بہت سے اچھے نام ہیں تو تم اسے انہیں ناموں سے پکارو۔

اللہ کے اسمائے حسنیٰ قرآن میں بھی ہیں اور احادیث میں بھی اور چونکہ اس کی صفات بے شمار ہیں اس لیے کتنے ہی ایسے نام ہوں گے جن کا علم صرف اسی کو ہے۔ چنانچہ ایک دعا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ اس آیت کی بھی بہترین تفسیر ہیں۔ اس دعا کا متعلقہ ٹکڑا یہ ہے :-

اسئلك بكل اسم ھو لك سمیت بہ نفسك او انزلتہ فی

میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے ہر اس نام سے جس سے تو نے اپنے آپ کو

كتابك او علمته احدا من خلقك او استأثرت به في علم الغيب عندك.	موسوم کیا ہے یا وہ نام تو نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس کا علم عطا کیا ہے یا اسے تو نے اپنے ہی علم غیب میں اپنے پاس محفوظ رکھا ہے۔
(تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۹)	

سورہ البقرہ میں فرمایا گیا:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝	میرے بندے جب تم سے میرے متعلق پوچھیں تو میں ان سے قریب ہی ہوں۔ قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو جب مجھ سے دعا مانگے۔ لہٰذا انہیں چاہئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ راہ راست پالیں۔
(۲۳ — ۱۸۶)	

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے بتایا ہے کہ میں اپنے بندوں سے دُور نہیں ہوں کہ انھیں زور سے مجھے پکارنے کی ضرورت پڑے۔ میں تو ان کے قریب ہی ہوں۔ مجھے نہ زور سے پکارنے کی ضرورت ہے اور نہ میری بارگاہ میں درخواست پیش کرنے کے لیے کسی دوسری ہستی کے واسطے کی حاجت ہے۔ میرا ہر بندہ بلا واسطہ مجھ سے دعا کر سکتا ہے۔ میں اس کی دعا کو صرف سنتا ہی نہیں ہوں بلکہ اسے قبول بھی کرتا اور اس کے بارے میں فیصلہ بھی کرتا ہوں۔ جب ایسا ہے تو میرے بندوں پر بھی لازم ہے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ آیت کے اس ٹکڑے سے معلوم ہوا کہ یہ بڑی نادانی ہوگی کہ انسان اللہ کی اطاعت تو نہ کرے لیکن یہ توقع رکھے کہ اس کی دعائیں قبول کی جائیں گی۔

دراصل اللہ پر ایمان اور اس کی اطاعت ہی انسان کو اس کا مستحق بناتی ہے کہ اس کی دعا قبول کی جائے۔

رسول خدا کو دعا کا حکم

اوپر کی آیتوں میں بالعموم تمام بندوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے رب سے دعا مانگیں اور اسے پکاریں۔ اب ہم ایسی آیتیں پیش کرتے ہیں جن میں اللہ نے اپنے سب سے مقرب، سب سے محبوب اور سب سے بلند مرتبہ بندے کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اس سے دعا مانگیں۔ دین میں دعا کی اہمیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دیا گیا اور آپ نے اس حکم کی ایسی تعمیل کی جس کی کوئی مثال تاریخِ انسانی میں موجود نہیں ہے۔

اضافۂ علم کی دعا

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔ (طٰہٰ ر۶ — ۱۴)

اور دعا کرو کہ اے پروردگار، مجھے مزید علم عطا کر۔

ابتدا میں جب حضورؐ پر قرآن نازل ہوتا تھا تو آپ مشتاقانہ عجلت میں حضرت جبریل کے ساتھ ساتھ اسے دہراتے جاتے اس اندیشے سے کہ کہیں کوئی لفظ ذہن سے نکل نہ جائے۔ آپؐ کو اس مشقت سے اللہ نے روک دیا اور اس کا ذمہ خود لے لیا کہ قرآن آپؐ کو یاد رہے گا۔ البتہ سورۂ طٰہٰ میں یہ حکم دیا کہ تم مجھ سے اضافۂ علم کی دعا کیا کرو۔ مزید علم کی دعا سے ایک مراد یہ ہے کہ قرآن کے جو حصے ابھی نازل نہیں ہوئے ہیں اسے بھی عطا فرما اور دوسری مراد

یہ ہے کہ جو حصّے نازل ہوئے ہیں اس کے معانی و مسائل و معارف کا بیش از بیش فہم عطا فرما۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اللہ کو اپنے بندے کی دعا بے حد محبوب ہے اور دوسری یہ کہ علمِ دین میں اضافہ انتہائی پسندیدہ چیز ہے۔ اس چھوٹی سی آیت سے دین میں دعا اور علم دونوں ہی کی اہمیت و فضیلت پر روشنی پڑتی ہے۔

غلبہ و اقتدار کی دعا

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا۔ (بنی اسرائیل ۔۔ ۸۰)	اور دعا کرو کہ پروردگار جہاں بھی تو لیجا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور مجھ کو اپنے پاس سے ایسا غلبہ دے جس کے ساتھ تیری نصرت ہو۔

جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا زمانہ قریب آیا تو اللہ نے اپنے آخری رسول کو یہ حکم دیا کہ غلبہ و اقتدار کی دعا مانگیں اس لیے کہ آپ کی ہجرت اللہ کے باغیوں سے جنگ کا پیش خیمہ تھی اور اس کے لیے تین چیزیں ضروری تھیں۔

(الف) اس بات کی واضح دلیل اور کھلا ہوا بینہ کہ آپ ہی سچائی کے علمبردار ہیں اور جو دین آپ پیش کر رہے ہیں وہی دین حق ہے اور وہی اس کا مستحق ہے کہ دوسرے باطل ادیان پر غالب ہو۔

(ب) حکومت کا اقتدار تاکہ اس کے ذریعے نیکی کو فروغ دیا جائے اور بدی کو مٹایا جائے۔

(ج) اللہ کی نصرت کیونکہ اس کے بغیر دشمنوں پر فتح حاصل نہیں کی جا سکتی۔ سلطانا نصیرا کے فقرے میں یہ تینوں چیزیں داخل ہیں۔ ظاہر ہے کہ غلبہ و اقتدار

کے بغیر نہ دین باطل کو شکست دی جا سکتی ہے اور نہ قرآن کے تمام فرائض، احکام اور حدود کی تنفیذ ممکن ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے:- ان اللہ لیزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن (اللہ تعالیٰ حکومت کے اقتدار سے ان چیزوں کا سد باب کر دیتا ہے جن کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا)

طلب حکومت کی لطیف دعا

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ	دعا کرو اے اللہ ملک کے مالک
تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ	تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے
مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ	چاہے چھین لے جسے چاہے عزت بخشے اور
مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ	جسے چاہے ذلت دے تیرے ہی ہاتھ میں
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○	خیر ہے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

(آل عمران ۳ - ۲۶)

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دعا کا حکم دیا گیا تھا تو دشمنانِ اسلام کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ صرف جزیرۃ العرب ہی نہیں بلکہ فارس و روم کی حکومتیں بھی مسلمانوں کو ملنے والی ہیں۔ مدینہ کے یہودی اور منافقین مسلمانوں کو چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھرا ہوا دیکھ کر ان پر طنز وتعریض کے تیر برساتے تھے وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مدینہ کی یہ چھوٹی سی ہیئت اجتماعیہ روم وفارس کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لے گی۔ ایسے موقع پر اللہ نے اپنے رسول کو اس دعا کی تلقین کی جس میں ان کے طنز وتعریض کا انتہائی لطیف جواب بھی دے دیا گیا ہے۔

ابن جریر نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے درخواست کی تھی کہ فارس اور روم کی سلطنت آپؐ کی امت کو عطا کر دی جائے۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی اور امام رازی نے حسن بصری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس آیت میں اللہ نے اپنے نبی کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ فارس اور روم کی حکومت طلب کریں اور موجودہ زمانے کے بعض ذی علم مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت میں بشارت دی گئی ہے کہ امامت و سیادت کا وہ منصب جس پر بنی اسرائیل اب تک فائز رہے ہیں اب وہ بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ بہرحال اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت لطیف انداز میں امامت، سیادت اور حکومت طلب کرنے کی دعا کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومت طلبی کی یہ دعا دنیا پرستی کے لئے نہیں سکھائی گئی ہے بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ اور اللہ کے نازل کئے ہوئے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے سکھائی گئی ہے اور اس مقصد کے لیے حصول اقتدار کی دعا عین امر الٰہی کی تعمیل ہے۔ اسی مقصد کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے لیے ایک ایسی بے مثال حکومت کی دعا مانگی تھی جو ان کے سوا کسی کو نہ دی گئی ہو۔

ہدایت پر استقامت کی دعا

قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔

(الزمر ۵ - ۴۶)

(اللہ سے دعا میں) کہئے کہ اے اللہ آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے، غائب اور حاضر کے جاننے والے آپ ہی اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں فیصلہ فرمائیں گے جن میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے۔

اس دعا میں یہ لطیف انداز اختیار کیا گیا ہے کہ اس میں صرف اللہ کی حمد و ثنا کی گئی ہے اور اس کی حاکمیت کا اظہار کیا گیا ہے اور دعائیہ جز مخفی رکھا گیا ہے۔ اس مخفی جز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں ظاہر فرمادیا ہے۔ حضرت عائشہ رضؓ کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نماز تہجد کے افتتاح میں سورہ زمر کی یہ آیت فیما کانوا فیہ یختلفون تک پڑھتے تھے۔ اس کے بعد یہ دعائیہ فقرہ کہتے تھے:

اھدنی لما اختلف فیہ	حق کے بارے میں جو اختلاف پیدا
من الحق باذنك انك تھدی	کیا گیا ہے اس میں مجھے ہدایت پر قائم رکھ
من تشاء الی صراط مستقیم۔	بلاشبہ تو جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی
(مسلم بحوالہ ابن کثیر ج ۴ ص ۵٦)	طرف ہدایت دیتا ہے۔

ابن کثیر نے مسند احمد کے حوالے سے متعدد ایسی حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن میں حضورؐ نے اپنے صحابہؓ کو اس آیت کے ابتدائی کلمات کے ساتھ دعائیں سکھائی ہیں ان میں کی ایک دعا میں بروز قیامت اللہ کی رحمت کا سوال کیا گیا ہے۔ ان احادیث کو سامنے رکھ کر ہم آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں کہ اس آیت میں طلب و درخواست کا مخفی جز یہ ہے: اے اللہ! دنیا کے اندر ہمیں ان اختلافات کے ہجوم میں صراط مستقیم پر قائم رکھ اور آخرت میں ہمیں سرخروئی اور اپنی خوشنودی عطا فرما!

ہر برائی سے پناہ مانگنے کی دعا

انسان کو ہر قسم کی برائیوں پر ابھارنے والا شیطان اور اس کا جرگہ ہے۔ اس عدو مبین کی شرارتوں سے پناہ مانگنے کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دیا گیا تھا۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ۝ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

(الاعراف ر۲۴، ۱۹۹-۲۰۰)

اے نبی! نرمی اور درگذر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

حق کی وصیت، نیکی کی تلقین اور برائی سے اجتناب کی نصیحت ایسی چیزیں نہیں ہیں جو ہمیشہ ٹھنڈے پیٹوں قبول کر لی جائیں بلکہ اس راہ میں داعیانِ حق پر زیادتیاں بھی کی جاتی ہیں اور جاہلوں کی اشتعال انگیزیوں سے بھی انھیں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں تواصی بالحق کے ساتھ صبر، عفو و درگذر اور جاہلوں سے اعراض کا حکم بھی دیا گیا ہے لیکن یہ تدبیریں انسانوں کی شرارتوں کے مقابلے میں کارآمد ہوتی ہیں۔ شیطان کی اکساہٹوں اور اشتعال انگیزیوں سے بچنے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ داعی حق اس سے اللہ کی پناہ مانگے جس کی قدرت شیطان پر بھی حاوی ہے۔ سورہ حٰم السجدہ میں بھی انہیں الفاظ کے ساتھ آپؐ کو شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے اور سورہ المومنون میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شیطان سے کس طرح اللہ کی پناہ مانگی جائے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ ۝ وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونَ۔

(المومنون ر۶، ۹۶ تا ۹۸)

برائی کو اس طریقہ سے دفع کرو جو بہترین ہو جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں اور دعا کرو کہ پروردگار میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں بلکہ اے میرے رب میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔

ان آیتوں میں بھی پہلے حکم دیا گیا ہے کہ برائی کو بھلائی سے دفع کرو اور اس کے بعد شیطان کی اکساہٹوں سے پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے اس لئے کہ اس کا علاج صرف اللہ کے دست قدرت میں ہے۔ ان آیتوں کے علاوہ قرآن کی سب سے آخری سورہ شیاطین جن وانس کی وسوسہ اندازیوں سے استعاذہ کے لئے ہی نازل کی گئی ہے۔ اس میں پناہ مانگنے کا حکم بھی دیا گیا ہے اور اس کے الفاظ بھی سکھلائے گئے ہیں۔ سورۂ الناس سے پہلے سورۂ الفلق میں ہر شر اور ہر برائی سے اللہ کی پناہ مانگنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ اسی لئے ان دونوں سورتوں کا نام "المعوذتین" ہے۔ ان دو مستقل سورتوں کو نازل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ استعاذہ اور تعوذ یعنی اللہ کی پناہ مانگنے کی دعاؤں کو دین میں کیا مقام حاصل ہے اور اس کی اہمیت کیا ہے۔ غصے اور غضب کو دور کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھنے کی تعلیم دی ہے اور قرآن کی تلاوت شروع کرنے سے پہلے بھی "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

طلب مغفرت کی دعا

کسی کم درجہ کے انسان کی معمولی کوتاہی نظر انداز کی جا سکتی ہے لیکن کسی بڑے درجے کے انسان کی معمولی کوتاہی بھی قابل گرفت بن جاتی ہے۔ نزدیکاں را بیش بود حیرانی، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ اصولی بات یاد رکھنی چاہیئے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو استغفار کا جو حکم دیا گیا ہے وہ ان کے بلند درجات کی مناسبت سے دیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ استغفار سے صرف کوتاہیاں معاف نہیں ہوتیں بلکہ اس سے درجات بھی بلند ہوتے ہیں۔ ان دونوں

باتوں کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی استغفار کا حکم دیا گیا ہے کہیں صرف اپنے لئے اور کہیں اپنے لئے بھی اور مسلمانوں کے لئے بھی۔

(۱) وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ۔
(المومنون ۱۱۸)

اور کہیئے اے میرے رب (میری خطائیں) معاف کر اور رحم کر اور تو سب رحم کرنیوالوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت سے پہلے مشرکین کے انکار آخرت اور معبودان باطل سے ان کی دعاؤں کی تردید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ غیر اللہ کو پکارنے اور ان کی دہائی دینے والے کافروں کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد حضورؐ کو اپنے رب سے مغفرت اور رحمت طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ صرف اللہ سے دعا توحید کی تکمیل بھی ہے۔

(۲) فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ۔
(المومن ۶ ـ ۵۵)

پس اے نبی، صبر کرو بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے قصور کی معافی چاہو اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے نصرت و حمایت کا جو وعدہ کیا ہے وہ سچا ہے اس لئے آپ صبر کے ساتھ اس کا انتظار کیجئے۔ اپنی کوتاہی کی معافی چاہتے رہیئے اور ہمیشہ اپنے رب کی حمد و تسبیح میں مشغول رہیئے۔

(۳) فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ۔
(محمد ۲ ـ ۱۹)

پس تم جان رکھو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور اپنے گناہ کی مغفرت طلب کرو اور مسلمان مرد اور عورتوں کے لیے بھی استغفار کرو۔ اللہ کو معلوم ہے

تمہاری بازگشت اور تمہارا گھر۔

استغفار کے حکم کی تعمیل حضورؐ نے اس طرح کی ہے کہ نمازوں کے اندر آپ جو استغفار کرتے تھے اس کے علاوہ بھی بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ روزانہ ستر بار اور بعض میں آتا ہے کہ روزانہ سو بار استغفار کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دعائیں، استعاذے اور استغفار مروی ہیں۔ اگر ان سب کو تشریح کے ساتھ جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب آسانی کے ساتھ تیار کی جاسکتی ہے۔

(۴) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝ پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے مغفرت طلب کیجیے۔ بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔ (النصر)

جب حضور کی وفات کا زمانہ قریب آیا تو سورۂ اذاجاء نصر اللہ والفتح نازل ہوئی اور آپ کو اس میں بھی حمد و تسبیح اور استغفار کا حکم دیا گیا۔ صحیح احادیث میں مروی ہے کہ سورۂ النصر میں آپ کو زمانۂ وفات کے قریب ہونے کی خبر دی گئی تھی اور صحیح احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد آپ نمازوں کے اندر بھی اور دوسرے اوقات میں بھی سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي (اے اللہ! اے ہمارے رب میں حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتا ہوں۔ اے اللہ مجھے بخش دے) پڑھا کرتے تھے۔

فرشتوں کو دعا کا حکم

قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ فرشتے ہر کام امر الٰہی کے تحت کرتے ہیں۔ يَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (فرشتے وہی کام کرتے ہیں جس کا انھیں حکم دیا جاتا ہے) اس کے پیش نظر یہ بات یقینی ہے کہ مسلمان مرد اور عورتوں کے لئے جو دعا وہ کرتے

ہیں وہ بھی امرِ الٰہی کے ماتحت ہی ہے۔ فرشتوں کو بھی اللہ نے حکم دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے دعا کرتے رہیں۔ اللہ تعالےٰ کے اس حکم سے بھی دین میں دعا کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ فرشتوں کی طویل دعا سورۂ المومن کی ابتدا میں ہے۔ میں یہاں اس کا ترجمہ پیش کرتا ہوں :

"عرشِ الٰہی کے حامل فرشتے اور وہ جو عرش کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں۔ سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں : اے ہمارے رب تو اپنی رحمت اور علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے پس معاف کر دے اور عذابِ دوزخ سے بچالے ان لوگوں کو جنھوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اے ہمارے رب اور داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے والدین اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (ان کو بھی وہاں ان کے ساتھ ہی پہنچا دے) اور بچا دے ان کو برائیوں سے جس کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا اس پر تو نے بڑا رحم کیا یہی بڑی کامیابی ہے۔" (۴۰ آیتہ ۷ تا ۹)

ان آیتوں سے ایک طرف دین میں دعا کی اہمیت اور فضیلت معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف ان میں اپنے گناہوں سے تائب اور راہِ حق پر چلنے والے مسلمانوں کے عظیم فضل و شرف کا ذکر ہے۔ تسلی یہ ہے کہ جب اللہ تعالےٰ کے مقرب ترین فرشتے خود اس کے حکم کے تحت ان کے لئے مغفرت اور دخولِ جنت کی دعا کر رہے ہیں تو پوری توقع ہے کہ ان کی دعا قبول کی جائے گی اور فضل و شرف یہ ہے کہ

بارگاہ الٰہی میں حاضر مقرب ترین فرشتے تک ان سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی طرف متوجہ ہیں اور بارگاہ الٰہی میں ان کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔

احادیث میں بھی متعدد مواقع پر اس کا ذکر ہے کہ فرشتے مسلمانوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ایک موقع کی حدیث یہ ہے کہ جب مسجد میں نمازی، نماز باجماعت سے فارغ ہو جاتا ہے تو جب تک وہ اپنی نماز گاہ (مصلّیٰ) پر موجود رہتا ہے فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں اللھم صل علیہ اللھم ارحمہ (اے اللہ اس پر اپنی رحمت نازل فرما اے اللہ اس پر رحم فرما!) ایک حدیث میں ہے جب تک وہ مسجد میں کسی کو تکلیف نہیں دیتا جب تک وہ باوضو رہتا ہے فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔ بعض حدیثوں میں ہے کہ وہ اللھم اغفر لہ اللھم تب علیہ (اے اللہ اس کو بخش دے اے اللہ اس کی توبہ قبول کر) کہتے رہتے ہیں۔

غیر اللہ سے دعا شرک ہے

چونکہ دعا کی حقیقت عین توحید اور خود دعا عقیدہ توحید کا ایک بڑا مظہر ہے اس لئے قرآن نے غیر اللہ سے دعا کو شرک قرار دیا ہے اور اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کو صراحۃً اس سے منع فرمایا ہے۔ اس لیے اس سلسلے کی بھی چند آیتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں :-

(۱) وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے ان میں سے ہر ایک مقررہ مدت کے لئے رواں دواں ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب، بادشاہی اسی کی ہے اور اللہ کو چھوڑ کر جنہیں تم پکارتے ہو وہ

پر کاہ کے برابر بھی کسی چیز کے مالک نہیں ہیں۔ اگر تم انہیں پکارو
تو وہ تمہاری دعائیں نہیں سنیں گے اور اگر سن لیں تو تمہیں اس کا
جواب نہیں دے سکیں گے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار
کریں گے اور باخبر (اللہ) کی طرح تمہیں اس حقیقت کی صحیح خبر کوئی
نہیں دے سکتا۔ (الفاطر ۱۳-۱۴)

اس آیت میں غیر اللہ سے دعا کو بالفاظ صریح شرک کہا گیا ہے کیونکہ اس سے پہلے ان کے مشرکانہ اعمال میں سے غیر اللہ سے دعا ہی کا ذکر ہے اور اس کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ قیامت میں وہ تمہارے شرک کا انکار کریں گے۔ بلاشبہ شرک میں غیر اللہ کی پرستش، نذر و نیاز اور چڑھاوا سبھی داخل ہے لیکن آیت کا سیاق بتا رہا ہے کہ یہاں اس سے اولین مراد غیر اللہ سے دعا ہی ہے۔ سورۃ الفاطر ہی میں دوسری جگہ کہا گیا ہے:

(۲) (اے نبی!) ان سے کہو کبھی تم نے دیکھا بھی ہے اپنے
شریکوں کو جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہو؟ مجھے بتاؤ انھوں نے
زمین میں کیا پیدا کیا ہے؟ آسمانوں میں ان کی کیا شرکت ہے؟ (اگر
یہ نہیں بتا سکتے تو ان سے پوچھو) کیا ہم نے انھیں کوئی تحریر لکھ کر دی
ہے جس کی بنا پر یہ (اپنے شرک کے لیے) کوئی صاف سند رکھتے
ہوں؟ نہیں بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو محض فریب کے جھانسے
دیئے جا رہے ہیں۔ (فاطر ۴۰)

اس آیت میں بھی غیر اللہ سے دعا کرنے اور اس کی دہائی دینے کو شرک قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کے پاس اس شرک کی کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ فریب میں

مبتلا کرنے والے جاہل پیر، دنیادار فقیر، زرپرست پروہت اور مجاور ہیں جو اپنے معتقدین کو جھانسے دیتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح نذر نیاز اور چڑھاوے کی آمدنی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ نہ تو کوئی آسمان و زمین کی تخلیق میں اللہ کا شریک ہے اور نہ اس نے کسی کو یہ اختیار دیا ہے کہ لوگوں کی قسمت بنا یا بگاڑ سکے۔ اس لئے اللہ کے سوا کسی اور سے دعا کرنا یا اس کی دہائی دینا حماقت اور شیطان کے اغوا کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ
فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝
(یونس ۱۰۶)

اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکار جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ اگر تو ایسا کرے گا تو ظالموں میں سے ہوگا۔

اس آیت میں غیر اللہ سے دعا کرنے اور اس کی دہائی دینے کی صریح ممانعت کے ساتھ وہ حقیقت بھی بتادی گئی ہے جس کی وجہ سے لوگ ایسا کرتے ہیں۔ انسان اپنی حماقت اور شیطان کے اغوا کی وجہ سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کے پاس بھی اختیار و اقتدار اور ایسی قدرت ہے کہ وہ کسی دوسرے کو نقصان اور نفع پہنچا سکتا اور اس کی قسمت کو بنا اور بگاڑ سکتا ہے اس لئے اللہ نے اس آیت میں بھی اور متعدد دوسری آیتوں میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اس طرح کا اقتدار اللہ کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ہے اور اس کی مشیت کے بغیر کوئی کسی کو نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اسی طرح اس نے یہ حقیقت بھی کھول دی ہے کہ اگر اللہ کی طرف سے کوئی ضرر پہنچے تو اس کو اس کے سوا اور کوئی دفع نہیں کر سکتا اور اگر وہ کسی خیر کا ارادہ کرے تو کوئی نہیں جو اسے نفع پہنچانے سے روک سکے۔ سورۂ یونس

کی آیت ۱۰۷ میں کہا گیا ہے:

"اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔"

قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اگر کوئی شخص غیر اللہ کی دہائی دیتا اور اس سے دعائیں مانگتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کو اپنا معبود بنا رہا اور اللہ کے ساتھ اس کو شریک قرار دے رہا ہے۔ غیر اللہ کی عبادت کرنے اور اس سے دعا مانگنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کی حقیقت ایک ہے۔

(۴) فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ (الشعراء ۲۱۳)

پس اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو، ورنہ تم بھی سزا پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔

معلوم ہوا کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکارنا اس کو معبود کی حیثیت دینا ہے اور اللہ کا قانون بے لاگ ہے، اس شرک میں جو بھی مبتلا ہو گا وہ اللہ کی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔

دعا کی اہمیت و فضیلت احادیث میں

دعا کے بارے میں اس کثرت سے احادیث مروی ہیں کہ کتب احادیث میں اس کے لئے مستقل ابواب مخصوص کرنے پڑے ہیں۔ میں پہلے دعا کی اہمیت و فضیلت کے سلسلے میں چند حدیثیں پیش کرتا ہوں:۔

دعا کا تاکیدی حکم

جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کثرت

سے دعائیں مانگی ہیں کہ آپ کی دعاؤں سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ آیات قرآنی کے پیش نظر آپ نے اپنی امت کو اللہ سے دعا کرنے کا موکد حکم دیا ہے۔

(۱) ابن عمر رفعہ: ان الدعاء ینفع مما نزل ومما لم ینزل ولا یرد القضاء الا الدعاء فعلیکم بالدعاء

جمع الفوائد بحوالہ ترمذی (ابواب الدعوات)

حضرت ابن عمرؓ نے حضورؐ سے روایت کی ہے کہ دعا ان مصیبتوں اور بلاؤں کو دور کرنے میں بھی نافع ہے جو نازل ہو چکی ہوں۔ . . . . اور ان میں بھی جو نازل نہیں ہوئی ہوں اور قضا کو دعا کے سوا کوئی چیز ٹال نہیں سکتی پس تم پر لازم ہے کہ دعا کرو۔

"فعلیکم بالدعاء" (تم پر لازم ہے کہ دعا کرو) ایک موکد حکم ہے۔

(۲) ابن مسعودؓ رفعہ: سلوا اللہ مِن فَضلِہ فان اللہ یحب ان یسئل وافضل العبادۃ انتظار الفرج

(جمع الفوائد بحوالہ ترمذی)

ابن مسعودؓ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ سے اس کا فضل مانگو اس لیے کہ اللہ (اپنے بندوں کے) سوال کو پسند کرتا ہے اور تنگی میں کشائش کا انتظار بہترین عبادت ہے۔

تنگی و ترشی کی حالت میں یا کسی بھی مصیبت و بلا کے وقت کشادگی رزق اور دفع بلا کے انتظار کو بہترین عبادت اس لیے کہا گیا ہے کہ بندہ مومن اپنے آقا و مولا سے اس کے فضل و کرم کی بھیک مانگتا رہتا ہے وہ نہ اس سے تھکتا ہے نہ اکتاتا ہے اور نہ کشادگی و رفع بلا کے لیے کوئی غلط ذریعہ یا غلط طریقہ اختیار کرتا ہے بلکہ صرف اللہ کے فضل کی آس لگائے رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں بندے کا صبر و توکل

بہترین عبادت ہے۔

(۳) ابوھریرۃ رفعہ: من لم یسأل اللہ یغضب علیہ (جمع بحوالہ ترمذی)

جو اللہ سے دعا نہیں کرتا اللہ اس پر غضبناک ہوتا ہے۔

اس حدیث میں جو خبر دی گئی ہے وہ دعا کے بارے میں انتہائی موکد حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ اس حدیث کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان اپنے آپ کو غضب الٰہی سے بچانا چاہتا ہو اسے اللہ سے دعا مانگنا چاہیئے۔ یہ حدیث ابن ماجہ نے بھی روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔ من لم یدع اللہ غضب علیہ

اسی اہمیت کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں صحابہ کرامؓ کو دعاؤں کی باضابطہ تعلیم دی ہے اور ان کے الفاظ تک سکھائے ہیں۔

تکثیر دعا کا حکم

حضورؐ نے اپنے مقدس ساتھیوں کو تکثیر دعا کی بھی ترغیب دی ہے۔

(۱) عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اقرب مایکون العبد من ربہ وھو ساجد فاکثروا الدعاء (ریاض الصالحین بحوالہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سجدے کی حالت میں بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے پس تم بکثرت دعا مانگو۔

(۲) ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو دعا کے فوائد بتائے تو ان میں سے بعض نے عرض کیا۔ "تب تو یا رسول اللہ ہم بکثرت دعا مانگیں گے۔" حضورؐ نے جواب دیا۔ "اللہ کا فضل تمہاری دعاؤں سے بہت زیادہ ہے" یعنی اللہ کا خزانہ، فضل وکرم بے کراں ہے۔ اس لیے تمہاری کثیر دعاؤں کو قبول کرنے

کے بعد بھی اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ حضورؐ کے اس جواب میں تکثیرِ دعا کی کتنی دل آویز ترغیب ہے۔ یہ حدیث امام ترمذی نے حضرت عبادہ بن الصامتؓ سے ابواب الدعوات میں روایت کی ہے۔ پوری حدیث کا ترجمہ آگے ایک عنوان کے تحت آرہا ہے۔

دعا کی فضیلت

اذکار و عبادات میں دعا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باوقعت اور مکرم شے ہے۔

عن ابی ھریرۃؓ عن النبیؐ لیس شیئٌ اکرم علی اللہ من الدعاء (ترمذی)

اللہ کے نزدیک کوئی چیز دعا سے زیادہ مکرم نہیں ہے۔

یہ حدیث ابن ماجہ، احمد، بخاری (فی الادب المفرد) ابن حبان اور حاکم نے بھی روایت کی ہے۔ دعا کی فضیلت میں اگر اس ایک حدیث کے سوا کوئی دوسری حدیث نہ ہوتی جب بھی یہ کافی تھی۔ دعا کی جو حقیقت اس سے پہلے اس کتاب میں بیان کی گئی ہے اس کو سامنے رکھا جائے تو اس حدیث کو سمجھنا دشوار نہیں ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ جس طرح اللہ کو اپنے بندوں کا غرور، گھمنڈ اور تکبر سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ اسی طرح اس کو اپنے سامنے اپنے بندوں کی عاجزی، احتیاج اور عبودیت کا اظہار و اقرار سب سے زیادہ پسند ہے۔

(۲) دعا بندہ مومن کو اللہ کی رحمتوں کا مستحق بناتی ہے۔

ابن عمر رفعہ: من فتح لہ باب الدعاء فتحت لہ ابواب الرحمۃ۔ (جمع الفوائد بحوالہ ترمذی)

حضرت ابن عمرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا اس کے لیے

رحمت کے دروازے کھل گئے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس کو اللہ سے دعا مانگنے کی توفیق مل گئی اور جس کو دعا کا ذوق پیدا ہو گیا اس نے اپنے آپ کو اللہ کی رحمتوں کا مستحق بنا لیا وہ اس کو اپنی رحمتوں سے نوازے گا۔

(۳) دعا سے درجات بلند ہوتے ہیں۔

ابوھریرۃ رفعہ: ان اللہ تعالیٰ لیرفع للرجل الدرجۃ فیقول انّی لی ھذا؟ فیقول بدعاء ولدك لك
(جمع، بحوالہ بزاز)

حضرت ابوہریرہ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کا درجہ بلند فرماتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے یہ درجہ کہاں سے ملا۔ اللہ فرماتا ہے کہ اس دعا کے بدلے میں جو تیری اولاد نے تیرے لیے کی۔

ظاہر ہے کہ جب دعا سے والدین کے درجے بلند ہوں گے تو کیا دعا کرنے والی اولاد کے اپنے درجات بلند نہ ہوں گے؟ اسی معنے کی ایک حدیث موطا امام مالک میں بھی ہے۔

دعا کے شرائط و آداب

اب تک کی تفصیل سے ہمیں معلوم ہوا کہ دین میں دعا کی بڑی اہمیت ہے اور یہ ایک ایسی عبادت ہے جس سے اعراض اللہ رب العالمین کو سخت ناپسند ہے اور اب ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس کے شرائط و آداب کیا ہیں۔ قرآن و احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عبادت شرائط و آداب سے خالی نہیں ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہم عبادات کے نتائج و ثمرات تو حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن ان

کے شرائط و آداب کی تکمیل کی طرف دھیان نہیں دیتے۔

قرآن و احادیث میں دعا کے جو شرائط و آداب مذکور ہیں وہ تین قسموں میں بانٹے جا سکتے ہیں۔ کچھ شرائط و آداب دعا سے پہلے ہیں۔ کچھ اس کے اندر ہیں، اور کچھ اس کے بعد ہیں۔ اگر ہم مثال کے طور پر نماز کو اپنے سامنے رکھ لیں تو ان شرائط و آداب کو سمجھنا آسان ہو جائے گا کیونکہ نماز کے لیے بھی کچھ شرائط و آداب اس سے پہلے ہیں، کچھ اس کے اندر ہیں اور کچھ اس کے بعد ہیں۔ دعا سے پہلے کی دو شرطیں بڑی اہم ہیں :۔

(۱) دین کو اللہ کے لیے خالص کر لینا

یہ ایک ایسی شرط ہے جو اللہ رب العزت کی تمام عبادتوں میں لگی ہوئی ہے۔ کوئی عبادت اس شرط کو پورا کیے بغیر قبول نہیں ہوتی۔ دین کو اللہ کے لیے خالص کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی کو شریک نہ کیا جائے۔ پرستش صرف اسی کی اور پیروی و اطاعت صرف اسی کے احکام و اوامر کی کی جائے۔ اس کے حکم کے علی الرغم کسی کی اطاعت نہ کی جائے اور جو کچھ کیا جائے صرف اسی کی رضا حاصل کرنے اور اسی کے حکم کی تعمیل کی نیت سے کیا جائے۔ کوئی عمل محض دکھاوے کے لیے نہ کیا جائے۔ ہر عبادت اور ہر اطاعت شرک اور ریا کی آمیزش سے پاک ہو۔ قرآن میں متعدد مقامات پر صراحت کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی عبادت کی جائے اور اس سے دعا مانگی جائے۔ اگر کوئی شخص اس شرط کی خلاف ورزی کر کے یہ توقع کرے کہ اس کی عبادت اور اس کی دعا بارگاہ الٰہی میں قبول کی جائے گی تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ عبادت کے بارے میں فرمایا گیا ہے :

إِنَّآ أَنزَلۡنَآ إِلَيۡكَ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ فَٱعۡبُدِ ٱللَّهَ مُخۡلِصٗا لَّهُ ٱلدِّينَ ۝ أَلَا لِلَّهِ ٱلدِّينُ ٱلۡخَالِصُۚ (الزمر ۲-۳)

(اے محمدؐ!) یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے۔ لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے خبردار، دین خالص اللہ کا حق ہے۔

اسی سورۂ زمر میں دوسری جگہ کہا گیا ہے:

قُلِ ٱللَّهَ أَعۡبُدُ مُخۡلِصٗا لَّهُۥ دِينِي ۝ فَٱعۡبُدُواْ مَا شِئۡتُم مِّن دُونِهِۦۗ (زمر ۱۴-۱۵)

کہدو کہ میں اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرکے اسی کی بندگی کروں گا تم اس کے سوا جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو۔

یہ ایک سخت تنبیہی انداز ہے جو غیر اللہ کی بندگی کرنے پر مشرکین کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح کی آیتیں قرآن میں اور بھی ہیں۔ مخصوص طور پر دعا کے لیے سورۂ الاعراف میں کہا گیا ہے:

وَٱدۡعُوهُ مُخۡلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَۚ (آیت ۲۹)

اور پکارو اس کو خالص اس کے فرماں بردار ہوکر۔

سورۂ المومن میں ہے:

فَٱدۡعُواْ ٱللَّهَ مُخۡلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ وَلَوۡ كَرِهَ ٱلۡكَٰفِرُونَ ۝ (آیت ۱۴)

پس اللہ ہی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرکے خواہ تمہارا یہ فعل کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بندگی و طاعت کو اللہ کے لیے خالص کرکے صرف اسی کو پکارنا، اس کی دہائی دینا اور اس سے دعا کرنا کافروں کو سخت ناگوار

ہے۔ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی پکارنا اور ان کی دہائی دینا پسند کرتے ہیں۔
سورۂ المومن ہی میں دوسری جگہ ہے:

هُوَ الْحَيُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ	وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی معبو
فَادْعُوْهُ مخلصين له الدين	نہیں اسی کو تم پکارو اپنے دین کو اس کے
الحمد لله رب العلمين	لیے خالص کر کے۔ ساری تعریف اللہ
(آیت ۶۵)	رب العالمین کے لیے ہے۔

آج بہت سے مسلمانوں کا بھی حال یہ ہے کہ ان کی بندگی و اطاعت اللہ کے لیے خالص رہی ہے اور نہ ان کی دعا۔ وہ اوامر الٰہی کے علی الرغم دوسروں کی اطاعت بھی کر رہے ہیں اور اللہ کے ساتھ دوسروں کی دہائی بھی دے رہے ہیں۔ کاش وہ من گھڑت تاویلات کو ترک کر کے ان آیات پر غور کرتے۔

(۲) اکل حلال و کسب حلال

قبولیت دعا کے لیے دوسری اہم شرط یہ ہے کہ دعا کرنے والے کا رزق حلال ہو اور اس کی کمائی یا ذریعہ معاش بھی حلال ہو، حرام خوری کے ساتھ دعا قبول نہیں ہوتی۔ یہ شرط صراحت کے ساتھ صحیح حدیث میں مذکور ہے اور اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی دو آیتوں سے استشہاد فرمایا ہے۔ اس لیے کہنا چاہیے کہ اکل حلال و کسب حلال کی شرط اشارۃً خود قرآن میں مذکور ہے۔

امام مسلم نے کتاب الزکوٰۃ میں اور امام ترمذی نے سورۂ البقرہ کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت کی ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! بلاشبہ اللہ تمام نقائص و عیوب سے پاک ہے اور صرف حلال

اور پاک چیزوں ہی کو قبول فرماتا ہے اور اس کے متعلق اس نے مومنوں کو وہی حکم دیا ہے جو اپنے رسولوں کو دیا ہے۔ اللہ نے اپنے رسولوں سے فرمایا ہے: "اے میرے پیغمبرو تم پاک اور حلال غذا کھاؤ اور صالح عمل کرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو میں پوری طرح اس سے باخبر ہوں۔" اور اپنے مومن بندوں سے اس نے کہا ہے۔

"اے ایمان لانے والو، تم میری دی ہوئی روزی میں سے حلال اور پاک چیزیں کھاؤ۔"

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدیہ الی السماء یارب یارب ومطعمہ حرام ومشربہ حرام وملبسہ حرام وغذی بالحرام فانی یستجاب لذالك۔

پھر آپ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو (کسی مقدس مقام میں) لمبا سفر طے کرکے آتا ہے پریشان مو اور غبار آلود مگر حال یہ ہوتا ہے کہ اس کا کھانا حرام، لباس حرام اور اس کا جسم حرام غذا سے پلا ہوا پس اس شخص کی دعا کس طرح قبول ہو۔

حضورؐ نے اپنے ارشاد میں جن دو آیتوں کا حوالہ دیا ہے ان میں سے پہلی سورۂ المومنون کی آیت ۵۱ ہے اور دوسری سورۂ البقرہ کی آیت ۱۷۲ ہے۔ قبولیت دعا کی اس شرط سے بھی مسلمان جو غفلت برت رہے ہیں اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دعا کے اندر کی شرطیں

قرآن اور احادیث میں دعا کے اندر کی تین اہم شرطیں مذکور ہیں۔

حضورِ قلب، تضرّع، خوف و رجاء۔

حضورِ قلب کا مطلب یہ ہے کہ دعا کے وقت داعی کا دل اللہ کی طرف متوجہ اور اس کی بارگاہ میں حاضر ہو۔ ایسا نہ ہو کہ زبان سے تو دعا کے الفاظ نکل رہے ہوں اور دل کہیں اور کی ہوا کھا رہا ہو۔ دعا کے وقت اگر دل غافل ہو تو وہ قبول نہیں ہوتی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

واعلموا ان اللہ لا یستجیب دعاء من قلب غافل، لاہ (کنز العمال جلد ۲) — اور جان لو کہ اللہ دعا قبول نہیں کرتا کسی غافل دل کی۔

اسی معنی کی حدیث طبرانی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے۔ اگر دل ہی حاضر نہ ہو تو پھر تضرّع اور خوف و رجا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ جب آدمی دعا کر رہا ہو تو اسے شعور ہونا چاہیئے کہ وہ کیا کر رہا ہے، کیا کہہ رہا ہے اور کس سے کہہ رہا ہے۔

تضرّع کی شرط صراحۃً قرآن میں مذکور ہے۔ اس مقالے کی پہلی قسط میں سورہ الاعراف کی آیت ۵۵-۵۶ نقل کی گئی ہے اس کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ آیت ۵۵ کا پہلا ٹکڑا یہ ہے۔ اُدْعُوا ربکم تضرعًا (اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے) یہاں تضرّع کا مطلب یہ ہے کہ دعا کرنے والا اللہ کے سامنے اپنی ذلت، عاجزی، پستی اور ضعف کے زندہ شعور اور تازہ احساس کے ساتھ دعا کرے۔ اس کا مطلب زور زور سے چیخ چیخ کر دعا کرنا نہیں ہے کیونکہ اس کی صراحۃً ممانعت آئی ہے اور یہ آدابِ دعا کے خلاف ہے جیسا کہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔ مفسرین نے اس لفظ کی تفسیر تذلل تخشع اور استکانت کے الفاظ سے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے سامنے اپنے بندے کی عاجزی کو بے حد پسند فرماتا ہے۔ وہ جب اپنے آقا و مولیٰ کے سامنے گڑگڑا کر دستِ سوال دراز کرتا ہے تو

اس کے مالک کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ قرآن میں کفار و مشرکین کی جن کیفیات و حالات کی مذمت کی گئی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے خدا کے سامنے عاجزی کا اظہار نہیں کیا اور نہ اس کے سامنے گڑگڑائے۔

وَلقد اخذنا ھم بالعذاب	اور ہم نے ان کو آفت میں پکڑا
فما استکانوا لربھم وما	پھر نہ انھوں نے اپنے رب کے سامنے
یتضرعون ٥ (المومنون ۷۶)	عاجزی کی اور نہ گڑگڑائے۔

اور قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں تضرع اور اخلاص وہ چیز ہے جو دنیا میں کفار و مشرکین کو بھی بعض مصیبتوں سے بچا لیتی ہے۔ مشرکین پر ان کے شرک کی حماقت واضح کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے:

"اے محمدؐ! ان سے پوچھو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمہیں خطرات سے بچاتا ہے؟ کون ہے جس سے تم (مصیبت کے وقت) گڑگڑا گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعائیں مانگتے ہو؟ کس سے کہتے ہو کہ اگر اس بلا سے تو نے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکر گذار ہوں گے۔ کہو، اللہ تمہیں اس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے۔ پھر تم دوسروں کو اس کا شریک ٹھیراتے ہو۔ (الانعام ۶۳، ۶۴)

مشرکین سے یہی سوال النمل میں اس طرح کیا گیا ہے:-

کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے؟ اور (کون ہے جو) تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے، کیا اللہ کے سوا کوئی اور خدا بھی (یہ کام کرنے والا) ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو۔ (آیت ۶۲)

ان آیتوں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں تضرع اور اضطرار و بیقراری

کی کیفیت اسے بارگاہ الٰہی میں قابل قبول بنا دیتی ہے۔ دعا اور ذکر دونوں ہی میں تضرع اور خوف و رجا کا مقام وہی ہے جو نماز میں خشوع اور خضوع کا ہے۔ ذکر الٰہی کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ
تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً
(الاعراف)

اے نبیؐ! اپنے رب کو یاد کیا کرو۔
دل ہی دل میں گڑگڑاتے ہوئے اور
خوفِ خدا کے ساتھ۔

خوف اور امید کے ساتھ دعا کرنے کی تعلیم بھی الاعراف آیت ۵۶ میں صراحۃً موجود ہے۔ وادعوہ خوفاً وطمعاً (اور اس کو پکارو خوف کے ساتھ اور امید کے ساتھ) اللہ کے عذاب کا خوف اور اس کے ثواب کی امید وہ چیز ہے جو مومن کو راہ اعتدال پر قائم رکھتی ہے۔ وہ نہ اسے بے پروا اور نڈر ہونے دیتی ہے اور نہ اسے مایوس اور دل شکستہ بناتی ہے۔ خاص دعا کے لحاظ سے اس بات کا اندیشہ کہ کسی کوتاہی کی وجہ سے دعا رد نہ کر دی جائے۔ اسے دعا کے شرائط و آداب کی طرف متوجہ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بیکراں کا خیال اسے قبولیت دعا کا امیدوار بناتا ہے۔ قرآن میں انبیاء کرام علیہم السلام اور صالح بندوں کی دعا و عبادت کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے اس میں خوف و رجاء کا خاص طور پر ذکر ہے۔ ایک مقام پر انبیاء کے مختلف حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسَارِعُوْنَ
فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ
رَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝
(الانبیاء ۹۰)

یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ
کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے
ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے آگے
جھکے ہوئے تھے۔

ایک جگہ صالحین کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

تَتَجَافیٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (السجدہ ۱۶)

ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

ہمیں اپنی عبادتوں اور دعاؤں کو ان آیات کی کسوٹی پر کس کر دیکھنا چاہیۓ اور انھیں نکھرا بنانے کی سعی کرنا چاہیۓ۔ یہی حقیقی تدبیر ہے ان کے نتائج و ثمرات حاصل کرنے کی۔

چند قابلِ احتراز چیزیں

چند چیزیں ایسی ہیں جن سے دعا میں احتراز کرنا چاہیۓ۔ اس لیے کہ وہ آداب دعا کے خلاف ہیں۔ میں اختصار کے ساتھ انھیں یہاں درج کرتا ہوں:۔

(۱) دعا میں اللہ تعالےٰ کی مشیت کی شرط لگانا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ جو کچھ مانگنا ہو پوری قطعیت اور عزم کے ساتھ مانگنا چاہیۓ۔ بخاری شریف میں ہے:۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دعا احدکم فلا یقل اللھم اغفر لی ان شئت اللھم ارحمنی ان شئت ولکن لیعزم المسئلۃ فان اللہ لا مکرہ لہٗ

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص دعا کرے تو یوں نہ کہے کہ اے اللہ مجھے بخش دے اگر تو چاہے اے اللہ مجھ پر رحم کر، اگر تو چاہے بلکہ بغیر شرط قطعیت کے ساتھ دعا کرے۔ اس لیے کہ اللہ پر جبر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر اللہ نہ چاہے تو زبردستی اس سے کوئی چیز حاصل نہیں

کی جا سکتی۔ اس لیے اس کے چاہنے کی شرط لگانا بے کار ہے اور ادب دعا کے خلاف بھی ہے۔

(۲) دعا میں تصنع اور تکلف کر کے مسجع ومقفّٰی الفاظ استعمال کرنا غلط ہے کیونکہ اس طرح دعا کی روح اس سے غائب ہو جاتی ہے۔ نہ حضور قلب باقی رہتا ہے اور نہ تضرع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ذہن قافیے اور سجع کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک بار اپنے شاگرد حضرت عکرمہ کو چند ہدایتیں دیں، ان میں سے ایک یہ تھی:

فانظر السجع من الدعاء فاجتنبه	دعا میں سجع سے اجتناب کرو کیونکہ
فانی عهدت رسول الله صلی الله علیه وسلم	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ
واصحابه لا یفعلون ذالك (بخاری)	کے صحابہ کو ایسا کرتے نہیں پایا۔

البتہ اگر بلا تکلف مسجع ومرصع الفاظ زبان سے نکلیں تو دعا ایک پارۂ ادب بھی بن جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر دعائیہ کلمات، بہترین پارہ ہائے ادب بھی ہیں۔

(۳) دعا میں اعتدار یعنی حد سے تجاوز کرنا بھی ایک غلط کام ہے۔ سورۂ اعراف کی آیت ۵۵ میں فرمایا گیا ہے "اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

دعا میں حد سے تجاوز کرنے کی متعدد صورتیں ہوتی ہیں:۔

(الف) ناروا چیزوں کی طلب

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالےٰ سے ایسی چیزوں کی دعا کرنا جو ناروا اور ناجائز ہیں۔ اعتدار فی الدعا (دعا میں حد سے تجاوز کرنا) ہی کی ایک قسم ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دعا میں حد سے تجاوز کی یہ بدترین شکل ہے۔ ایسا کرنا حقیقت

دعا کی عین ضد ہے اور اس طرح کی دعاؤں سے انسان اللہ کے غضب میں گرفتار ہو سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک مسلمان جو سودی کاروبار کر رہا ہے اگر وہ اپنے اس کاروبار کی ترقی کے لیے اللہ سے دعا کرتا ہے تو وہ احمق اپنے آپ کو خدا کے غضب کا مستحق بنا رہا ہے اس لیے کہ قرآن میں سود خواروں کو اللہ و رسول سے جنگ کا چیلنج دیا گیا ہے۔ اللہ سے صرف ایسی ہی چیز مانگنی چاہیئے جس کے بارے میں پورا علم ہو کہ وہ جائز ہے۔

(ب) بلاضرورت زور زور سے دعا کرنا

بلاضرورت بآوازِ بلند دعا کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس کی دو دلیلیں تو سورۂ الاعراف کی آیت ۵۵ میں موجود ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں چپکے چپکے دعا کرنے کا حکم ہے اور اصل قاعدے کے لحاظ سے ہر امر (حکم) وجوب کے لیے ہوتا ہے اور اگر اس کو وجوب کے لیے نہ مانا جائے تو کم سے کم اس کا پسندیدہ اور مستحب ہونا تو ثابت ہوتا ہی ہے۔ دوسری دلیل ان اللہ لا یحب المعتدین (اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا) کے ٹکڑے میں ہے۔ کلبی اور ابن جریج نے کہا ہے کہ اس آیت میں اعتداء سے مراد رفع الصوت فی الدعاء ہے یعنی دعا میں آواز بلند کرنا حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اس آیت کے علاوہ دوسری آیات و احادیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے ذکر اور دعا دونوں ہی میں آہستگی پسندیدہ ہے۔

اللہ کے ذکر میں آہستگی کا حکم سورۂ اعراف کی آیت ۲۰۵ میں ہے:

"اے نبی اپنے رب کو یاد کیا کرو دل ہی دل میں گڑگڑاتے ہوئے اور خوف کے ساتھ۔"

حضرت زکریا علیہ السلام کی مدح کرتے ہوئے ان کی ایک خاص دعا کا بیان قرآن میں اس طرح ہے:-

اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا — جبکہ انھوں نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔ (مریم - ۳)

امام رازی نے لکھا ہے کہ اس آیت سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ آہستگی کے ساتھ دعا کرنا مستحب ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابو موسےٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام باآواز بلند تکبیر کہنے لگے تو حضور ؐ نے انھیں اس سے روکا اور فرمایا کہ تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو بلکہ ایک ایسی ذات کو پکار رہے ہو جو سمیع و قریب ہے اور وہ تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔

امام رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ :-

"حضرت حسن بصریؒ کہتے تھے کہ کوئی شخص پورا قرآن حفظ کر لیتا تھا لیکن اس کے پڑوسی کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی تھی، اسی طرح کوئی شخص تہجد کی طویل نمازیں پڑھتا تھا اور اس کے پاس لیٹے ہوئے شخص کو اس کا شعور بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ ہم نے ایسے لوگوں کو پایا ہے جو اعمال خیر کے اخفاء میں مبالغہ کرتے تھے۔ ہم نے ان مسلمانوں کو دیکھا ہے جو دعا میں پوری محنت صرف کرتے تھے لیکن ان کی آواز بلند نہیں ہوتی تھی اس لیے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اپنے رب کو یاد کرو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔"

اس کے علاوہ انسان کا نفس دکھاوے اور شہرت طلبی کی طرف میلان رکھتا ہے اس لیے باآواز بلند دعا کرنے میں اندیشہ ہے کہ اس میں ریا کی آمیزش ہو جائے۔ اس سے بچنے کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ چیخ چیخ کر دعا نہ کی جائے۔ آجکل جلسوں میں اور مسجدوں میں زور زور سے دعا مانگنے کا جو رواج ہو گیا ہے وہ دعا کے اس ادب سے لاعلمی کی دلیل ہے۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو سنن و نوافل سے فارغ ہو کر باآواز بلند دعا مانگنے لگتے ہیں۔ انھیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ دوسرے

دوسرے لوگوں کو جو ابھی نماز میں مشغول ہیں پریشانی ہوگی۔ البتہ اگر کوئی ضرورت داعی ہو تو درمیانی آواز کے ساتھ دعا مانگی جاسکتی ہے۔

(ج) دعا میں غیر ضروری الفاظ بڑھانا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ خود جامع دعائیں پسند فرماتے تھے بلکہ آپ نے غیر ضروری الفاظ بڑھانے پر تنبیہ بھی کی تھی۔ ہم یہاں اس طرح کی چند حدیثیں نقل کرتے ہیں:

عن عائشۃؓ قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یستحب الجوامع من الدعاء ویدع ماسوی ذالك	حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع دعائیں پسند فرماتے تھے اور غیر جامع کو ترک کردیتے تھے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)

"جامع دعا" کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آپ دنیا اور آخرت دونوں ہی کی بھلائیاں طلب فرماتے تھے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی دعاؤں کے الفاظ کم لیکن معانی بہت ہوتے تھے یعنی آپ اپنی دعاؤں کو غیر ضروری الفاظ بڑھاکر طویل نہیں کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ نے دعا کے اس ادب کو اچھی طرح ذہن نشین کیا تھا اور وہ غیر ضروری الفاظ کے اضافے کو دعا میں اعتداء (حد سے تجاوز) قرار دیتے ہیں۔ ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ حضرت سعد بن وقاصؓ نے اپنے ایک بیٹے کو دعا مانگتے ہوئے سنا وہ کہہ رہے تھے:

"اے اللہ! میں تجھ سے جنت مانگتا ہوں اور اس کی نعمتیں، اور اس کا ریشم اور یہ، اور یہ، اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں دوزخ سے اور اس کی زنجیروں سے اور اس کے طوق سے۔"

جب وہ دعا ختم کرچکے تو حضرت سعد نے ان سے کہا تم نے خیر کثیر کی دعا

کی اور بہت سے شر سے پناہ مانگی اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ عنقریب ایسے لوگ آئیں گے جو دعا میں حد سے تجاوز کریں گے اور بعض حدیثوں میں ہے کہ لوگ وضو میں اور دعا میں حد سے تجاوز کریں گے۔ جنت کی طلب میں اس کی تمام نعمتوں اور آسائشوں کی طلب خود بخود داخل ہے۔ اسی طرح دوزخ سے استعاذہ میں اس کی تمام سزاؤں اور زحمتوں سے استعاذہ خود بخود داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سعدؓ نے جنت کی دعا کے ساتھ اس کی نعمتوں کی تفصیل اور جہنم سے استعاذے کے ساتھ اس کی سزاؤں کے ذکر کو ناپسند کیا اور ان غیر ضروری الفاظ کے اضافے کو ادب دعا کے خلاف قرار دیا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مغفل نے اپنے بیٹے کو کہتے ہوئے سنا:

"اے اللہ میں تجھ سے قصر ابیض (سفید محل) مانگتا ہوں جنت کے داہنے جانب۔"

یہ سن کر انھوں نے کہا۔ جنت مانگو اور جہنم سے پناہ چاہو۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ عنقریب اس امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو وضو اور دعا میں حد سے تجاوز کریں گے۔ اس دعا میں انھوں نے غیر ضروری قید اور شرط کو ادب دعا کے خلاف قرار دیا۔ وضو میں حد سے تجاوز کی ایک صورت یہ ہے کہ بلاضرورت ہر عضو کو تین بار سے زیادہ دھویا جائے۔ اگر کسی شخص کو اپنی کوئی خاص اور وقتی حاجت و ضرورت کی دعا مانگنی نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ "دعاءِ ماثورہ" یعنی قرآن اور احادیث میں مذکور دعائیں مانگے۔ ان میں خاص برکت بھی ہے اور وہ ان تمام بے اعتدالیوں سے محفوظ بھی ہیں جو دعا میں انسان سے ہو سکتی یا ہو جایا کرتی ہیں۔

(د) دعا کو تقریر بنا دیا

جب دعا میں غیر ضروری الفاظ کا اضافہ بھی آداب دعا کے خلاف اور حد سے تجاوز کرنا ہے تو دعاؤں کو تقریر بنا دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ آج کل دیکھا جا رہا ہے کہ بعض لوگوں نے دعا کو خطابت کا ایک فن بنا دیا ہے۔ دعا اور ایک لمبی تقریر میں کوئی فرق باقی نہیں رہا ہے۔ یہ دعا کے ساتھ بڑی بے ادبی کا رویہ ہے اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

(ہ) اپنی حیثیت سے زیادہ کی طلب

دعا میں حد سے تجاوز کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان اپنی حیثیت سے بلند چیزوں کی دعا کرے۔ مثال کے طور پر اگر ہم اللہ سے تقرب کا وہ درجہ مانگیں جو انبیاء کرام کا ہے تو یہ آداب دعا کے خلاف ہوگا، یا کوئی مسلمان ایک طرف تو اللہ کی نافرمانیاں کئے جا رہا ہو اور دوسری طرف اس سے جنت کی دعا بھی مانگ رہا ہو حالانکہ اس کو سب سے پہلے نافرمانیوں سے باز آنا چاہیئے، توبہ کرنی چاہیئے اور اللہ سے اطاعت و عبادت کی توفیق مانگنی چاہیئے۔

آدابِ دعا

دعا کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ سینے تک اٹھا کر دعا مانگے اور دعا ختم کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیر لے۔ اگر دعا کرنے والا باوضو اور قبلہ رو ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ فرض نمازوں کے بعد یا سنن و نوافل کے بعد جو دعائیں مانگی جاتی ہیں ان میں ان آداب پر بآسانی عمل کیا جا سکتا ہے اور مسلمان ایسا کرتے بھی ہیں۔ دعا سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا اور دعا کے بعد آمین کہنا بھی آداب دعا میں داخل ہے۔ دعا کے یہ

آداب احادیثِ رسولؐ سے ثابت ہیں۔ میں طوالت کے خوف سے وہ حدیثیں یہاں نقل نہیں کر رہا ہوں۔

دعاؤں کے لیے بہتر اوقات و حالات

دعاؤں کے لیے شریعت نے پنج وقتہ نمازوں کی طرح کوئی خاص وقت مقرر نہیں کیا ہے۔ دعا ہر وقت کی جا سکتی ہے لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعاؤں کے لیے بہتر اوقات وحالات کا انتخاب کرنے سے ان کی مقبولیت کی زیادہ توقع پیدا ہو جاتی ہے۔ امام غزالی اور دوسرے علماء و صوفیاء نے ان اوقات و حالات کو یکجا کر کے بیان کیا ہے۔

ایک وقت تو پورے سال میں ایک بار آتا ہے جیسے یوم عرفہ۔ اور سال کے بارہ مہینوں میں ایک مہینہ رمضان المبارک اور بالخصوص شب قدر۔ بعض اوقات ہر ہفتہ آتے ہیں جیسے جمعہ کی رات اور جمعہ کا دن۔ بالخصوص نماز جمعہ کے دو خطبوں کے درمیان اور سورج ڈوبنے سے تھوڑی دیر پہلے ___ بعض اوقات روزانہ آتے ہیں جیسے آخر شب میں سحر کا وقت۔ فرض نمازوں کے بعد۔ اذان و اقامت کے وقت اور اذان و اقامت کے درمیان۔ بارش کے وقت۔ سجدے کی حالت میں تکثیر دعا کی ترغیب دی گئی ہے۔ روزہ دار کے لیے افطار کا وقت۔ مسافر کے لیے ابتدائے سفر کا وقت اور حالت سفر میں۔ حالت اضطرار میں۔ اس حالت میں جب اللہ تعالےٰ کی عظمت اور قیامت کی ہولناکی کے تصور سے جسم پر لرزہ طاری ہو۔ دعاؤں کے لیے ان اوقات و احوال کے بہتر ہونے کے ثبوت میں قرآن کی آیات اور صحیح احادیث موجود ہیں۔ میں طوالت کے خوف سے انھیں یہاں نقل نہیں کر رہا ہوں۔

مقبولیت دعا کی ایک اور شرط

دعا کے بعد اس کی مقبولیت کی ایک اور شرط یہ ہے کہ دعا کرنے والا اس کے لیے جلدی نہ مچائے۔ امام بخاری و مسلم دونوں ہی نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے جو شخص بھی دعا کرے اس کی دعا اس وقت تک قبول کی جاتی ہے جب تک وہ جلد بازی کر کے یہ نہ کہنے لگے کہ میں نے دعا کی لیکن وہ قبول نہیں کی گئی۔

امام مسلم کی روایت میں یہ ہے:۔

> بندے کی دعا اس وقت تک قبول کی جاتی ہے جب تک وہ کسی گناہ یا قطع رحم کی دعا نہ کرے اور جب تک وہ جلدی نہ مچائے۔ پوچھا گیا کہ استعجال (جلد بازی) کا مطلب کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دعا گو کہنے لگے کہ میں نے دعا کی پھر دعا کی لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ قبول ہوگی اور پھر وہ دعا کرنا ترک کر دے۔

مقبولیت دعا میں جلد بازی چند نادانیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایک نادانی یہ ہے کہ دعا کرنے والا دعا کی حقیقت ہی سے ناواقف ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ غلام، تسلیم و رضا کا پیکر بنا ہوا اپنے مہربان آقا کے دامن سے چمٹا رہے اور اس کے سامنے احتیاج کا ہاتھ پھیلائے رہے۔ دعا عبادت بلکہ مغز عبادت ہے اور عبادت کے اجر کا محل اصلاً یہ دنیا نہیں ہے بلکہ آخرت ہے۔ جلد باز دعا گو کی دوسری نادانی یہ ہے کہ وہ اپنی دعا کو ہر طرح قابل قبول سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہے وہ کیوں نہیں سمجھتا کہ مقبولیت دعا کی جو شرطیں ہیں وہ پوری نہ ہوئی

ہوں۔ وہ جانتا ہے کہ آقا اس کا بخیل نہیں ہے اور نہ اس کے خزانے میں کوئی کمی ہے۔ وہ رحمٰن ورحیم بھی ہے، عادل بھی ہے، حکیم بھی ہے اور جواد وفیاض بھی ہے۔ اب اگر اس کی مانگی ہوئی چیز نہیں مل رہی ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ ہوگی —
تیسری نادانی یہ ہے کہ وہ مقبولیت دعا کا صحیح مطلب نہیں جانتا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بندہ جو کچھ مانگے وہ ہر حال میں اسے دے ہی دیا جائے۔ خواہ اس کی مصلحت کے مطابق ہو یا نہ ہو، بلکہ دعا کی مقبولیت اللہ کی حکمت اور بندے کی مصلحت کے ساتھ مربوط ہے۔

انسان کی فطرت میں چونکہ جلد بازی داخل ہے اس لیے اس کے بُرے اثرات سے بچانے اور مطمئن کرنے کے لیے دعا کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتادیا ہے کہ مومن کی دعا کبھی رد نہیں کی جاتی بلکہ ہمیشہ قبول کیجاتی ہے۔ البتہ قبول کرنے کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔

مومن کی دعا رد نہیں کی جاتی

(۱) عن سلمان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ربکم حیی کریم یستحی من عبد اذا رفع یدیہ الیہ ان یردھما صفرا

(ترمذی، ابوداؤد، بیہقی)

حضرت سلمان فارسی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ تمہارا رب صفت حیا سے متصف اور کریم ہے جب اسکا بندہ اس کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتا ہے تو اسے حیا آتی ہے کہ ان ہاتھوں کو خالی لوٹا دے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بندہ مومن کے دعا میں اُٹھے ہوئے ہاتھ کبھی محروم اور خالی واپس نہیں آتے بلکہ اپنے مولائے کریم سے کچھ نہ کچھ لے کر لوٹتے ہیں لیکن

یہ بات ذہن سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہیے کہ قبولیت دعا کے آداب و شرائط کا لحاظ ضروری ہے۔ ان آداب و شرائط کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

(۲) عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما من مسلم یدعو بدعوۃ لیس فیھا اثم ولا قطیعۃ رحم الا اتاہ اللہ بھا احدی ثلث اما ان یعجل لہ دعوتہ واما ان ید خرھا لہ فی الاٰخرۃ واما ان یصرف عنہ من السوء مثلھا قالوا اذا نکثر قال اللہ اکثر

(ترغیب وترھیب بحوالہ مسند احمد وبزار وابو یعلی)

حضرت ابو سعید خدری رضی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ جب کوئی مسلمان ایسی دعا کرتا ہے جس میں کوئی گناہ یا رشتے کو کاٹنے والی بات نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز عطا فرماتا ہے۔ (۱) جو کچھ اس نے مانگا ہے دنیا ہی میں اسے دے دے۔ (۲) اس کا اجر آخرت کے لیے ذخیرہ کر دے۔ (۳) جو خیر اس نے مانگی تھی اسی کے مثل کوئی شر اس سے دور کر دے۔ صحابہ نے کہا تب تو ہم بکثرت دعائیں مانگیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا: اللہ کا خزانہ اس سے بھی زیادہ ہے۔

اسی مضمون کی حدیثیں حضرت عبادہ بن الصامت رضؓ، حضرت ابوہریرہ رضؓ، اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔ ان حدیثوں میں بھی قبولیت دعا کی ایک شرط مذکور ہے یعنی یہ کہ اس کی دعا میں کسی گناہ کی طلب یا قطع رحمی کی کوئی بات نہ ہو۔ دعا میں قطع رحمی کی ایک صورت یہ ہے کہ رشتہ داروں کے حق میں دعائے خیر کے بجائے بد دعا کی گئی ہو۔

یہ حدیثیں مجھ جیسے عجلت پسند انسان کو اطمینان دلاتی ہیں کہ شرائط و آداب کے ساتھ کوئی بھی مخلصانہ دعا رد نہیں کی جاتی۔ ہم دنیا میں کوئی بھلائی مانگتے ہیں

اور وہ نہیں ملتی یا کسی مصیبت اور تکلیف کو دُور کرنے کی دعا کرتے ہیں اور وہ دُور نہیں ہوتی تو ہم دل شکستہ اور مایوس ہونے لگتے ہیں۔ یہ حدیثیں اس دل شکستگی اور مایوسی کو ختم کر دیتی ہیں اور ہمیں یقین دلاتی ہیں کہ مانگنے کے باوجود دنیا میں ہمیں جو کچھ نہیں ملا اس کا بدلہ آخرت میں ضرور ملے گا اور وہاں جو کچھ ملے گا وہ بہتر بھی ہوگا اور پائندہ تر بھی۔

دعا کے بارے میں ایک بڑی غلطی کا ازالہ

فلسفۂ یونان کے اثر سے جب اسلامی عقائد اور اللہ تعالےٰ کی ذات وصفات میں بحثیں شروع ہوئیں تو اسلامی لٹریچر میں ایک نئے علم 'علم کلام' کا اضافہ ہوا، اور تصوف بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ فلسفہ اور علم کلام نے جو سب سے بڑا نقصان پہنچایا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی نگاہ سے قرآن اور احادیث کے دلائل اوجھل ہو گئے اور انھوں نے بھی فلسفیوں کی طرح عقلی و دماغی تیر تکے چلانے شروع کر دیئے۔ کتاب وسنت کے معقول دلائل انسان کے دل میں اطمینان اور یقین کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف فلسفہ کے عقلی دلائل قلب کو شک اور تردد میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ بہر حال فلسفیانہ بحث ومباحثہ کی زد "دعا" پر بھی پڑی اور اس کے بارے میں بھی لوگوں نے عقلی تیر تکے چلانے شروع کر دیئے۔ تصوف میں بھی اس مسئلے میں متعدد اقوال پیدا ہو گئے۔ رسالہ قشیریہ میں جو تصوف کی قدیم اور مستند کتاب ہے وہ اقوال نقل کیے گئے ہیں۔

(۱) دعا کرنا افضل ہے۔ (۲) خاموش اور راضی برضائے الٰہی رہنا افضل ہے۔ (۳) بہتر یہ ہے کہ بندے کی زبان دعا گو رہے اور قلب راضی برضا رہے۔ (۴) مختلف اوقات وحالات کا حکم مختلف ہے۔ بعض حالات میں دعا کرنا خاموش

رہنے سے افضل ہے اور اس وقت کا یہی ادب ہے اور بعض حالات میں خاموش رہنا دعا کرنے سے افضل ہے اور اس وقت کا یہی ادب ہے۔ اس کا معیار یہ ہے کہ اپنے قلب کو دیکھے اگر وہ دعا کا اشارہ کرے تو دعا افضل ہوگی اور اگر سکوت کا اشارہ کرے تو سکوت افضل ہوگا۔ (۵) اپنے حال کا لحاظ کرے۔ اگر دعا کے وقت کیفیت بسط میں زیادتی محسوس کرے تو دعا افضل ہوگی اور اگر اس وقت کسی قسم کی اکتاہٹ اور "قبض" کی کیفیت محسوس ہو تو سکوت افضل ہوگا اور اگر نہ "بسط" میں زیادتی ہو اور نہ "قبض" میں تو دعا اور ترک دعا کا معاملہ برابر رہے گا۔ (٦) اگر ارادۂ دعا کے وقت "علم" غالب ہو تو دعا افضل ہے اس لیے کہ وہ عبادت ہے اور اگر اس وقت "معرفت" "حال" اور "سکوت" غالب ہو تو خاموش رہنا افضل ہوگا۔ (۷) جس دعا میں مسلمانوں کا حصہ ہو یا حق تعالٰے کا اس میں حق ہو تو دعا بہتر ہے اور اگر اس میں خود تمہارے اپنے لیے حظ و نصیب ہو تو سکوت اولیٰ ہے۔

ان اقوال میں فلسفیانہ تصوف کی چند اصطلاحیں بھی استعمال ہوئی ہیں۔ وقت، حال، اشارہ، بسط، قبض، علم، معرفت، سکوت ـــــ دعا کے بارے میں قرآن و حدیث کی جو تصریحات اوپر گذریں انھیں پڑھیے اور پھر رسالہ قشیریہ میں منقول ان اقوال پر نظر ڈالیے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام اقوال تصوف میں فلسفے کو داخل کر دینے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم نہ فلسفۂ یونان کی افادیت کے قائل ہیں اور نہ ہمیں اجنبی عناصر سے مخلوط تصوف سے دلچسپی ہے اس لیے ان اقوال و اصطلاحات کی توضیح بے کار ہے۔ البتہ ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے جس کا تعلق حدیث نبوی سے ہے۔ دعا کے سلسلے میں دوسرا قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ خاموش اور راضی بقضا یا راضی برضائے الٰہی رہنا افضل ہے۔ اس قول کی دلیل کے طور پر رسالہ قشیریہ میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے :

وقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم خبرا عن اللہ تعالٰی من شغلہ ذکری عن مسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین۔ (الرسالۃ القشیریۃ ص۱۱۹ مطبوعہ مصر)	اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے جس شخص کو میرے ذکر نے مشغول کردیا مجھ سے سوال کرنے سے، میں اس کو دوں گا اس سے بہتر جو سوال کرنے والوں کو دیتا ہوں۔

راقم الحروف نے مشکوٰۃ، جمع الفوائد، ترغیب وترہیب اور کنز العمال میں یہ حدیث تلاش کی لیکن ناکام رہا البتہ قرآن کریم کی فضیلت کے بیان میں امام ترمذی اور دارمی نے یہ حدیث روایت کی ہے:۔

عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الرب تبارک وتعالٰی من شغلہ القرآن عن ذکری ومسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین فضل کلام اللہ علی سائر الکلام کفضل اللہ علی خلقہ (ھذا حدیث حسن غریب ترمذی قبیل ابواب القرأت)	ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رب تبارک وتعالٰی فرماتا ہے جس کو قرآن نے مشغول کردیا میرے ذکر اور دعا سے میں اس کو عطا کروں گا اس سے بہتر جو سوال کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں پس دوسرے کلاموں پر کلام اللہ کی فضیلت ایسی ہے جیسے اللہ کی فضیلت اس کی مخلوق پر۔

امام دارمی نے یہ حدیث باب فضل کلام اللہ علی سائر کلام اللہ میں روایت ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:

من شغلہ قراۃ القرآن عن مسئلتی و ذکری اعطیتہ	جس کو قرآن کی تلاوت نے مشغول کردیا مجھ سے سوال کرنے اور میرے ذکر

ثواب السائلین وفضل کلام اللہ علیٰ سائر الکلام کفضل کلام اللہ علیٰ خلقہ۔

سے میں اس کو دوں گا سوال کرنیوالوں سے بہتر اجر اور اللہ کے کلام کی فضیلت بقیہ دوسرے کلاموں پر ایسی ہے جیسے اللہ کی فضیلت اس کی مخلوق پر۔

یہ ایک ضعیف حدیث ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے کلام قرآن مجید کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اگر قرآن کی تلاوت میں اس درجہ مشغولیت رہی کہ قاری قرآن، اللہ کا کوئی اور ذکر اور اس سے دعا نہ کرسکا تو وہ اسے مانگنے والوں کے مقابلہ میں افضل اور بہتر چیز عطا کرے گا اور اس کی یہ وجہ بھی اس میں بیان کردی گئی ہے کہ اللہ کا کلام چونکہ دوسرے تمام کلاموں سے افضل ہے۔ اس لیے اس کا اجر اور اس کی برکت بھی سب سے زیادہ ہوگی اس ضعیف حدیث میں شاغل (مشغول کرنے والا) قرآن ہے اور مشغول عنہ (مشغولیت کی وجہ سے جس کی طرف توجہ نہیں کی جاسکی) ذکر بھی ہے اور دعا بھی ہے۔ اسی حدیث میں کسی نے تحریف کرکے ان صوفیوں کو سنادی جو ترک دعا کو افضل قرار دیتے تھے اور انھوں نے بلا تحقیق اسے قبول کرلیا اور پھر صاحب رسالہ قشیریہ نے بھی اسے اپنی کتاب میں نقل کردیا۔ تحریف کرنے والے نے تلاوت قرآن کو حذف کرکے ذکر کو شاغل اور دعا کو مشغول عنہ بنادیا حالانکہ اس حدیث میں ذکر اور دعا دونوں ہی مشغول عنہ اور قرآن شاغل تھا۔

اصل میں رضا بقضا یعنی اللہ کے فیصلے اور اس کی مرضی پر راضی رہنے کا مطلب ان لوگوں نے صحیح نہیں سمجھا جو ترک دعا کو افضل کہتے ہیں ان کے خیال میں اللہ سے اپنے لیے کچھ مانگنا مقام تسلیم و رضا کے خلاف ہے حالانکہ یہ خیال قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف اور بالکل غلط ہے۔ حد ہوگئی کہ ابو سلیمان دارانی نے جو اپنے وقت کے ایک بڑے صوفی تھے "رضا" کی تعریف میں

یہاں تک کہہ دیا :۔

قال ابو سلیمٰن الرضا ان لا تسال اللہ تعالیٰ الجنۃ ولا تستعیذ بہ من النار (الرسالۃ القشیریہ صفہ ۹)	ابو سلیمان نے کہا کہ "رضا" یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے نہ جنت کی دعا کرو اور نہ دوزخ سے پناہ مانگو۔

یہ قول جس کا بھی ہو اللہ و رسول کے اقوال کی عین ضد ہے اور صوفیائے کرام ہی کی تصریحات کے مطابق اسے قبول نہیں کرنا چاہیئے۔

امام ابو القاسم قشیریؒ

نام و نسب الامام ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن بن عبد الملک بن طلحہ بن محمد النیسا بوری القشیری۔ ان کا خاندان عرب کے علاقہ "استوا" کا باشندہ تھا۔ ان کا نسبی تعلق بنو قشیر بن کعب سے ہے۔ یہ خاندان عرب سے منتقل ہو کر خراسان میں آباد ہو گیا تھا۔

ولادت امام قشیری ربیع الاول ۳۷۶ھ مطابق ۹۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا لیکن انھوں نے علوم شرعیہ اور ادب کی تعلیم جاری رکھی۔ "استوا" کے علاقے میں یہ ایک بستی کے مالک تھے جس پر خراج اور دوسرے مطالبات کا بہت بار پڑ گیا تھا۔ انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ نیسا بور جائیں تاکہ وہاں حساب اور معاملات سے متعلق دوسرے امور و علوم کی تعلیم حاصل کریں اور اس کے ذریعے اپنی جائداد کے مالی بار سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں۔

نیسا بور میں آمد اسی رائے کے ساتھ وہ نیسا بور آئے جو اس وقت علماء اور مفکرینِ اسلام کا مرکز تھا۔ اتفاقاً وہ اس مجلس میں شریک ہوئے جو اپنے وقت کے امامِ صوفیہ، ابو علی الحسن بن علی الدقاق منعقد کیا کرتے تھے۔ جب انھوں نے ان کی گفتگو سنی تو بہت پسند آئی اور وہ ان کے دل میں اتر گئی۔ ان کے ایمان کی کلی کھل گئی۔ اسی دن انھوں نے اپنے اس سابق ارادے کو جو انھیں

نیسابور لایا تھا، ترک کر دیا اور سلوک الی اللہ اور مجاہدے کی زندگی اختیار کر لی۔ ابو علی دقاق نے جب ان کے جذبے اور ان کی صلاحیت محسوس کر لی تو انھیں قبول کر لیا پھر اپنی بہترین نگرانی میں ان کی روحانی تربیت شروع کر دی، انھوں نے ان سے کہا کہ علوم شرعیہ کی تکمیل کریں۔ ان کی ہدایت کے پیش نظر انھوں نے اس وقت کے ماہرین علوم شرعیہ سے علم دین کی تکمیل کی۔ پہلے وہ ابو بکر محمد بن ابو بکر طوسی کے درس میں شریک ہوئے اور "فقہ" میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد وہ ابو بکر محمد بن الحسن بن فورک کے درس میں شریک ہوئے اور "علم الاصول" میں مہارت حاصل کی، پھر انھوں نے ابو اسحاق اسفرائنی کے درس میں شرکت کی اور چند دن وہ ان کا درس سنتے رہے، ایک دن اُن کے استاذ نے کہا کہ یہ علم صرف سننے سے نہیں آتا بلکہ اس کو قلم بند کرنا بھی ضروری ہے۔ امام قشیری نے ان چند دنوں میں استاذ سے جو کچھ سُنا تھا وہ اُن کے سامنے دُہرا دیا، استاذ ان کی ذہانت اور حافظے کی قوت پر متعجب ہوئے اور سمجھ گئے کہ ان کا شاگرد کس درجے کا آدمی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ تمھیں میرے درس میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ میری تصنیفات کا مطالعہ تمھارے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اسفرائنی اور ابن فورک کے طریقوں کو جمع کیا پھر انھوں نے قاضی ابو بکر بن الطیب الباقلانی کی کتاب کا مطالعہ کیا۔ تعلیم کی اس پوری مُدت میں وہ برابر اپنے شیخ ابو علی الدقاق کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ جب ان کے شیخ نے محسوس کر لیا کہ وہ مرتبۂ کمال پر پہنچ گئے ہیں تو اپنی صاحبزادی سے ان کا نکاح کر دیا اور اس طرح ان کو اپنے خاندان کا ایک فرد بنا لیا۔

علماء و مورخین کے اعترافات

ابن خلکان نے اپنی کتاب "وفیات" میں ان کے متعلق لکھا ہے:

كان علامة فى الفقه والتفسير والحديث والاصول والادب والشعر والكتابت وعلم التصوف۔ جمع بين الشريعة والحقيقة	وہ فقہ، تفسیر، حدیث، اصول، ادب، شعر، کتابت اور علمِ تصوّف میں علامہ تھے، انھوں نے شریعت وحقیقت کو یکجا کردیا تھا۔

ابوالحسن باخرزی نے مبالغے کے ساتھ ان کی تعریف لکھی ہے اور خطیب نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ امام قشیری ۴۴۸ھ میں بغداد آئے اور انھوں نے علماء کو حدیثیں سنائیں اور ہم لوگوں نے ان کی حدیثیں لکھیں:

وكان ثقة، احسن الوعظ، مليح الاشارة وكان يعرف الاصول على مذهب الاشعرى والفروع على مذهب الشافعى	وہ ثقہ تھے، ان کا وعظ بہترین اور ان کا اشارہ حسین تھا وہ مذہب اشعری کے مطابق اصول اور مذہب شافعی کے مطابق فروع کے عالم تھے۔

مورخین نے ان کے اشعار بھی نقل کیے ہیں اور ان کی تعریف کی ہے۔

سفرِ حج انھوں نے علماء ومحدثین کے ایک قافلے کے ساتھ سفرِ حج کیا تھا۔ اس قافلے میں امام الحرمین کے والد ابومحمد الجوینی اور احمد بن الحسین البیہقی بھی تھے۔ ان لوگوں سے بغداد اور حجاز میں بہت سے علماء نے حدیثیں سنیں احادیث سننے والوں میں یہ علماء بھی تھے

احمد بن محمد بن عمر الخفاف ــــ محمد بن احمد بن عبدوس المکی ــــ ابونعیم عبدالملک بن الحسن الاسفرائنی ــــ الحاکم ابوعبداللہ ــــ اور صاحبِ "طبقات الصوفیہ" ابوعبدالرحمٰن السلمی۔

تصنیفات امام قشیری نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ یہاں ایک فہرست پیش کی جارہی ہے:

(۱) الرسالۃ القشیریہ ۔ اس کی شرح شیخ الاسلام زکریا الانصاری نے لکھی ہے اور اس شرح پر نفیس حاشیہ شیخ الاسلام السید مصطفی العروسی نے لکھا ہے ۔ یہ کتاب متعدد دفعہ طبع ہو چکی ہے ۔

(۲) "لطائف الاشارات" فی تفسیر القرآن ۔ غیر مطبوعہ ۔ اس کتاب کے مخطوطات ہندوستان، استانبول، دمشق اور لیڈن میں موجود ہیں ۔

(۳) "کتاب الفتوی" اس کا ذکر سبکی نے طبقات میں کیا ہے ۔

(۴) "حیاۃ الارواح والدلیل علی طریق الصلاح والفلاح" غیر مطبوعہ ۔ اس کا نسخہ اسکوریال میں ہے ۔

(۵) "کتاب المعراج" اس کا نسخہ بانکی پور میں ہے ۔ ڈاکٹر حسن عبد القادر نے اس کو ایڈٹ کر کے قاہرہ سے شائع کر دیا ہے ۔

(۶) "شکایۃ اہل السنۃ" اس کا ذکر سبکی نے طبقات الشافعیہ میں کیا ہے ۔

(۷) "الفصول" "اللمع" یہ دونوں کتابیں غیر مطبوعہ ہیں اور قاہرہ میں ہیں ۔

(۸) کتاب "التوحید النبوی" غیر مطبوعہ ۔ قاہرہ میں ہے ۔ (۹) کتاب التفسیر فی علم التفسیر" اس کا مخطوطہ ہندوستان اور لیڈن میں ہے (۱۰) "کتاب التمیز فی علم التذکیر" غیر مطبوعہ ۔ استانبول، طہران، قیروان اور قاہرہ میں ہے (۱۲) کتاب "الاربعین حدیثا" اس کا مخطوطہ لیڈن میں ہے (۱۳) کتاب "ترتیب السلوک" اس کا مخطوطہ ڈبلن میں ہے (۱۴) کتاب "شرح اسماء الحسنی" اس کا مخطوطہ، موصل، طہران، تونس اور دمشق میں ہے ان کے علاوہ ان کی اور تصنیفات بھی ہیں ۔

وفات ۱۶ ربیع الاول ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۲ء سنیچر کی صبح کو نیسابور میں وفات پائی اور اپنے شیخ اور خسر ابو علی دقاق کے جوار میں مدفون ہوئے رحمہ اللہ تعالیٰ

(مجلۃ التربیۃ الاسلامیۃ بغداد ۔ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ)

اسلامی تصوّف

اس کتاب میں فلسفۂ یونان اور ویدانت سے متاثر تصوف کے بجائے وہ تصوف پیش کیا گیا ہے جو قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویؐ میں موجود ہے۔ اس میں صوفیۂ کرام کے وہی اقوال و احوال نقل کیے گئے ہیں جو کتاب و سُنّت سے متصادم نہیں ہیں۔

سیّد احمد عروجؔ قادری